فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ
(الآیۃ)

کاروانِ حیات کامل

طلبہ علوم دین اور اہل خدماتِ شرعیہ کیلئے
ایک ایمان افروز تذکرہ

تالیف
مولانا محمد عبد الرحمن صاحب
اُستاذ حدیث وتفسیر و ناظم (اوّل) مجلسِ علمیہ حیدرآباد

ناشر
محمد سمیع اللہ
طارق پلازہ، جی۔۴ کمرشیل ایریا بلاک نمبر۴
ناظم آباد کراچی، فون: ۶۶۸۳۶۲۸

بِاسْمِہٖ تَعَالیٰ

کاروانِ حیات

جدید ایڈیشن اضافہ شدہ

طلبہ علوم دین اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنیوالوں کیلئے

ایمان افروز تذکرے

تالیف

حضرت مولانا محمد عبدالرحمن صاحب مظاہری

استاذ حدیث و تفسیر و ناظم (اول) مجلس علمیہ حیدرآباد

خلیفہ مجاز حضرت محی السنہ مولانا الشاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم

ناشر:-

ربانی بک ڈپو کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی ۶

باسمہٖ تعالیٰ

کاروانِ حیات

حصہ اوّل

طلبہ علوم دین اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنیوالوں کیلئے

ایک ایمان افروز تذکرہ

تالیف:-

مولانا محمد عبد الرحمٰن صاحب

استاذ حدیث و تفسیر و ناظم (اوّل) مجلس علمیہ حیدرآباد

خلیفہ مجاز حضرت محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہ العالی

ناشر:-

ربانی بک ڈپو، کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی

۱:- نام کتاب :- کاروانِ حیات جلد اوّل
۲:- مؤلف :- حضرت مولانا محمد عبدالرحمٰن صاحب حیدرآبادی
۳:- کتابت :- نیاز الدین اصلاحی
۴:- مصحح :- مولانا مفتی محمد امین صاحب پالنپوری استاذ دارالعلوم دیوبند
۵:- طباعت :- ربانی آفسیٹ پریس
۶:- باہتمام :- ربانی برادران
۷:- سن اشاعت :- جولائی ۱۹۹۹ء
۸:- تعداد :- ایک ہزار ایک سو
۹:- قیمت :- ______

ناشر:-
ربانی بک ڈپو کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی۶
فون نمبر:- ۳۲۱۰۱۱۸ — ۳۲۱۷۸۴۰ -

فہرست مضامین

ابوالحسن علي الحسني الندوي

مولانا محمد عبدالرحمن صاحب مولف کتاب ہٰذا کا خصوصی عربی تعارف جو ایک موقع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے مکۃ المکرمہ میں حاصل کیا گیا تھا۔ ترجمہ درج ذیل ہے۔

بعد حمد و صلوٰۃ :-

مولانا عبدالرحمن بن احمد شریف صاحب حیدرآبادی سے میں بخوبی واقف ہوں، مولانا علوم دینی و اسلامی کے فاضل ہیں، جنوبی ہند کے دینی و علمی حلقوں میں آپ کی بیش بہا خدمات رہی ہیں، مولانا نے ہندوستان کے مختلف علمی اداروں سے استفادہ کیا ہے آخر میں مدرسہ مظاہر علوم ضلع سہارن پور (یوپی) سے علوم دینیہ کی تکمیل کی اور اصولِ دین و علم شریعت میں اعلیٰ اسنادیں حاصل کیں، تحصیل علم کے بعد جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں تقریباً پندرہ سال درس و تدریس کی خدمات انجام دی ہیں۔ اسکے علاوہ مولانا موصوف نے عامۃ المسلمین کی تعلیم و تربیت کی جانب بھی خصوصی توجہ دی، اس سلسلے میں اہلِ علم حضرات کیلئے "مجلس علمیہ" کی تأسیس کی جسکا دینی و علمی حلقوں میں اثر رہا ہے۔

چونکہ مولانا توحید و سنت کے داعی و علمبردار تھے اپنے شہر میں اہلِ بدعت کی مخالفتوں سے دوچار ہوگئے، اسی سال موصوف نے فریضۂ حج ادا کیا اور انکی خواہش ہے کہ کچھ عرصہ انہی مقاماتِ مقدسہ میں رہ کر علمی و دینی خدمت انجام دیں چنانچہ انہیں اس مقصد کے حصول کیلئے تعاون کی ضرورت ہے، مجھے اس بات سے خوشی ہوگی کہ مولانا کے مقصد کی تکمیل ہو، اس بارے میں جو بھی ان کے ساتھ معاونت کریں میں آن کا شکرگذار رہونگا،

والسلام

کتبہ الفقیر الی اللہ

ابوالحسن علی الحسنی الندوی

مکۃ المکرمہ

۲/صفر ۱۳۹۸ھ

حرف آغاز!

"کاروانِ حیات" مروجہ طریقے پر میری سوانح حیات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایمان افروز تذکرہ ہے جو علم دین کی تحصیل میں مجھکو پیش آیا، بزرگوں نے سچ کہا ہے۔ لِكُلِّ شَيْئٍ آفَةٌ وَ لِلْعِلْمِ آفَاتٌ۔
دنیا کی ہر چیز میں ایک نہ ایک آفت ہے لیکن تحصیل علم میں آفات ہیں ایک بزرگ کہتے ہیں، جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر علم کے حوالے نہیں کیا جاتا علم اپنا جز بھی نہیں دیتا۔
کہنے والے کی اللہ مغفرت فرمائے ایسا معلوم ہوتا ہے اس نے یہ نصیحت میرے لئے کی ہے۔ میری تعلیمی و تبلیغی زندگی انہی آزمائشوں اور امتحانوں کا عنوان رہی ہے۔
ہمارے اسلاف کرام نے تحصیل علم میں جو مشقتیں اور مصائب برداشت کئے ہیں وہ ہماری تاریخ کا ایک مستقل باب ہیں۔ وطن سے بے وطن ہوئے گھر سے بے گھر ہوئے۔ دربدر پھرے، راحت و آرام کو قربان کیا، گرمی سردی بھوک پیاس برداشت کی، ضرورتوں اور تقاضوں کو دبایا اور وہ سب کچھ اختیار کیا جو تحصیل علم کے لئے ضروری تھا۔ اس کے صلہ میں انھیں صرف علم نہیں علمی خزائن ملے۔ قاضی ابوجعفر نسفیؒ قرنِ اوّل کے اہل علم و فضل میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک رات کسی فقہی مسئلے میں غور کر رہے تھے۔ قلب پر علوم کا فیضان

جاری ہوا، کتاب رکھ دی اور کھڑے ہوکر رقص کرنے لگے اور زبان پر یہ کلمات تھے۔

أَيْنَ الْمُلُوكُ وَ أَبْنَاءُ الْمُلُوك
أَيْنَ الْمُلُوكُ وَ أَبْنَاءُ الْمُلُوك

کہاں ہیں بادشاہ، کہاں ہیں شہزادے۔

اولاد کی کثرت، مال ومتاع کی قلت زندگی بھر رہی تمام عمر زہد وقناعت اور خودداری میں بسر کی، کسی سے بھی تنگیٔ معاش کا اظہار تک نہیں کیا ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

شمس الائمہ علامہ سرخسیؒ نے ملکِ خاقان کو کسی مسئلے میں نصیحت کی تھی بادشاہ ناراض ہوا اور انھیں قید کر کے عرصۂ دراز تک اندھیری کوٹھری میں بند رکھا لیکن علامہ سرخسیؒ نے اپنے شاگردوں کو اسی اندھیری کوٹھری سے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "المبسوط" جس کی پندرہ ضخیم جلدیں ہیں زبانی تحریر کروا دیا ۴۳۸ھ میں وفات پائی (الفوائد البہیہ)

ماضی قریب میں مولانا مملوک علی صاحبؒ جو علماء دیوبند وسہارن پور کے سرخیل اور استاذ الکل کی حیثیت رکھتے ہیں خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ شہر دہلی میں پڑھا کرتے تھے۔ غربت وافلاس کا یہ حال تھا کہ کئی کئی دن فاقہ میں گذر جاتے، پانی اور جنگلی درخت کے پھلوں پر گزارہ کر لیتا تھا۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی میں صرف دو پیسوں کے عوض پیٹ بھر روٹی کھائی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ حیثیت بھی میسّر نہ تھی۔

شاہراہ عام کی سرکاری روشنی میں رات دیر تک مطالعہ کر لیتا اور اپنے ٹھکانے آجاتا۔ (ارواحِ ثلاثہ) یہ اور اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جو تحصیلِ علم کے سلسلہ میں طالب علموں کو پیش آئے ہیں۔

پھر ایک بار حکیم دانا کا قول دُہرا لیجئے۔
"علم اپنا جزء بھی نہیں دیتا جب تک اپنے کل کو اس کے حوالے نہ کیا جائے"
محض شوق تمنّا اور آرزؤں سے یہ دولت نہیں ملی، سیّدنا علیؓ اپنے شاگردوں کو یہ عظیم نکتہ تفہیم کرتے ہیں۔

لَوْ کَانَ هٰذَا الْعِلْمُ یُدْرَكُ بِالْمُنیٰ۔ مَا کَانَ یَبْقیٰ فِی الْبَرِیَّةِ جَاهِلٌ فَاجْهَدْ وَلَا تَکْسَلْ وَلَا تَكُ غَافِلاً۔ فَنَدَامَةُ الْعُقْبیٰ لِمَنْ یَّتَکَاسَلُ۔

اگر علم دین صرف خواہشات اور تمنّاؤں سے حاصل ہوجاتا تو روئے زمین پر کوئی بھی جاہل نہیں رہتا لہذا تم جدوجہد کرو سستی اور غفلت سے بچو، انجام کی ناکامی سستی وغفلت کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ جوئندہ یابندہ فارسی زبان کا عام محاورہ ہے تلاش کرنے والوں کو حقیقت مل ہی جاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کو انہی نقوش میں بسر ہوتے دیکھا ہے۔

بزرگوں اور دوستوں کی خواہش کے احترام میں اپنی کاروانِ حیات کو تین حصّوں میں ترتیب دی ہے۔

پہلا حصّہ:۔ دورِ تعلیمی کا ہے جو اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ اس میں تحصیل علم کی روئیداد کو جمع کیا ہے۔

دوسرا حصّہ:۔ دورِ تدریسی کا ہے جو کم وبیش پندرہ سال کی خدماتِ درس و تدریس پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصّہ:۔ دور تبلیغی کا ہے جس میں کھلے عام دین کی دعوت وتبلیغ اور اس کی نشر واشاعت کی تفصیلات جمع کی گئیں ہیں۔

ایک ضعیف ومحتاج انسان کی محدود زندگی اس سے زیادہ اور کیا طویل و

عریض ہو سکتی ہے یہی اس کا آغاز یہی اس کا انجام۔

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خاکِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

اس عاجز بندے نے کَلِمَۃً بَاقِیَۃً کے طور پر اپنی "کاروانِ حیات" قلم بند کی ہے۔ خطا و لغزش، سہو و نسیان کی معافی کا اپنے ربِ غفور سے امیدوار ہوں، ناظرین کرام سے دعائے حسنِ خاتمہ کی درخواست کے ساتھ،

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

خادم الکتاب والسنّۃ
عبدالرحمٰن غفرلہٗ

اختتام "مقام ابراہیم" (خانۂ کعبہ)
مکّۃ المکرّمہ
۲۰ صفر المظفر ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۹۹۲ء
دوشنبہ بعد نمازِ مغرب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کاروانِ حیات

اپنا خاندانی تعارف

میری جائے پیدائش شہر حیدرآباد (دکن) کے قدیم محلّہ یاقوت پورہ اپنی ننیاں ہے سن ولادت کسی مستند یادداشت کے تحت حاصل نہ ہوسکا البتہ قدیم حیدرآباد کے رسم ورواج کے تحت یوم ولادت کے چار سال، چار ماہ، چار دن، چار گھڑی (آٹھ ساعت شب) بچے کی گل پوشی وتسمیہ خوانی کی رسم ادا کی جاتی تھی۔

قدیم کاغذات میں میری تسمیہ خوانی کے مطبوعہ دعوت نامے پر تاریخ تسمیہ خوانی چہارشنبہ ۱۶ رجب ۱۳۵۶ھ درج ہے۔

اس لحاظ سے میرا سنِ ولادت ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۵۲ھ قرار پاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

میرے والد بزرگوار جناب احمد شریف صاحب مرحوم، شہر حیدرآباد کے متوسط گھرانے کے اکلوتے فرزند تھے۔ نظام حیدرآباد کے دور حکومت میں تحصیل شرقی (صرف خاص مبارک) صیغہ ہراج کے ذمہ دار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد سے بھی گود بھر دی تھی۔ دس لڑکے چار لڑکیاں۔ (اِن سطور کی تحریر کے وقت ۱۴۱۳ھ م ۱۹۹۲ء سات لڑکے اور تین لڑکیاں بقید حیات ہیں) سب سے بڑے صاحبزادے

لطیف شریف مرحوم دکن کے شعراء میں لطیف ساجد کے نام سے مشہور و معروف رہے ہیں اُردو شاعری میں بڑا مقام پایا۔

راقم الحروف لڑکوں میں پانچویں نمبر پر ہے سلسلۂ نسب صرف اسی حد تک معلوم ہو سکا۔

محمد عبدالرحمٰن بن احمد شریف بن رحمٰن شریف بن عبدالقادر

جدِ اعلیٰ عبدالقادر صاحب مرحوم مضافاتِ دکن میں زمیندار تھے۔ میں اپنے دادا رحمٰن شریف صاحب کی وفات کے چند ماہ بعد پیدا ہوا تھا اس نسبت سے اہلِ خاندان نے میرا نام رحمٰن شریف تجویز کیا جو بعد میں متروک ہو گیا۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

عمر کے پانچویں سال اسکول میں داخل کیا گیا۔ ساتویں کلاس پاس کیا تھا کہ ستمبر ۱۹۴۸ء حیدرآباد پر انڈین یونین کا حملہ ہوا۔ اور یہ چھوٹی اسلامی ریاست جس کے آخری تاجدار نظام سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر اقتدار سے بے دخل کردیئے گئے اس طرح ساتویں نظام پر خاندانِ آصفجاہی کا دو سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا۔

اس حادثے نے مسلمانانِ دکن کی بساط ہی اُلٹ دی، اس افراتفری میں میرا تعلیمی سلسلہ بھی منقطع ہو گیا والد صاحب مرحوم نے تجارتی سلسلے میں منسلک کردیا۔

آغازِ زندگی

مجھ کو بچپن ہی سے دینی و اسلامی ذوق نصیب تھا نمازوں کی پابندی، دینی مجالس میں شرکت، اور چونکہ شہر کا عام معاشرہ بدعات و رسومات میں گھرا ہوا تھا میں بھی ذوق و شوق سے ایسی رسومات میں حصہ لیا کرتا تھا بلکہ اپنے ہم عمروں میں اس حیثیت سے ممتاز بھی سمجھا جاتا تھا۔

بہرحال تجارتی لین دین سے اجنبیت اور بے چینی محسوس کرتا رہا اور کسی گم شدہ حقیقت کی تلاش میں تھا۔ انہی دنوں علم دین کی طلب پیدا ہوئی تلاشِ حق میں شہر کے ایک گمنام بزرگ مولانا میر امام الدین صاحبؒ سے وابستہ ہوگیا یہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے بعد میں دل کی شمعِ حق کو روشن کیا، موصوف سے مسلسل وابستگی نے صراطِ مستقیم پر لاکھڑا کر دیا، پھر کیا تھا تحصیل علم کا داعیہ اُبل پڑا۔

آغازِ تعلیم

انہی بزرگ کی رہنمائی سے محرم ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء مخفی طور پر گھر سے راہِ فرار اختیار کی اور شمالی ہند کے ضلع ہردوئی پہنچا جہاں حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ارشد اور مدارسِ دعوۃ الحق کے بانی وناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم کا مرکزی مدرسہ اشرف المدارس تھا داخلہ لے لیا۔

اسی مدرسہ میں حضرت ناظم صاحبؒ مدظلہ نے میرا دوسرا نام محمد عبدالرحمٰن تجویز کیا جو بعد میں اسی نام سے پکارا گیا اور خاندانی نام متروک ہوگیا۔

میری زندگی کا یہ پہلا سفر تھا جو نہایت ناموافق حالات میں تحصیلِ علم کیلئے اختیار کیا گیا۔ لیکن اس وقت تک علمِ دین کا تصور صرف اسی حد تک تھا کہ قرآن مجید حفظ کرلیا جائے وبس۔ چنانچہ مدرسہ اشرف المدارس میں حفظِ کلام پاک شروع کردیا گیا۔ سات یوم بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ ایک پارہ حفظ ہوگیا۔ اساتذہ میں حضرت قاری صاحب نے ناظمِ اعلیٰ کو ہفتہ وار تعلیمی رپورٹ میں اس نووارد طالب علم کے درخشاں مستقبل کی خوشخبری دی اور یہ توقع ظاہر کی کہ انشاء اللہ ایک سال میں حفظِ قرآن مکمل ہوجائے گا۔ لیکن تقدیر کے فیصلے بہرحال نافذ ہوکر رہتے ہیں اہل خاندان کی بعض غلط فہمیوں کی بنیاد پر آٹھویں ہی دن میرے والد بزرگوار حیدرآباد سے ضلع ہردوئی (یو، پی) پہنچے اور پولس کارروائی کے

ذریعہ حیدر آباد لے آئے۔
میرا یہ حادثہ مدرسہ اشرف المدارس ضلع ہردوئی کی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ تھا جو علمِ دین کی طلب و جستجو میں ایک غریب الوطن کو پیش آیا۔ تفصیل بڑی دل گداز اور سبق آموز بھی ہے ناظمِ اعلیٰ مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم سے یہ سنا گیا کہ حضرت موصوف نے بیرون ہند کے بعض اسفار میں دینی مدارس کے بچوں میں تحصیلِ علم کی طلب و جستجو کے ضمن میں حیدر آباد کے اس کم سن طالب علم کا یہ واقعہ بارہا بیان کیا ہے مدرسہ اشرف المدارس سے یہ جبر و اکراہ نکالے جانے کا یہ واقعہ علمِ دین حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے یقیناً ایک درس کی حیثیت رکھتا ہے۔

میرا پہلا سفر

مجھکو تحصیلِ علم کے لئے باہر جانیکی جستجو اپنے محلہ کے اُن دو لڑکوں سے پیدا ہوئی جو اشرف المدارس (ہردوئی) میں زیرِ تعلیم تھے اور جو ہر سال سالانہ چھٹی گذارنے اپنے گھر آیا کرتے تھے یہ دونوں لڑکے ایک صاحب نقوی بزرگ حضرت محمد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند حافظ عبد المعز اور حافظ عبد العزیز[۵] تھے یہ جب اپنے وطن آتے تو مدرسہ کے حالات بیان کرتے اور اپنی تعلیمی مصروفیت کا ذکر کرتے ان کی اسلامی زندگی اور اخلاق و عادات اور مدرسہ کے حالات دل کو بے قرار کر دیا کرتے تھے۔ لیکن سفر کے اسباب کچھ نہ تھے۔ انہی دنوں شہر کے متذکرہ بزرگ حضرت مولانا میر امام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں آمد و رفت کا آغاز ہو چکا تھا حضرت موصوف کی تعلیم و تربیت نے اس کٹھن راہ کو آسان بنا دیا حضرت ممدوح نے تحصیلِ علم کے لئے مدرسہ اشرف المدارس (ضلع ہردوئی یو،پی) کا انتخاب فرمایا اور

---

[۵] موجودہ ناظم مجلسِ علمیہ حیدر آباد و رکن مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند

مصارفِ سفر کا جملہ انتظام بھی۔
حضرت ممدوح کی اہلیہ مرحومہ کا احسان بھی خوب یاد ہے موصوفہ نے اپنے ہاتھوں کپڑوں کے چھ جوڑے از خود تیار کر کے صندوق میں رکھ دئے پھر فرمانے لگیں بیٹا فی الحال اتنے کپڑے ایک سال کے لئے کافی ہیں انشاء اللہ دوبارہ انتظام کر دیا جائے گا۔

اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ حَسَنَاتِھَا واَلْبِسْھَا لِبَاسَ الْجَنَّۃِ

چوری چھپے اپنے گھر سے بستر وغیرہ کا انتظام کر لیا سفر کی تاریخ قریب آگئی لیکن ان دنوں خاندان میں میرے کسی بھی وقت بے علم و اطلاع فرار ہونے کی افواہ پھیل گئی تھی۔ جس سے ایک طرح کی نگرانی قائم ہوگئی یہ زمانہ حیدرآباد پر پولس ایکشن کے مختصر عرصہ بعد ہی کا ہے مسلمانوں میں افراتفری کا دَور دَورہ تھا حکومت کا نظام بدل رہا تھا عام طور پر مسلمان پاکستان کی جانب ہجرت کر رہے تھے والد مرحوم نے ہم سب بھائیوں کو سرکاری اسکول سے نکال کر تجارت میں لگا دیا لیکن میری فطرت اس جانب قطعًا مائل نہ تھی۔ ہمت کر کے اپنے والد مرحوم سے عرض کیا مجھکو تجارت سے کوئی دلچسپی نہیں ہو رہی ہے اور میرا دل تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ براہِ کرم تحصیلِ علم کے لئے ہندوستان کے کسی دینی مدرسہ میں شریک کروا دیا جائے

یہی بات اپنے بڑے بھائیوں سے بھی کہی لیکن سب کا یہی جواب تھا کہ تم ابھی بچے ہو مستقبل کے حالات کا تمہیں اندازہ نہیں آصفجاہی حکومت ختم ہو چکی ہے آئندہ مسلمانوں پر کیا حالات آنے والے ہیں وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ علم دین حاصل کر کے تم اپنے مستقبل کو کیسے خوشگوار بنا سکتے ہو جب کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے نکالا جا رہا ہے۔ علم دین کی سند پر تم کو کون ملازمت

دے گا؟ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ۔

بہر حال میری گذارش صدا بصحرا ثابت ہوئی اور اہل خاندان قطعاً راضی نہ ہوئے۔

ایک کھلی تائید

سفر کی طے شدہ تاریخ ۲ محرم ۱۳۶۹ھ م ۱۹۵۰ء آپہنچی چوری چھپے ملک پیٹ ریلوے اسٹیشن سے سکندر آباد پہنچا دہلی کی گاڑی میں سوار ہوا اس موقعہ پر ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ریل گاڑی روانہ ہونے میں چند ہی منٹ باقی تھے کہ میرے ایک بھائی میری تلاش میں ڈبے کے قریب آگئے۔ میں یکدم سکتے میں آگیا اور میرا بدن بوجھل سا ہو گیا اور میں چھپنے یا فرار ہونے کی طاقت کھو بیٹھا اس موقعہ پر تائیدِ الٰہی کا ظاہری آنکھوں سے مشاہدہ ہوا۔ بھائی صاحب سامنے ہی سے نظر دوڑاتے گزر گئے۔ پر میں دکھائی نہ دیا۔ گذرنے کے بعد میں فوری اٹھا اور ریل گاڑی کے حمام خانہ میں چھپ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ریل چل پڑی تو اطمینان ہو گیا کہ میں محفوظ ہو چکا ہوں اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔

محلہ ملک پیٹ سے چلتے وقت حضرت میر امام الدین صاحبؒ سے میں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ حضرت خاندان میں میرے کسی بھی وقت فرار ہونے کی اطلاع عام ہو چکی ہے۔ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں؟ فرمایا اللہ کی حفاظت شامل حال ہے انشاء اللہ سفر خیر کے ساتھ پورا ہو گا۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا زندگی کا یہ پہلا سفر تھا اور وہ بھی دُور دراز مقام کا اللہ تعالیٰ نے خیر کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا دیا۔

مدرسہ اشرف المدارس (ضلع ہردوئی) میں داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔ پہلا دن تو آرام کیا۔ دوسرے دن حضرت ناظم صاحب

نے دریافت کیا، کیا پڑھنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا قرآن حفظ کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے اس وقت تک علم دین کا صرف یہی تصور تھا کہ حافظِ قرآن ہو جائیں وبس

کچھ غور کے بعد حضرت ناظم صاحب نے بھی یہی مناسب سمجھا اور حفظِ قرآن کی جماعت میں بٹھا دیا گیا۔ دوشنبہ (پیر کا دن) داخلِ مدرسہ ہوا تھا دوسرے دوشنبہ تک پہلا پارہ حفظ ہو چکا۔

مدرسہ سے اخراج

آٹھویں دن اجتماعی طور پر جیسا کہ مدرسہ کا نظام تھا درسگاہ سے صف بندی کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ مدرسہ کے صحن میں اپنے والد صاحب کو کھڑے دیکھا تو قدم زمین سے اُٹھ نہ سکے ساکت کھڑا ہو گیا یقین نہیں آتا تھا کہ یہ میرے والد محترم ہیں۔ شکل وصورت تو والد مرحوم ہی کی تھی۔ لیکن لباس انگریزی تھا جو زندگی میں کبھی بھی استعمال نہیں کیا اس لئے اشتباہ پیدا ہوا۔

بس کیا تھا تیزی سے آکر مجھکو پکڑ لیا اور غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے لگے میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو شامت آگئی اپنے ہاتھ کی پتلی بید سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اور کہتے جاتے کہ تجھ کو حیدرآباد چلنا پڑے گا۔ تو کس کی اجازت سے یہاں آیا؟ پٹائی خوب جاری تھی بعض طلبہ نے دوڑ کر حضرت ناظم صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع دی حضرت ناظم صاحب نے آدمی بھیجے اور والد صاحب کو اپنے یہاں طلب کیا اور صورتِ حال دریافت فرمائی والد صاحب نے پہلے تو اپنا تعارف کروایا پھر زبان اِسٹاپ بولنا شروع کیا کہ آپ نے ماں باپ کی اجازت کے بغیر بچے کو کیسے داخلہ دیا؟ اور کیسے طلب کیا؟ کیا آپ نے اِس کو یتیم سمجھا؟ کیا آپ کو ماں و باپ سے بھی زیادہ خیر خواہی حاصل ہے وغیرہ وغیرہ۔

میرا محتاط اندازہ تو یہ ہے کہ اس طرز کی گفتگو پون گھنٹے سے زائد ہی رہی اور پھر لب و لہجہ بھی کچھ ایسا تیز و تلخ تھا جس کو عام طور پر برداشت بھی نہ کیا جاتا ہو۔

ایک اخلاقی کرامت

لیکن اس موقعہ پر ایک اخلاقی کرامت کا ظہور ہوا حضرت ناظم صاحب سراپا ضبط و تحمل، خندہ پیشانی سے سماعت کر رہے تھے چہرے پر کسی بھی تغیر کا نام و نشان نہ تھا۔ آخر وقت تک چہرے پر مسکراہٹ ہی نظر آتی رہی۔ مجھے خوب یاد ہے حضرت ناظم صاحب بار بار یہی فرماتے تھے آپ اپنے لڑکے کو لیجائیں ہم نے نہ انھیں طلب کیا ہے اور نہ ہم زبردستی اس کو باہر کریں گے یہ خود جانے کا فیصلہ کرے انھیں پورا اختیار ہے والد صاحب کا شدید تقاضہ یہی تھا کہ اس کو مدرسہ کے احاطے سے باہر کر دیا جائے پھر میں اس کو دیکھ لوں گا۔ لیکن میں ایک سکنڈ کے لئے بھی باہر ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور والد صاحب کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا اپنی زندگی میں والد مرحوم کو دُو بدو جواب دینے کا یہ پہلا اور آخری حادثہ تھا جو مجھ سے اس وقت سرزد ہوگیا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اور والد مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

دو۲ گھنٹے کی اس طویل کشمکش کے بعد والد صاحب یہ کہتے ہوئے مدرسہ سے باہر چلے گئے کہ تجھ کو بہر صورت حیدرآباد چلنا ہوگا۔ خواہ زندہ حالت میں یا مُردہ حالت میں۔

والد صاحب کے باہر چلے جانے کے بعد مدرسہ کا صدر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور میں مطمئن ہوگیا کہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک بڑے طوفان کی پیش بندی تھی۔ نصف یوم گزر چکا تھا۔ حضرت ناظم صاحب نے دوپہر کے کھانے کیلئے مجھکو اپنے دسترخوان پر طلب فرمایا نہایت شفقت وعنایت سے کھلایا پلایا پھر ارشاد فرمایا اب آرام کرو میں چونکہ بُری طرح تھکا ہوا تھا اور پھر

پٹائی بھی خوب ہوئی تھی عصر تک سوتا رہا۔ بعد عصر دلجوئی کے لئے کھیل کبڈی کا انتظام کیا گیا اور اساتذہ حضرات نے بھی اس کھیل میں حصّہ لیا، بعد مغرب حسب نظام مدرسہ کے احاطے میں طلبہ اپنی اپنی تعلیمی مصروفیت میں مشغول ہوگئے میں بھی حفظِ قرآن کی مشق کر رہا تھا اچانک ایک طالب علم آئے۔ اور حضرت ناظم صاحب کا یہ پیام پہنچایا کہ فوری طور پر اپنے کمرے میں چلے جائیں میں نے تعمیل کی لیکن اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی، چند ہی لمحات کے بعد دیکھا کہ ایک بڑا ہجوم مدرسہ میں داخل ہو رہا ہے اور آگے آگے چند پولیس والے بھی ہیں یہ ایک وحشت ناک حالت تھی۔ میں اپنے تحفظ کی فکر ہی میں تھا کہ پولس والے کمرے میں آگئے ہاتھوں میں چوروں کو باندھنے والی رسّی تھی والد صاحب بھی موجود ہیں اس اچانک اور غیر متوقع صورتِ حال سے میں بیحد گھبرا گیا اور ایک سکتہ سا چھا گیا۔ ایک پولس والا آگے بڑھا اور مجھکو مدرسہ کے احاطے میں لے آیا۔ اسوقت مدرسہ کا احاطہ مقامی لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور لوگ مجھکو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

زُبان بندی

ایک پُولس آفیسر میرے قریب آیا اور محبت سے پوچھنے لگا بیٹا تمہارا کیا نام ہے؟ اور تم کو یہاں کس نے طلب کیا ہے؟ والد صاحب مرحوم کی جانب اشارہ کر کے پوچھنے لگا یہ تمہارے کون ہوتے ہیں؟ کیا تم اِن کے ساتھ جانا چاہتے ہو؟

بار بار یہی کلمات دُہرا رہا تھا اور میں پورے ہوش و حواس میں تھا لیکن زُبان اتنی بوجھل ہوگئی کہ ارادہ کرنے کے باوجود حرکت میں نہ آئی اور میں ایک لفظ بھی تو زبان سے نکال نہ سکا پتھر کی طرح ساکت ہوگیا۔ اور وہ پولس آفیسر مُسلسل سوالات دُہرا رہا تھا دو چار منٹ بعد حضرت ناظم صاحب مجمع کو چیرتے پھاڑتے تشریف لائے اور نہایت پیار و محبّت سے فرمایا۔ عبدالرحمٰن گھبراؤ نہیں

یہاں سے تم کو کوئی بھی زبردستی نہ لے جائے گا ان صاحب کو جواب دو؟ کیا تم یہاں رہنا چاہتے ہو؟ یا والد صاحب کے ساتھ جانا چاہتے ہو؟ تم کو پورا پورا اختیار ہے گھبراؤ نہیں یہ لوگ صرف تمہارا جواب چاہتے ہیں؟ حضرت ناظم صاحب بار بار فرما رہے ہیں لیکن ایسے وقت بھی میری زبان کا سکتہ دور نہ ہوا، بہت کچھ کہنا چاہ رہا ہوں لیکن "زبان بندی" کی کیفیت برقرار ہے۔

زُبان کشائی

بس خاموش کھڑا ہوں اسی درمیان ایک پولس والے نے کہا کہ اس بچے کو اغوا کیا گیا ہے اور یہ کچھ کہنے سے گھبرا رہا ہے۔ بس گود میں اٹھالیا اور یہ جا وہ جا مدرسے سے باہر ہو گیا پولس گاڑی تیار تھی سوار ہوئے اور چند منٹوں میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ لکھنؤ جانے کے لئے ریل تیار تھی اسٹیشن پر اچانک "زبان کشائی" ہوئی تو بول پڑا، لیکن چڑیاں چگ گئیں کھیت، چار عدد پولس والے ساتھ تھے۔ رسّی دکھلا کر کہنے لگے خاموش!

بس قصّہ ختم ہوا ریل چل پڑی پولس کے ان چار بھوت کی نگرانی میں لکھنؤ پہنچا۔ لکھنؤ سے ان کا منہ کالا ہوا اور ہم حیدرآباد کے لئے روانہ ہو گئے۔

خودکشی

قصّہ کا اختتام نا تمام رہے گا اگر اثنائے سفر کے دو واقعات بیان نہ کئے جائیں۔ اس حادثہ پر زندگی بے قیمت معلوم ہو رہی تھی میں بہت ہی غمزدہ اور اداس تھا۔ ریل براہ کانپور حیدرآباد کے لئے رواں دواں تھی کانپور سے پہلے دریائے گنگا کے دو منزلہ بلند و بالا پل سے ریل کو گزرنا پڑتا تھا۔ اس سے پہلے کہ پل آئے میں نے طے کر لیا کہ دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا جائے۔

اس وقت اس مصیبت کی تلافی ایسے ہی سمجھ میں آ رہی تھی اِدھر والد صاحبؒ

مسلسل سفر کی تھکان سے گہری نیند میں تھے میں نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اٹھا اور وضو کیا پھر توبہ واستغفار کیا اور ایک چھوٹے سے کاغذ پر اپنی خودکشی کا مختصر سبب لکھا کہ "تحصیلِ علم کی ناکامی میں اپنی زندگی کا خاتمہ کررہا ہوں"

والد صاحب کے بیگ میں یہ کاغذ رکھ دیا ریل اپنی تیز رفتاری سے چل رہی تھی دَروازہ کھولا اور دَروازے کے دونوں بازو پکڑ کر پُل کا انتظار کرنے لگا چند ہی منٹ میں پُل آگیا اور ریل پُل پر گزرنے لگی ریل جب دریا کے بالکل بیچ میں آگئی تو میں بے ساختہ بسم اللہ کہہ کر اپنے آپ کو دھکّا دے دیا. لیکن دونوں ہاتھوں کی گرفت چھوٹ نہ سکی جو دَروازے کے دونوں بازؤں کو پکڑے ہوئے تھی، پھر دوبارہ دَھکّا دیا گرفت اور زیادہ مضبوط ہوگئی خیال آیا کہ کسی نے تھام لیا ہے پیچھے دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ چند لمحات اسی حالت میں گزر گئے لیکن پھر میں نے ہمت تازہ کی اور تیسری بار پوری قوّت سے اپنے آپ کو گرایا۔ ہاتھوں کی گرفت کے علاوہ دونوں پیر بھی دہلیز سے چپک گئے. اب نہ آگے ہو سکا نہ پیچھے، گم سُم کھڑا رہ گیا، اسی کشمکش میں نیچے نظر پڑی تو دیکھا کہ ریل "بلہراط" کو پار کر چکی ہے.

فَسُبْحَانَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ط

شہر کانپور آگیا سامنے اسٹیشن تھا دونوں ہاتھ اور پیروں کی گرفت بالکل نارمل ہوگئی۔ بس سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اللہ باقی، باقی فانی۔

خود گرفتاری

شہر کانپور سے کچھ دیر بعد ریل چل پڑی دوپہر سے پہلے شہر بھوپال آیا والد صاحب مرحوم مسلسل سو رہے تھے اور میری نیند تو معلوم نہیں کس وادی میں گر پڑی تھی میں بیدار تھا بھوپال اسٹیشن پر ریل معمول سے زیادہ ٹھہر گئی۔ میرے فراری ذہن نے مشورہ دیا کہ

دریا میں کود نہ سکا راہ فرار تو اختیار کی جا سکتی ہے ؟ اور شہر کے کسی بھی مدرسہ میں پہنچا جا سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ریل سے اُتر پڑا تا کہ اسٹیشن سے باہر ہو جاؤں لیکن ٹکٹ پاس نہ تھا والد صاحب کی جیب میں تھا، گیٹ والا باہر کیسے ۔۔۔ جانے دے گا؟ پھر خیال آیا کہ انجن سے آگے ہو کر باہر نکل جاؤں چنانچہ بغیر کسی تردّد پٹریوں سے گزر کر باہر ہو گیا اور اپنی ناک کی سیدھ تیزی سے چل پڑا، شہر میرے لئے نیا تھا اور میں شہر کے لئے نیا۔ آبادی میں پہنچ گیا ظہر کی اذان ہو رہی تھی سیدھے مسجد میں داخل ہوا اب یاد نہیں کہ محلّہ اور اُس مسجد کا کیا نام تھا صرف اتنا یاد ہے کہ مسجد میں کشادہ حوض تھا، وضو کیا پھر جماعت کا انتظار کیا باجماعت نماز ظہر ادا کی اور اپنی تدبیر پر شکر ادا کیا۔

لوگ سنتیں پڑھکر واپس ہونے لگے مسجد میں دو ایک بوڑھے ضعیف کے اور کوئی نہ رہا۔ کچھ دیر مسجد میں لیٹ گیا لیکن نیند کہاں آتی بھوک نے بیقرار کر دیا تھا ضلع ہردوئی سے چلے چوبیس ۲۴ گھنٹے ہو گئے تھے اس درمیان ایک لقمہ بھی تو نہیں لیا اور یہ تو خیال بھی نہ آیا کہ کسی سے اپنی بھوک پیاس کی شکایت کروں۔ جیب میں صرف دس ۱۰ پیسوں کا ایک سکّہ۔ خدا جانے کیسے رہ گیا تھا اُسی میں اپنی شکم سیری نظر آئی۔ اٹھا اور مسجد کے دروازہ پر آیا دیکھا کہ ایک شخص کھیرا فروخت کر رہا ہے دس ۱۰ پیسے دیکر چار عدد کھیرے نمک مرچ لگائے ہوئے لے لیا اور مسجد میں بیٹھ کر ایسے اطمینان سے کھایا کہ غم ہلکا ہو گیا، جی بھر ٹھنڈا پانی پیا اور پھر لیٹ گیا آگے کی منزل کا ابھی کوئی خیال نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ پیٹ ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ پیٹ کی آگ بجھی دل ٹھنڈا ہوا تو وساوس کا دَور دورہ شروع ہوا خیال آیا کہ ریل سے نکلتے وقت اپنا صندوق کیوں نہ اٹھا لیا۔ جس میں کپڑوں کے علاوہ چند روپئے بھی ہیں اس طرح خالی

ہاتھ کس مدرسہ میں پناہ ملے گی اور کون شخص مجھکو طالب علم سمجھے گا؟ مختلف وساوس نے بے چین کر دیا، معصوم ذہن نے پھر مشورہ دیا کہ اسٹیشن جا کر کیوں نہ اپنا صندوق اٹھا لیا جائے تاکہ شہر کے کسی بھی مدرسہ میں طالب علم کی حیثیت سے پہنچا جا سکے۔

بھوپال اسٹیشن سے نکلے ہوئے یقیناً تین گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے لیکن ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ ریل تو روانہ ہو چکی ہو گی صندوق کہاں ہو گا؟

ع دہن کا ذکر کیا ہے سر ہی غائب ہے گریباں سے۔

بہر حال اس قسم کا کوئی وسوسہ تک نہ آیا مسجد سے فوری باہر آیا اور پوچھتے پاچھتے اسٹیشن پہنچا اسی پلیٹ فارم پر ایک ریل کھڑی تھی ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ ریل کہاں جا رہی ہے؟

کہا "حیدر آباد" تیزی سے انجن کی جانب چلا پہلا ڈبہ حیدر آباد کا تھا دیکھا تو والد صاحب محو خواب ہیں اپنی تدبیر کامیاب نظر آئی عجلت میں اپنا صندوق اٹھا لیا لیکن وہ دوسرے صندوق سے ٹکرا گیا آواز پیدا ہوئی والد صاحب اچانک بیدار ہو گئے۔ بس ساری کارروائی ڈھیر ہو گئی۔

پوچھا! کیا بات ہے؟ میں نے جواب نہ دیا، بازو والوں سے دریافت کیا کونسا اسٹیشن ہے؟ لوگوں نے کہا شہر بھوپال ہے آگے کوئی مال گاڑی پٹریوں سے اُتر گئی ہے اس کی درستگی تک ہماری ریل کو روک دیا گیا ہے ابھی اسی گفتگو کو ہوئے دس پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ہماری ریل چل پڑی۔ ع خود بخود آزاد بُودی خود گرفتار آمدی۔

جہاں سے چلے تھے وہاں پہنچ گئے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى

میرا دُوسرا تعلیمی سفر

مدرسہ اشرفُ المدارس (ضلع ہردوئی) سے حیدرآباد واپسی پر تقریباً چھ ماہ اہل خاندان کی نگرانی رہی اس عرصہ میں طلب علم کا تقاضہ شدّت اختیار کرتا رہا آخر کار ۱۹۵۰ء مطابق ۱۳۷۰ھ مخفی طور پر دوبارہ راہ فرار اختیار کی یہ سفر بھی مُرشد اوّل ہی کی رہنمائی اور خصوصی تعاون سے تکمیل پایا البتہ اس دفعہ یہ کوشش رہی کہ اہل خاندان کو کچھ بھی پتہ نہ لگے۔

یُوپی کے ضلع سہارن پُور مولنا سیّد ظہور الحسن صاحبؒ مدرس مدرسہ مظاہر علوم کے یہاں پہنچا مولانا موصوف نے ضلع مظفر نگر کے قدیم اور تاریخی قصبہ شاملی میں مولانا محمد اسلام صاحبؒ کے مدرسہ میں داخل کروادیا اس سفر میں محلّہ کے ایک دوست سیّد حسین بھی ساتھ تھے (موجودہ خطیب مسجد مجلس ضلع گلبرگہ مہاراشٹر۔ انڈیا) مولانا محمد اسلام صاحبؒ نے عام طور پر طلبہ کی بے ذوقی اور عدم توجہی کی بنا پر عرصہ دراز سے درس وتدریس کا سلسلہ بند کر رکھا تھا قصبہ کے بچوّں کو صرف حفظ قرآن کروارہے تھے۔ شہر حیدرآباد کا یہ غریب الوطن طالب علم جب شاملی پہنچا تو استاذ محترم کا جذبۂ درس وتدریس اُبل پڑا اور بڑی گرم جوشی سے ان دونوں طالب علم کا استقبال کیا پھر اس جوش وخروش سے تدریسی سلسلہ جاری فرمایا جو صرف خوش نصیب شاگردوں کو میسّر آتا ہے

علم کی قدر دانی

زمانہ طالبِ علمی کی قدر دانی جس طرح میں نے کی ہے میرے ہم عمر دوستوں سے بالکل مختلف رہی ہے۔ کتاب واستاذ کا احترام، طلب وجستجو کا اہتمام، وقت وحاضری کا التزام، یہ اور اس قسم کی نعمتیں منجانب اللہ میسّر تھیں۔ انہی ایّام میں میں اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ علم سے فراغت کے بعد اکثر حضرات کو کہتے سنا گیا ہے "افسوس

ہم نے زمانۂ طالب علمی کی قدر نہ کی اور نہ محنت و توجہ سے علم حاصل کیا، لیکن میں انشاء اللہ ایسا ہرگز نہیں کہوں گا' (الحمدللہ آج ۱۴۱۳ھ میں بھی یہی کہتا ہوں) مشفق اُستاذ کی عنایت و توجہ سے ابتدائی عربی کورس کا پانچ سالہ نصاب تین سال میں مکمل ہوگیا اور آگے کی منزلیں قریب نظر آنے لگیں، علم دین کے اس ابتدائی مرحلہ میں غیبی تائیدات، بزرگوں کی عنایات، منامی بشارات، اتنی کثرت سے پیش آئیں جس کا احاطہ مشکل ہے اسی زمانے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار خوابی زیارت سے مشرف ہوتا رہا (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مرتبہ آپ کے ساتھ آپؐ کے تمام اصحاب کرام کی زیارت بھی نصیب ہوئی یہ عجیب وغریب خواب تھا جس نے میری طالب علمانہ زندگی میں ایک نئی زندگی کا آغاز کردیا۔ تحصیل علم میں تحقیق وجستجو پیدا ہوئی۔ عبادات اور شب بیداری کا داعیہ بڑھتا گیا، ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ کثرتِ بیداری نے دماغ کو متأثر کردیا اسی عرصہ میں بیس اکیس ۲۱ دن ایسے بھی گزرے ہیں جس میں مجذوبی کیفیت طاری رہی استاذِ محترم کی طبی تدابیر نے دستگیری کی دوا علاج کے علاوہ تعلیمی مشغولیت کو بند کردیا گیا، کتابیں چھین لی گئیں اور پھر راحت وآرام کے اوقات بھی متعین کردیے گئے۔ یک ماہ تک صبح وشام سبزہ زار پر برہنہ سر اور برہنہ پا چہل قدمی بھی کروائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور عام صحت لوٹ آئی ورنہ معلوم نہیں آج ہم کن مجذوبوں کی جماعت میں ہوتے۔

یہاں اُس خواب کو نقل کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس نے طالب علمانہ زندگی میں انقلابی کیفیت پیدا کردیا تھا۔

باعظمت خواب

جیساکہ عرض کیا گیا طالب علمانہ زندگی میں بحث ومباحثہ تحقیق وتنقید، غور وفکر کی جانب طبعی سا لگاؤ تھا خاص طور

پر ائمہ مجتہدین میں امام ابو حنیفہؒ کے اقوال اور ان کی تحقیقات کا مطالعہ ذوق وشوق سے کیا کرتا تھا۔ انہی دنوں کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا نیند آگئی عالمِ خواب میں پہنچ گیا دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے اور چاروں سمت سے لوگ جمع ہو رہے اور ہر شخص مجمع کے درمیان داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے، میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ ہجوم کن لوگوں کا ہے؟ جواب دیا گیا کہ یہ سب اصحاب رسولؐ ہیں یہاں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا کسی مسئلہ میں مناظرہ ہو رہا ہے، امام صاحبؒ کا نام سنتے ہی میں تیزی سے مجمع کے درمیان پہنچ گیا،

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا دیکھا امام ابو حنیفہؒ دراز قد، گھنی ڈاڑھی، لمبا کرتہ، جمیل شکل وصورت، بالکل سیدھے کھڑے ہیں۔

امام شافعیؒ نسبتاً پست قد، دراز ڈاڑھی، کمر قدرے جھکی ہوئی، چہرہ نورانی، عبا یا زیب تن، ادب واحترام سے کھڑے ہیں۔

ان دونوں بزرگوں کو دیکھکر دل باغ باغ ہو گیا۔ تیزی سے امام ابو حنیفہؒ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور توجہ سے دونوں حضرات کی گفتگو سننے لگا مسئلہ رفعِ یدین (یعنی نماز میں بار بار ہاتھ اٹھانا) کا تھا امام ابو حنیفہؒ اپنے دلائل بیان کر رہے تھے اور امام شافعیؒ اپنے دلائل۔

تفصیل تو یاد نہیں کہ کیا کیا دلائل تھے لیکن نہایت ادب واحترام سے گفتگو جاری تھی۔ جب امام صاحب کچھ فرماتے تو امام شافعیؒ توجہ سے سماعت فرماتے اور امام شافعیؒ کی گفتگو کو امام صاحب بھی ویسے ہی توجہ دیتے، ایک دوسرے کی گفتگو میں کوئی بھی مداخلت نہیں کرتا۔ بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری

رہا اور مجمع بھی نہایت پُرسکون طریقے پر سماعت کر رہا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجمع کا آخری حصّہ بھی ویسے ہی سُن رہا ہے جیسے درمیانی حصّہ، ہر جانب آواز یکساں سنائی دے رہی ہے۔ لیکن فیصلہ ہونے نہ پایا تا ہیں آہستہ آہستہ امام ابو حنیفہؒ کے پیچھے بالکل قریب ہو گیا میرے اور آپ کے درمیان اور کوئی نہیں، اور منتظر ہوں کہ امام صاحب کامیاب ہو جائیں گے۔ اس طویل مباحثہ کا آخری حصّہ خوب یاد ہے ممکن ہے الفاظ آگے پیچھے ہوں لیکن مفہوم یہی تھا۔ امام شافعیؒ نے امام صاحبؒ سے دریافت فرمایا کیا آپ کے ہاں کوئی حدیث شریف بطور دلیل موجود ہے؟ اس پر امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کیوں نہیں۔

مجھ سے حدیث بیان کی حمّادؒ نے ابراہیم نخعیؒ سے اور ابراہیم نخعیؒ نے حدیث بیان کی علقمہؒ اور اسودؒ سے اور ان دونوں حضرات نے حدیث بیان کی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھایا کرتے تھے پھر اس کے بعد کسی بھی حالت میں نہیں اٹھاتے۔

یہ سُن کر امام شافعیؒ خاموش ہو گئے پھر امام ابو حنیفہؒ نے دریافت کیا آپ کے ہاں کیا دلیل ہے؟

امام شافعیؒ نے نہایت ادب و احترام سے جواب دیا۔

مجھ سے حدیث بیان کی اوزاعیؒ نے ابن شہاب زہریؒ سے اور زہریؒ نے حدیث بیان کی سالمؒ سے اور سالمؒ نے اپنے والد عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت اور رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھایا کرتے تھے۔

اِن دونوں حضرات کی گفتگو سے تھوڑی سی دیر کے لئے عالم سکوت سا پیدا ہوا اور دونوں امام خاموش کھڑے رہے۔ میری بیقراری میں اضافہ ہونے لگا کہ الٰہی اب کیا ہوگا؟ دونوں کے پاس حدیثِ رسول ہے اچانک امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ٹھیک ہے تو پھر ہم خود ہی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھ لیں یہ کہکر دونوں امام آگے چلنے لگے اور مجمع بھی ہٹنے لگا قریب ہی دونوں صحابیٔ رسول تشریف فرما تھے یہ منظر عجیب روح پرور تھا امام ابوحنیفہؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بالکل ہم شکل تھے۔ اور امام شافعیؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مشابہ۔

امام شافعیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے عرض کیا حضرت کیا آپ نے یہ حدیث بیان نہیں فرمائی؟ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے پھر امام ابوحنیفہؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے عرض کیا حضرت مجھ کو آپ سے یہ حدیث پہنچی ہے فرمایا ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔

بات جہاں سے چلی تھی وہاں ہی پہنچ گئی اور مسئلہ حل نہ ہوا سارا مجمع خاموش کھڑا ہے کچھ دیر سکوت کا عالم رہا پھر اچانک امام ابوحنیفہؒ فرمانے لگے جب دونوں بزرگ صحابی ایسا ہی فرماتے ہیں تو پھر کیوں نہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلیں؟

آپ جو بھی فیصلہ فرمادیں وہی ہمارا بھی فیصلہ ہوگا۔

یہاں میرے عالم خواب کا یہ وہ عظیم ترین لمحہ تھا جس کی حلاوت و لذت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ خوشبوؤں اور مسرتوں کا ایک طوفان تھا جس نے بے خودی کی کیفیت پیدا کردی۔

دونوں امام چلنے لگے میں بھی ساتھ ہو گیا چند ہی لمحات میں ہم مجمع سے آگے ہو گئے اور سارا مجمع پیچھے تھا اور سامنے ایک بہت بڑا لق و دق جنگل ہے بہت دور ایک پہاڑی پر چھوٹی سی جھونپڑی نظر آرہی تھی مجمع میں چرچا ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تشریف لانے والے ہیں۔ سب کی آنکھیں اسی جانب ہیں۔ اس انتظار میں زیادہ دیر نہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچانک قریب آگئے۔ چہرے مبارک پر مسکراہٹ، دندانِ مبارک سے تیز روشنی نکل رہی ہے۔ سر مبارک پر سفید عمامہ۔ کرتہ دراز، اور پائجامہ ٹخنوں سے اوپر، دونوں مبارک پیروں میں نعلین شریفین صلی اللہ علیہ وسلم۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے ادب و احترام کا عجیب حال تھا۔ امام صاحبؒ تو آنکھیں نیچی کئے ہوئے ستون کی طرح ساکت کھڑے ہو گئے۔

امام شافعیؒ ویسے بھی خمیدہ کمر تھے ادب و احترام میں اتنے جھک گئے کہ رکوع کی حالت پیدا ہونے لگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو دیکھکر مسکرانے لگے۔ یہ عجیب بات تھی کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس موقعہ پر بھی پہل کی نہایت ادب سے عرض کیا

یا رسول اللہؐ آپ کے صحابی عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آنجناب نماز شروع کرتے وقت اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاتے تھے پھر کسی حالت میں اس کا اعادہ نہیں فرماتے۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے سکوت فرمایا (یعنی کوئی جواب نہ دیا۔)

پھر امام شافعیؒ نے اپنی کمر دراز کی اور بصد احترام عرض کیا۔

یا رسول اللہ ہم سے آپ کے صحابی عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ آپ آغاز نماز کے علاوہ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھایا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال پر بھی مسکراتے ہوئے سکوت فرمایا چند ہی لمحات نہ گزرے تھے کہ امام شافعیؒ کی جانب نظر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ابو حنیفہؒ ٹھیک کہتے ہیں۔

بس اتنا سنا ہی تھا کہ میں بے تحاشہ بول پڑا، ہمارے امام صاحبؒ جیت گئے پھر مجمع کو چیرتا پھاڑتا باہر نکل گیا اور میری زبان پر یہی کلمات تھے۔

لیکن بہت جلد مجھکو احساس ہو گیا کہ میں نے بچکانی حرکت کی ہے۔ (اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ خواب میرے بچپن ہی کا تو تھا) فوری پیچھے پلٹا تو دیکھا کہ سارا مجمع غائب ہے کچھ دیر حیرانی کی کیفیت رہی پھر ہوش آیا تو اپنی طفلانہ حرکت پر ندامت ہوئی کہ میں نے اتنی عجلت کیوں کی؟ اور کیوں نہ عقل سے کام لیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم از کم مصافحہ ہی کر لیتا اب کیا ہوگا؟

اسی حالت میں ایک صاحب بازو سے گزرے یہ صاحب ہمارے استاذ محترم مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ مظاہر علوم (سہارن پور) کے بالکل ہم شکل تھے (اور غالباً وہی تھے) میں نے ان سے دریافت کیا حضرت یہاں بہت بڑا مجمع تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما تھے یہ سب حضرات کہاں گئے۔

انھوں نے فرمایا میاں یہ سب حضرات امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی گفتگو سننے تشریف لائے تھے پھر یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی پہاڑی پر واپس چلے گئے ہیں یہ کہہ کر یہ صاحب بھی آگے بڑھ گئے۔ میں نے جو اس پہاڑی کی جانب دیکھا تو اتنا دور دراز فاصلہ نظر آیا کہ وہاں جانا ممکن نہ تھا عجیب بیقراری پیش آئی قریب ہی ایک درخت کے نیچے ایک عمر رسیدہ بزرگ تشریف فرما نظر آئے۔

تیزی سے اُن کی جانب چلا معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ (حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے پیرو مرشد اور حضرت تھانویؒ کے دادا پیر ہیں) دُبلے پتلے، پستہ قد، خمیدہ کمر نہایت ضعیف و کمزور، جب میں اُن کے قریب آیا تو وہ کھڑے ہو گئے میں نے سلام کیا تو سلام کا جواب دیا اور میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور دُعا دی اب یاد نہیں کہ وہ کیا کلمات تھے۔ جب اِن بزرگ پر میری دوبارہ نظر پڑی تو اُن کو بھی غائب پایا۔ بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے بیقراری میں مزید اضافہ ہونے لگا۔ پھر معاً خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب یہاں تشریف لائے تھے تو ایک درخت کے نیچے وضو یا استنجا رکیا تھا اسی خیال کے ساتھ اس درخت کی جانب چلا دیکھا تو وہاں زمین گیلی گیلی تھی یقین ہو گیا کہ اسی مقام پر آپؐ نے وضو فرمایا تھا، سر سے ٹوپی اتاری اور بڑی عظمت اور عقیدت سے اس گیلی مٹی کو اپنی ٹوپی میں رکھنا شروع کیا جب پوری مٹی اٹھالیا تو مٹی کے وہ باریک ذرّات جو وضو کے پانی سے نم شدہ تھے ایک ایک ذرّہ اپنی آنکھ کی پلک سے اٹھا اٹھا کر ٹوپی میں رکھنے لگا جب پورے ذرّات رکھ چکا اور ٹوپی بھر گئی تو نہایت ادب و احترام سے بھری ٹوپی اٹھایا اور سونگھنے لگا۔ خوشبو کچھ ایسی دل آویز تھی کہ دل و دماغ معطّر ہو گئے، عام طور پر لوگ کسی خوشبو کو مشک و عنبر سے تشبیہ دیا کرتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ "ماءِ مستعمل" ایسا رُوح پرور اور وجد آور تھا کہ اس کو دنیا کی کسی بھی خوشبو سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی "صلی اللہ علیہ وسلم"، میں نے دوبارہ ایک بھرپور اور دراز سانس لیا، لمبی سانس کا لینا ہی تھا کہ سینہ پھول گیا اور نیند بیدار ہو گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل و دماغ "باغ باغ" ہو رہے تھے وضو کیا اور سجدۂ شکر بجالایا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ اس خواب کے چند ہی دنوں بعد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا اس نواح میں تبلیغی دورہ تھا موصوف قصبہ شاملی تشریف لائے۔ یہاں سے قصبہ کیرانہ جارہے تھے بغیر کسی درخواست یا سفارش مجھکو ایک دینی طالب علم کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے لیا۔ حضرت کی اس خصوصی عنایت پر جرأت بڑھ گئی، سفر چونکہ گھوڑا گاڑی پر ہورہا تھا اثناء راہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اپنا مذکورہ خواب بیان کرنا شروع کیا حضرت موصوف پوری توجہ سے سماعت فرمارہے تھے منزل مقصود پر پہنچ کر اپنی عام مجلس میں اس خواب کے ہر ہر جزء کی ایسی برجستہ تعبیر بیان فرمائی کہ سننے والوں پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ مسلسل تین گھنٹوں تک یہی سلسلہ رہا، عجیب بات ہے کہ میرا مذکورہ خواب بھی تین گھنٹوں کا تھا ان سطور کی تحریر کے وقت ۱۹۹۲ء اگر حضرت قاری صاحبؒ باحیات ہوتے تو خود حضرت کی زبانی اس کی تعبیر نقل کی جاسکتی تھی جس کا اب امکان نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

صبر آزما دور یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا چونکہ میرا یہ دوسرا تعلیمی سفر بھی اہل خاندان کی بغیر اجازت اور بغیر مرضی ہوا تھا ظاہر ہے گھر سے مالی تعاون کا کوئی امکان نہ تھا۔

ضلع ہردوئی کے مدرسہ اشرف المدارس میں تو یہ طے کیا گیا تھا کہ ہفتہ میں ایک دن یوم جمعہ کچھ دیر کے لئے مقیم طلبہ کے کپڑوں کی ضروری سلوائی کا کام کریں اور اس کا ماہانہ معاوضہ پندرہ روپئے ملے گا جس میں ماہانہ دس روپئے طعام خرچ میں وضع کرلئے جائیں گے اور بقیہ پانچ روپئے ذیلی خرچ کیلئے دئے جائیں گے یہ یاد رہے کہ میں سلوائی کا کام جانتا تھا لیکن قصبہ شاملی کے اس مدرسہ میں ایسا کوئی نظم نہیں تھا۔ صرف قیام و طعام کا انتظام مدرسہ کی جانب سے تھا ذیلی خرچ کیلئے تعاون کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہاں ابتدائی چند ماہ سخت تنگی و عسرت

میں گزرے بعض دفعہ چار چار آنے کے لئے کئی کئی دن انتظار کرنا پڑتا تھا سوال کرنے کی نہ عادت تھی اور نہ طبیعت کو یہ گوارہ تھا، تقاضوں اور ضرورتوں کو تسلّی سے دبا لیا جاتا تھا یہاں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ بھی پڑھ لیا جائے۔

میں بچپن ہی سے سَر پر اسلامی طرز کے دراز بال رکھا کرتا تھا (جس کو زُلف کہا جاتا ہے) اور یہ سنّت مجھکو بہت پسند تھی چہرے پر نہ ڈاڑھی تھی اور نہ ڈاڑھی کی عمر، سر کے اِن بالوں کی صفائی ستھرائی کے علاوہ تیل کا استعمال بکثرت کیا کرتا تھا قصبۂ شاملی کے اس مدرسہ میں شرکت کے بعد تقریباً دو تین ماہ ایسے ہی رُوکھے سُوکھے گزر گئے تیل خریدنے کی گنجائش نہ تھی سر میں جوئیں پڑ گئیں اور بعض اوقات سَر چکرانے لگتا تھا لیکن بالوں کو اُن کی غذا فراہم کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ دوست نے مشورہ دیا کہ میاں بال منڈالو پھر کبھی رکھ لینا۔ لیکن یہ مشورہ پسند نہیں آتا تھا۔ ہمارا یہ مدرسہ قصبہ کی جامع مسجد کے احاطے میں تھا ہمارے استاذ محترم اُس کے امام وخطیب بھی تھے ہر جمعہ کو وعظ بھی فرمایا کرتے تھے اس لئے اطراف واکناف کے دیہاتی مسلمان نمازِ جمعہ ادا کرنے اور مولانا کا وعظ سننے کے لئے آیا کرتے تھے ہر جمعہ بڑا مجمع ہو جایا کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک جمعہ نماز کے بعد چند دیہاتی مسلمان ہمارے حجرے میں آئے انھیں کسی سے یہ معلوم ہوا کہ نظام حیدر آباد دکن سے دو طالب علم آئے ہیں ملاقات کرنا چاہتے ہیں ضروری خیر خیریت کے بعد چلتے وقت دس دس پیسوں کے دو سکّے ہم دونوں طالب علم کو دے گئے

دس پیسوں کا ایک سکّہ جب میرے ہاتھ میں آیا تو تیل کا مسئلہ حل ہو گیا۔ دل خوشیوں میں ڈوبنے لگا کہ بالوں کی غذا فراہم ہو گئی قریب ہی دوکان تھی جا کر اس طرح خرید کی، منشی جی کیا کھوپرے کا تیل ہے؟ منشی جی نے تیز نظر

سے دیکھا تو میں نے پھر کہا کھوپڑے کا تیل چاہیئے؟ منشی جی نے غضب آلود آواز میں کہا۔ کھوپرہ کھوپرہ کیا بکتا ہے؟ میں نے کہا بالوں کا تیل چاہیئے، کہنے لگا تو پھر سوسوں کا تیل کیوں نہیں کہتا۔ (دکنی زبان میں ناریل کو کھوپرہ کہا جاتا ہے اور میں یہی تیل خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے دس پیسے دیدیئے اور تیل لے آیا۔ کمرے میں آکر جو اسکو سونگھا تو عجیب سی بو تھی، استعمال کرنے کو طبیعت نہ چاہی آخر اس کو چراغ کی کٹوری میں ڈال دیا بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں عام طور پر بالوں کے لئے یہی تیل استعمال کیا جاتا ہے)

دوسرے یا تیسرے جمعہ وہی دیہاتی یادوست ملاقات کرنے آئے چلتے وقت چار چار آنے دے گئے اب بالوں کے بارے میں یہی فیصلہ بہتر معلوم ہوا کہ نکال دیا جائے چنانچہ حجام کو دو آنے دیکر سر صاف کر لیا گیا۔

"اے بسا آرزو خاک شدہ"

دورِ طالب علمی کا یہ بڑا ہی صبر آزما وقت تھا اللہ کی تائید و توفیق شاملِ حال نہ ہوتی تو معلوم نہیں ہم کیا فیصلہ کر بیٹھتے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ بِمَا هَدَيْتَنَا۔ کچھ عرصہ بعد مدرسہ کی جانب سے قیام و طعام کے علاوہ ماہانہ بارہ آنے جیب خرچ ملنے لگا جس میں نہانے دھونے کا صابن اور صبح کا اپنا ذاتی ناشتہ شامل تھا۔ ناشتہ تو کیا ہوتا دو چار پیسوں کی کوئی چیز کھالی جاتی تھی۔ اللہ بس باقی ہوس۔

درسی خصوصیات

قصبہ شالی کے اس ابتدائی مدرسہ میں تین سال قیام رہا جیسا کہ عرض کیا گیا ابتدائی پانچ سالہ عربی نصاب استاذ محترم کی خصوصی توجہ وعنایت سے تین سال میں تکمیل پایا، ہر روز چھ گھنٹوں میں نو کتابوں کا درس ہوا کرتا تھا۔ اور پھر بعد مغرب تا ایک تہائی رات پڑھے ہوئے درس کا اعادہ کیا جاتا تھا جس کو مدرسہ کی زبان میں "تکرار" کہا جاتا ہے۔ طلبہ کیلئے

یہ طریقہ نہایت ضروری اور مفید ثابت ہوا ہے اس لئے دینی مدارس کے طلبہ کیلئے یہ پابندی واجباتِ مدرسہ میں شمار کی جاتی ہے بحمداللہ سبق کی یہ تکرار بھی ہم دونوں طالب علم نہایت اہتمام سے پورا کیا کرتے تھے۔

استاذ محترم کا ہر روز یہ سوال ہوا کرتا کیا گزشتہ سبق کی تکرار کی گئی ؟ اور کیا آگے مطالعہ کیا گیا؟ اگر نفی میں جواب ہوتا تو نیا سبق ملتوی کر دیا جاتا یہ ہمارے لئے ایک ایسی سزا تھی جس کا برداشت کرنا بڑا بھاری تھا لیکن شاذونادر ہی ایسی کوتاہی ہو جایا کرتی تھی۔

اُستاذ محترم کی درسی خصوصیات میں امتیازی طور پر یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ وہ علم کے ساتھ عمل پر بھی توجہ دیا کرتے تھے وہ فرمایا کرتے تھے "علم برائے علم نہیں ہوتا بلکہ برائے عمل ہے" اور اس کی عملی صورت اس طرح اختیار فرماتے کہ درس میں جو بھی عملی تقاضہ ملتا اسکو روزمرہ کے عمل میں جاری کرنے کی ہدایت کرتے اور پھر اس کا اپنی آنکھوں سے بھی مشاہدہ کرنا چاہتے خصوصاً درسِ فقہ کے مسائل کو نماز، وضو، طہارت اور دیگر عبادات میں جاری کرواتے، مجھے خوب یاد ہے کہ طہارت، وضو کے درس میں وضو کے ہر ہر عمل پر سلف صالحین سے جو دُعائیں منقول ہیں ان کی تعلیم کر کے ارشاد فرمایا اپنے وضو میں ان دُعاؤں کو جاری کرو۔ جب یہ ازبر ہو جائیں تو وضو میں پڑھ کر سنایا جائے؛

دُعائیں تو یاد ہو گئیں لیکن وضو میں ہر عضو کو دھوتے ہوئے برجستہ ادا نہ ہو سکیں تو خبردار کیا کہ جب تک روانی کے ساتھ وضو میں یہ دُعائیں جاری نہ ہونگی سبق بند رہے گا۔ چنانچہ دو دن تک سبق بند رہا، آخر ہم نے وضو کا یہ امتحان دیکر درس کا آغاز کروالیا۔

یہ حضرت استاذ ہی کی برکت ہے کہ آج تک وہ دُعائیں یاد ہیں۔

اُستاذ محترم کی درسی خصوصیات کا یہ ایک نمونہ ہے، اے کاش آج کے اساتذہ کرام بھی اس اسلوب کو اپنانے ؟

میرا وطن عام طور پر دینی مدارس کے طلبہ کو ہر سال دو ماہ (شعبان، رمضان) کی چھٹی ملا کرتی ہے۔ ان چھٹیوں میں طلبہ اپنے اپنے وطن چلے جایا کرتے ہیں پھر ماہِ شوال میں واپس ہو جاتے ہیں۔ لیکن میرا وطن تو مدرسہ تھا مسلسل تین سال اسی وطن میں گزرے یہ میری خوش بختی تھی کہ شفیق استاذ نے ان چھٹیوں میں بھی تدریسی سلسلہ جاری رکھا اور جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو مسجد میں اعتکاف کیلئے بٹھا دیا جاتا اس طرح دورِ طالب علمی میں دو اعتکاف نصیب ہو گئے۔

اَللّٰھُمَّ اغفر لہٗ وارحمہٗ ونوّر قبرہٗ واکرم نزلہ ووسعّ مدخلہ۔ آمین

خدمتِ بزرگاں عام طور پر استاذ کی خدمت سے جی چرایا جاتا ہے لیکن میرا مزاج اس سے بالکل مختلف تھا میں استاذ کی خدمت کا متلاشی رہا کرتا تھا، استاذ کے کپڑے دھونا، پیر دبانا، سر کی مالش کرنا تو روزمرّہ کا معمول تھا اسی پر بس نہیں بلکہ جب بھی کوئی مدرسہ میں مہمان ہوتے تو ان کی خدمت بھی اسی ذوق و شوق سے انجام دیا کرتا تھا۔

قصبہ شاملی پر ریلوے اسٹیشن بھی تھا اطراف واکناف کے دیہات میں دینی مدارس بکثرت تھے۔ اطراف کے اکثر مسلمان دیندار، علم دوست تھے۔ وعظ و نصیحت کے لئے اکابر ملّت کو دعوت دیا کرتے تھے اس لئے لازمی طور پر ایسے مہمان علماء کا گذر قصبہ شاملی سے ہوا کرتا تھا دو چار گھنٹے آرام کیلئے جامع مسجد کے مدرسہ میں ضرور قیام فرمایا کرتے تھے ہمارے استاذ محترم اس کا انتظام فرماتے اس طرح بہت سے اکابرین کی خدمت کا موقعہ ملا کرتا تھا، شاید

ہی کوئی بزرگ ادھر سے گزرے ہوں اور میں نے ان کی خدمت نہ کی ہو۔ البتہ بعض مہمان علمِ دین کے طلبہ سے خدمت لینا پسند نہیں کرتے تھے اور جب پہل کی جاتی تو ارشاد فرماتے بچو تم تو مہمانِ رسول ہو ہم کو خود تمہاری خدمت کرنی چاہیئے نہ کہ تم ہماری خدمت کرو ؟

اس جواب پر ہمارے بعض ساتھی تو خاموش ہو جاتے لیکن مجھ سے خاموش رہا نہیں جاتا تھا کچھ نہ کچھ عرض معروض کر کے خدمت کر ہی ڈالتا۔ ایک دفعہ ایک بزرگ کو اس طرح مؤدبانہ جواب دیا حضرت بیشک ہم تو مہمان رسول ہیں لیکن آپ مہمانانِ رسول کے مہمان ہیں لہذا ہم کو بھی خدمت کرنے کا حق ملنا چاہیئے ؟

ہنس کر فرمایا آپ کا جواب لاجواب ہے۔

مالش والا

دراصل بزرگوں کی خدمت کرنے کا فطری شوق تھا چنانچہ ماہانہ آمدنی سے بچت کر کے تیل کی ایک شیشی خرید لی تھی اور اس کو بڑی حفاظت سے رکھا کرتا تھا جب بھی کوئی بزرگ تشریف لاتے اور کھانے پینے سے فارغ ہو کر جب وہ بیٹھ جاتے تو میں تیل کی شیشی لے کر حاضر ہو جاتا اور بے تکلف عرض کر دیتا حضرت اجازت دیں سر کی مالش بہت عمدہ طریقے سے کرنا جانتا ہوں ؟ یہ عنوان میں نے تجربوں کے بعد سیکھا تھا۔ کیسے ہی مزاج کے بزرگ ہوں سر کی مالش سے کیا عذر کر سکتے کم از کم خاموش ہی ہو جاتے اور بس اپنا کام کر جاتا۔

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ جب سر کی مالش کرنے لگتا تو آناً فاناً محوِ خواب ہو جاتے اور بس کامیاب ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک خاص واقعہ قابلِ ذکر ہے سن غالباً ۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء کا تھا معلوم ہوا کہ ضلع ہردوئی سے حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہ

قصبہ تھانہ بھون تشریف لائے ہیں۔ میں اور میرے ساتھی سید حسین صاحب استاذ محترم سے اجازت لے کر تھانہ بھون پہنچے رات خانقاہ میں گذارنا طے کیا حضرت سے ملاقات ہوئی نہایت محبت و شفقت کا معاملہ فرمایا اور ہدایات و نصائح سے سرفراز کیا۔ موسم گرمیوں کا تھا رات کو خانقاہ کی چھت پر استراحت کا انتظام کیا گیا۔ ہم نے بھی اپنے بستر ایک جانب لگا لئے۔ جب حضرت اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ مالش والا تیل کی شیشی لے کر پہنچ گیا۔ عرض و معروض کرنے کی نوبت ہی نہ آئی حضرت سمجھ گئے فرمایا اچھا مالش کر دیجئے میں نے اپنا کام شروع کر دیا میرے ساتھی پیر دبانے بیٹھ گئے۔ حضرت اپنی عادت کے مطابق ارشادات فرما رہے تھے اور ہاتھ میں تسبیح بھی تھی کچھ زیادہ دیر بھی نہ گزری کہ آپ خاموش ہو گئے غالبًا نیند آ گئی اور یقینًا ایسے ہی تھا لیکن ہاتھ کی تسبیح برابر چل رہی تھی جس سے شبہ ہونے لگا کہ آپ بیدار ہیں۔ مزید آدھا پون گھنٹہ ایسے ہی گزر گیا میرے ساتھی نے اشارۃً کہا کہ اب تو حضرت سو گئے ہیں چلو ہم بھی سو جائیں؟

لیکن میں نے تسبیح کی جانب اشارہ کیا وہ تو معمول کے مطابق چل رہی ہے کچھ دیر اور خدمت کی گئی پھر بھی یہی صورت رہی حضرت مولانا محوِ خواب ہیں لیکن تسبیح جاری ہے میرے ساتھی تو اٹھ گئے اور اپنے بستر پر جا لیٹے لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ جب تک مولانا بس نہ فرما دیں اپنا کام جاری رکھوں گا۔ چنانچہ اپنی ماہرانہ مالش اور تیز کر دی رات کے گیارہ تو بج ہی چکے تھے۔ بارہ، ایک، ڈیڑھ پر گھڑی کے گھنٹے سنتا گیا حضرت مولانا محوِ خواب تھے۔ لیکن ہاتھ کی تسبیح برابر چل رہی تھی یہ عجیب و غریب صورتِ حال تھی میں نے دل میں کہا کہ چلو اذانِ فجر بھی قریب ہے اپنا کام جاری رہے۔ ڈیڑھ دو بجے کے درمیان حضرت مولانا

بیدار ہوئے دریافت فرمایا کیا وقت ہے ؟ میں نے کہا بس دو بجنے ہی والے ہیں۔ فرمایا ارے تو کیا آپ ابھی تک مالش کر رہے ہیں ؟

میں نے عرض کیا حضرت آپ تو غالبًا بیدار ہی تھے ؟ فرمایا نہیں نہیں مجھے یاد بھی نہیں کہ کب نیند آگئی اچھا جاؤ آرام کرو فجزاکم اللہ۔

پھر حضرت تہجد کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اپنا طالب علمانہ مزاج تھا صبح ناشتے پر ہی حضرت سے "سیرِ تسبیح" کا تذکرہ کر ہی دیا۔

بے ساختہ فرمایا ہم کو اس کی بھی خبر نہیں۔

اللہ اکبر! تواضع اور اخلاص کی بھی کوئی حد ہے۔

اگر یہی واقعہ آج کے روایتی خاندانی مشائخ کے یہاں پیش آتا تو معلوم نہیں عرش و فرش کے تانے بانے کہاں سے کہاں چلے جاتے۔

اُولٰٓئِكَ اٰبَآئِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ
اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

(یہ ہمارے اسلاف ہیں جن کی نظیر کسی بھی وقت پیش تو کرو)

پھر حضرت مولانا نے سیرِ تسبیح کی کوئی تاویل بھی نہیں فرمائی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی ہم بھی خاموش ہو گئے۔

خوانِ نعمت

شمالی ہند (یو،پی) کے عام مسلمانوں کا دینی اور اسلامی مزاج تھا یہاں مدارس اور مساجد کی کثرت ہے۔ ہندوستان کے اس شمالی منطقہ میں اہلِ علم حضرات کی بے پایاں خدمات ہیں۔ اس ملک میں اسلام کی بقا اور اس کا استحکام انہی مدارسِ دینیہ کا فیض سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے بیرونِ ہند کے اسلامی ممالک

خالی نظر آتے ہیں۔ اِلَّامَاشَآءَ اللّٰہُ ۔

یہاں دینی مدارس کی خدمت کو بڑی سعادت اور عزّت سمجھا جاتا ہے قصبہ شاملی کے اس چھوٹے سے مدرسے کو اہل محلّہ بڑی عزّت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے اس مدرسہ میں دارالاقامہ (بورڈنگ) قسم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ دیہات کے عام مدارس کی طرح اس مدرسہ کا نظم ونسق اہل محلّہ کے خصوصی تعاون پر چلا کرتا تھا۔ اہل محلہ مدرسہ کے طلبہ کا دوؔ وقتی طعام اپنے ذمّے لے لیا کرتے ہیں اور اس کی صورت یہ تھی کہ محلّے کے ساتؔ گھر ایک طالب علم کے لئے مقرر کردے جاتے ہیں۔ طالب علم ہر روز ایک گھر میں صبح وشام کا طعام تناول کر لیا کرتا ہے یہ ایک ایسا مفید اور ایثاری نظام ہے جس سے سینکڑوں طلبہ مستفید ہوا کرتے ہیں، ہفتے میں صرف ایک دن ایک طالب علم کے لئے دوؔ وقتی طعام کا انتظام کردینا کسی بھی حیثیت والے کو بھاری نہ تھا۔

بہرحال حیدرآباد کے یہ دوؔ طالب علم جب داخلِ مدرسہ ہوئے تو معمول کے مطابق ہرایک کے لئے ساتؔ ساتؔ گھر مقرر کردئے گئے کہ ہر روز ایک ایک مکان میں تناول طعام ہوگا۔ نووارد طالب علم کے لئے یہ ایک ایسا غیر مانوس اجنبی عمل تھا جس کے تصوّر سے وحشت سی محسوس ہونے لگی۔ لیکن کیا کرتے؟ تحصیل علم کی منزل کچھ اس سے اعلیٰ وارفع حیثیت والی تھی ہفتے کے یہ ساتؔ تلخ گھونٹ برداشت کر لئے گئے۔ لیکن بہت جلد معلوم ہوگیا کہ جس اخلاص واکرام سے طالب علم کو کھلایا پلایا جاتا ہے وہ کسی دربارِ شاہی مہمانوں کو بھی نصیب نہ ہوگا۔

بڑا لطف آتا تھا ہر روز نیا گھر، نیا اکرام، نیا طعام، گویا خوانِ نعمت ہے جو ہر روز آسمان سے اُتر رہا ہے، اور بعض مخلصین ایسے بھی تھے کہ ایک دن

پہلے پوچھ لیا کرتے تھے کہ آپ کل کیا کھائیں گے؛ پھر اسی کا انتظام کر دیا کرتے۔ ہفتے کے سات گھروں میں کم از کم دو کرم فرما اس قسم کے ضرور رہے ہیں۔ اُستاذ محترم بھی وقتاً فوقتاً ان کرم فرماؤں کا جائزہ بھی لے لیا کرتے تھے، ایک مخلص میزبان نے ایسے ایک موقعہ پر مؤدبانہ عرض کر ہی دیا۔

"حضرت اِن طالب علموں کے طفیل میں ہفتے میں یکبار ہمارے گھر کے بچّوں کو بھی اچھا کھانا مل جاتا ہے۔ یہ طالب علم ہمارے گھروں کی برکت ہیں۔"

اللہ اللہ کیسے مخلص انسان تھے۔ فَجَزَاهُمُ اللهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ

بہر حال قصبہ شاملی کے اس ابتدائی مدرسہ میں ہمارے خورونوش کا یہ خوانِ نعمت تھا فراغتِ علم کے تقریباً تیس سال بعد اسی قصبہ میں جانا ہوا۔ استاذ محترم سے ملاقات کا شرف پایا خصوصی دعاؤں سے سرفراز ہوا قصبہ کے بعض میزبانوں کے گھر بھی گیا سوائے ایک نجار خاندان کی بوڑھیا اور کسی کو نہ پایا سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، اس بوڑھی خاتون نے خوب پہچان لیا لیکن وہ بینائی سے معذور ہو چکی تھی، کچھ دعائیں لے کر اور کچھ دیگر واپس لوٹا۔ استاذ محترم بھی ضعیف ہو چکے تھے۔ خیر خیریت کے بعد اپنی تالیفی مشغولیت کا تذکرہ کیا بیحد مسرور ہوتے۔ آنکھوں میں خوشی اور مسرت کی چمک پیدا ہوئی "کتاب "ہدایت کے چراغ" کا مسوّدہ مکمل ہو چکا تھا۔ تفصیلات بیان کیں اور یہ بھی اطلاع دی کہ دہلی کے ربّانی بک ڈپو والوں کے حوالہ کر آیا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو جائے گی۔ انشاء اللہ آئندہ سال حاضرِ خدمت ہوں گا اور کتاب کا پہلا ہدیہ جناب والا ہی کی نذر ہو گا۔ (یہ خیال تک نہ آیا کہ آئندہ سال ملاقات نصیب نہ ہو گی)، بیحد مسرور ہوئے کسی بھی استاذ کی خوشی و

مسرت کی اس وقت کوئی حد نہیں ہوتی جب اس کا کوئی شاگرد عالم اور مصنّف بن کر سامنے آئے وہ اپنی محنت کا ثمرہ آنکھوں سے دیکھکر باغ باغ ہو جاتا ہے، ایسی ہی کچھ کیفیت استاذ محترم کی رہی بہت ساری دعائیں دیں۔ میں نے مؤدبانہ طریقے سے کچھ نذرانہ حضرتِ استاذ اور کچھ اماں جی صاحبہ کے نام نامی پیش کیا، فرمایا تمہارا ہدیہ تو کتاب ہی ہوگی یہ رہنے دو۔

میں نے عرض معروض کی کہ حضرت عرصہ دراز کے بعد حاضری کی سعادت ملی ہے فی الحال یہ حقیر نذرانہ قبول فرمالیں؟ آپ نے قبول فرمالیا اور دُعا دی۔

بہر حال تقدیر الٰہی کا فیصلہ نافذ ہو چکا تھا سال گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۷ر فروری ۱۹۸۷ء کو دار دنیا سے کوچ کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَکْرِمْ نُزُلَہٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَہٗ۔

اب انشاء اللہ آخرت ہی میں کتاب "ہدایت کے چراغ" کا نذرانہ پیش ہوگا۔

ایک نووارد عالم

الغرض یہ ایک ضمنی بات آگئی میں قصبہ شاملی کا ذکر کر رہا تھا قصبہ کے اس چھوٹے مدرسہ میں جس کے صرف دو حیدر آبادی طالب علم تھے بڑے ذوق و شوق سے اپنی تعلیمی سرگرمی میں مشغول رہا کرتے تھے جیسا کہ گزشتہ اوراق میں لکھا گیا ہے کہ ہر روز اپنے پڑھے ہوئے درس کا دوبارہ اعادہ کیا جاتا تھا جس کو مدرسہ کی زبان میں "تکرار" کہا جاتا ہے ایسے ہی ایک موقعہ پر جامع مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے تکرار کا سلسلہ جاری تھا ایک نوجوان عالم جو اپنی وضع قطع میں امیر کبیر معلوم ہو رہے تھے اچانک تشریف لائے اور ہماری تکرار سننے لگے جب ہم فارغ ہو گئے تو دعا و سلام کے بعد ہمارا تعارف حاصل کیا اور ہماری بڑی ہمت افزائی کی۔

جامع مسجد کی پیشانی پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کا خوبصورت کتبہ چسپاں تھا اس کی جانب اشارہ کرکے ہم سے ایک سوال کیا۔

بچّو! آج کے دور میں اگر کوئی شخص اپنی خدائی کا دعویٰ کرے کہ میں ربّ العٰلمین ہوں

دوسرا اپنی رسالت کا دعویٰ کرے کہ میں اللہ کا نبی و رسول ہوں

بھلا بتاؤ تو ان دونوں میں کس کا فتنہ شدید تر ہوگا؟

یہ سوال ہمارے لئے بالکل نیا تھا اور نہ اس پر غور کرنے کا کبھی اتفاق ہوا تھا علاوہ ازیں یہ ہمارے ابتدائی دورِ تعلیمی کا زمانہ بھی تھا، ابھی نظر و فکر بھی تو پختہ نہ تھی۔ اس سوال پر ہم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس پر ذرا بلند آواز سے پوچھا کیا تم اتنی بات سمجھ نہیں پاتے؟ پھر سوال دُہرایا، میں نے ہمّت کرکے جواب دیا، حضرت ظاہر ہے جو شخص خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اس کا فتنہ شدید تر ہوگا۔ میرے ساتھی نے بھی ایسے ہی کہا!

فرمایا ایسا نہیں بلکہ جو رسالت و نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے اس کا فتنہ شدید تر ہوگا۔ پھر اس کی تشریح کی کہ دیکھو جو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اس کو تو صرف ایک منٹ میں چت کیا جا سکتا ہے وہ اس طرح کہ اس سے پوچھا جائے ٹھیک ہے جب تو خدا ہے تو اس مُردے کو زندہ کردے؟ یا دن کو رات بنادے؟ یا سورج کو مغرب سے طلوع کر؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے دس مطالبے کرکے اسکو توبہ کرنے پر مجبور کردیا جائے گا یا وہ سوائے اُٹھ بھاگنے اور کوئی راہ نہ پائے گا۔

لیکن جو نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے وہ دلیل اور حجّت کے دلدل میں خود بھی پھنسا ہے اور دوسروں کو بھی پھنسا دینے کے چکّر میں رہتا ہے اور کسی بھی

بات کو تسلیم کرنے تیار نہیں ہوتا اس سے بھولے بھالے مسلمان شک و شبہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں اس طرح اس کا فتنہ شدید ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں خدائی کے دعوے دار نظر نہیں آتے۔ لیکن نبوت و رسالت کا دعویٰ کرنے والے بکثرت رہے ہیں۔ بات معقول تھی ہم نے تسلیم کرلیا اور مولوی صاحب تشریف لے گئے۔

دو تازہ مثالیں

ماضی قریب میں لاہور (پاکستان) کے غلام احمد قادیانی اور حیدر آباد دکن (انڈیا) کے محمد صدیق دیندار جن کا اپنا خانہ زاد لقب (چَنْ بِشْ وِشْ وَرْ) تھا زندہ مثالیں ہیں دونوں نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان ان کا کلمہ پڑھکر اسلام سے خارج ہوگئے ہیں۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے نظام دکن دور آصفجاہی کا آخری زمانہ تھا مؤخر الذکر چنْ بشْ وِشْ وَرْ کبھی کبھی ہمارے محلّے عنبر پیٹ کی جامع مسجد میں نماز کیلئے آجایا کرتے تھے، غالبًا میری عمر اُس وقت آٹھ دس سال ہوگی میں ہر روز اس مسجد میں نماز کیلئے آیا کرتا تھا۔ مسجد کی خدمت کا بھی شوق تھا کبھی صفائی کردیتا۔ کبھی وضو کے لوٹے پانی سے بھر کر رکھدیا کرتا۔ موقع ملتا تو اذان بھی پڑھ دیتا۔ میرے اس ذوق و شوق کو وہ دیکھا کرتے تھے ایک دن بڑی محبت و پیار سے مجھکو اپنے ساتھ چلنے اور پڑھنے پڑھانے کی ترغیب دی اور یہ بھی کہا کہ ہم تم کو بہت بڑا عالم بنادیں گے، اگر تم راضی ہو تو تمہارے والدین سے اجازت لے کر ہیں خود تم کو اپنے ساتھ رکھوں گا وغیرہ وغیرہ۔

ترغیبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی جواب پوری طرح یاد نہیں، اب غور کرتا ہوں تو سوائے اس کے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ عظیم کی مرضی اور

مشیت اس کے خلاف تھی ورنہ ترغیبات کچھ اس قسم کی نہیں کہ ایک کمسن کو اس دلدل میں کود پڑنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اَلحَمدُ للہ الذی ھَدَانا لِھٰذا وَمَا کنّا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

الغرض جامع مسجد قصبہ شاملی کا وہ واقعہ ذکر کر رہا تھا جس کے صحن میں بیٹھکر ہم سبق کا تکرار کر رہے تھے اور وہ نووارد عالم صاحب ہم سے دعویٰ الوہیت اور دعویٰ نبوّت کا فرق بیان کر رہے تھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب مولانا ارشاد احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے مبلّغ اور نمائندہ تھے جو بعد میں رئیس المبلّغین کے عہدے پر فائز ہوئے اور جو ہندوستان میں باطل و گمراہ فرقوں سے بحث و مباحثہ اور ان کے فتنوں سے مسلمانوں کو بچانے میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ عجیب تر بات ہے کہ راقم الحروف جب علم دین کی تحصیل سے فارغ ہوا اور اپنے وطن شہر حیدرآباد دکن میں اپنی علمی و تبلیغی خدمات کا آغاز کیا اور یہ ۱۹۶۰ء کے بعد کا زمانہ ہے تو ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ شہر میں شرک و بدعات کی تردید اور توحید و سنّت کی ایک مستحکم تحریک کا افتتاح کیا گیا تو انہی رئیس المبلّغین کے ہاتھوں اس کا "افتتاح" عمل میں آیا تفصیلات آئندہ اوراق میں آرہی ہیں۔

چون و چرا

تحصیل علم کا ابتدائی دور بڑا اہم اور اساسی حیثیت رکھتا ہے آئندہ کی تعمیر اسی بنیاد پر قائم و دائم رہی ہے جن طلبہ کی ابتدائی تعلیم غیر مستحکم ہوتی ہے وہ ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ ان میں جرأت بے خوفی، حاضر جوابی، حقیقت شناسی کا فقدان رہا ہے۔ استاذ محترم نے ہمیں ایک اہم نکتہ تفہیم کیا تھا فرمایا کرتے تھے۔ (فارسی زبان کا مشہور مقولہ ہے۔)

"مرید یکے چوں و چرا می کند و شاگرد یکے چوں و چرا نمی کند۔
"ہر دو را چراگاہ باید فرستاد"

جو مُرید کہ اپنے شیخ و مرشد کی تعلیمات میں چوں و چرا کرے (ایسا کیوں ایسا کیوں نہیں ؟) اور جو شاگرد کہ اپنے استاذ سے چوں و چرا کرے یہ ہر دو جانور ہیں انھیں چراگاہ (جنگل) بھیج دیا جانا چاہیئے۔

مطلب یہ کہ پیری و مریدی کا رشتہ صرف اطاعت و انقیاد کا ہوتا ہے اس میں اپنے شیخ سے کیوں اور کیسے پوچھنا خلاف معاہدہ ہے اور شاگرد کا رشتہ چونکہ بحث و مباحثہ کا ہے اس میں غور و فکر کے علاوہ تحقیق اور تدقیق پسندیدہ عمل ہیں اس لئے شاگرد کو سوال کرنا ضروری ہے ورنہ علم کی منزلیں طے نہ ہونگی۔ اگر دونوں اپنے اپنے منصب کا حق ادا نہ کریں تو وہ جانور صفت ہیں انسانی زندگی سے اِنھیں دور ہو جانا چاہیئے۔

معلوم نہیں یہ کس دانا حکیم کا قول ہے بہرحال بات پُر حقیقت ہے طالبعلم کے مزاج میں اگر تحقیق اور جستجو نہ ہو تو ظاہر ہے وہ دین کی حکمتوں اور اس کی مصلحتوں سے بے نصیب رہے گا۔ استاذِ محترم نے ہمیں اسی راہ نما اصول پر تربیت فرمائی۔

ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ علم الفقہ کی مشہور کتاب " قدوری " کے درس میں دو چار مقامات پر استاذِ محترم سے چون و چرا کر ہی دیا، اب پوری طرح وہ مقامات یاد نہیں ہیں۔ البتہ یہ خوب یاد ہے کہ اس کے کچھ عرصہ بعد دارالعلوم دیوبند کے شیخ الادب و الفقہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ جو ہمارے استاذِ محترم کے استاذِ محترم ہیں قصبہ شاملی کے نواح تشریف لائے واپسی پر ہمارے مدرسہ میں قیام فرمایا لیکن وقت بہت مختصر تھا اور پھر عوام الناس کا ہجوم بھی بہت تھا استاذِ محترم نے حضرت شیخ الادب سے " قدوری " کے وہ مقامات جہاں میں نے چوں و چرا کی تھی تحقیق کر لینے کے بعد ارشاد فرمایا۔ میں کتاب لے کر حاضر ہوا لیکن پوچھنے کا موقعہ نہ

حل سکا۔ حضرت شیخ الادب آگے سفر کیلئے بس اسٹینڈ پہنچ گئے۔ یہاں اہل قصبہ کا اور زیادہ ہجوم ہو گیا کسی طرح قریب ہو کر اپنے شکوک وشبہات بیان کرنے لگا جیسا کہ میں نے کہا ہے وقت بہت تنگ تھا گاڑی کو روانہ ہونے میں صرف چند ہی منٹ باقی تھے اچانک استاذِ محترم خود آگے بڑھے اور میرے ہاتھ سے کتاب لیکر حضرت شیخ الادب سے اُن مقامات کو حل کر لیا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

استاذِ محترم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ کتاب کا کوئی مسئلہ تشنہ نہ چھوڑا، حضرت شیخ الادب کی واپسی کے بعد دوسرے دن درسگاہ میں ان مقامات کی تفہیم وتشریح کر دی۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ قَبْرَہٗ۔

آج کے اساتذہ کرام کے لئے استاذِ محترم کا یہ عمل "اسوۂ حسنہ" کی حیثیت رکھتا ہے، علم کا کتمان یا اس کی نا تمام وضاحت جہاں خود کیلئے علمی خیانت ہے وہاں طلبہ کے علمی نشوونما میں مضر اثرات بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ عَلِّمْنَا الْکِتَابَ وَفَقِّھْنَا فِی الدِّیْنِ۔

میری ابتدائی تعلیم انہی اصول پر نہایت مستحکم تھی استاذ محترم تفہیم وتشریح میں جب تک مطمئن نہ ہو جاتے اپنی تقریر جاری رکھتے اور پھر کبھی کبھی اثنائے تقریر دریافت بھی کرتے "کیا سمجھے ہو"؟ یہ سوال ہم پر بڑا بھاری پڑتا تھا۔ ادائے جواب میں ذرا بھی جھول محسوس کرتے تو غضبناک ہو جاتے۔

جورِ استاذ بہ ز مہرِ پدر

استاذ کا غضب ماں باپ کے پیار و محبت سے کہیں بہتر ہے۔

اَللّٰھُمَّ بَرِّدْ مَضْجَعَہٗ۔

میرا تیسرا تعلیمی سفر

قصبہ شاملی کے ابتدائی مدرسہ کے پانچ سالہ نصاب کی تکمیل کے بعد والدین سے ملاقات کیلئے وطن آیا۔ کایا پلٹ چکی تھی وہ جس کو سلیقے سے بات تک کرنا نہ آتا تھا سراپا وعظ وارشاد تھا گھر کے انگریزی ماحول میں اسلامی تہذیب وتمدن کا چلتا پھرتا نمونہ دیکھکر والدین کا دل باغ باغ ہوا جاتا تھا ۲ دو ماہ کی چھٹی گزار کر بغیر کسی گزارش شفارش اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کیلئے روانہ کر دینا طے کر دیا گیا۔

خدائی فیصلے اس طرح غالب ہوا کرتے ہیں وہ جس کو کل پولیس کی نگرانی میں پردیس سے دیس لایا گیا تھا آج والدین اور عزیز واقارب کی الوداعی تقریب میں حیدرآباد سے دہلی روانہ کر دیا گیا۔

حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر اہل خاندان کا ہجوم اپنی زندگی کا پہلا منظر تھا جو خاندان کے پہلے دینی طالب علم کو الوداع کرنے جمع ہو گیا تھا، سب کی آنکھوں میں خوشی ومسرت کے آنسو اُبھر آرہے تھے اور والدین کا دل باغ باغ ہو رہا تھا کہ زندگی ہی میں "صدقۂ جاریہ" کا سامان پیدا ہو رہا ہے۔

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۔

میرا یہ تیسرا تعلیمی سفر تھا جو اعلیٰ تعلیم کیلئے خوشگوار اور پرسکون حالات میں ہو رہا تھا۔ دہلی پہلی منزل تھی جہاں سے ضلع سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم میں داخل ہونا تھا۔

اگرچہ (یو۔پی) میں اور بھی مشہور زمانہ مدارس تھے لیکن میرے مستقبل نے یہ ثابت کر دیا کہ استاذِ محترم مولانا محمد اسلام صاحبؒ کا یہ الہامی انتخاب تھا مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) اور دار العلوم (دیوبند) اگرچہ تاسیسی لحاظ سے ہم عمر اور ہم کردار ادارے ہیں لیکن دونوں مدرسوں کا ماحول مختلف رہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند اپنے آغاز کے بعد اسلامی سیاست کا مرکز بھی رہا ہے جہاں قرآن وحدیث کی ضیا پاشیوں کے علاوہ سیاست کا زور وشور بھی کامیابی سے شانہ بشانہ چلا ہے اور جہاں تاریخ ہند کی سب سے بڑی جنگ "جنگ آزادی" کے قائد ورہنما پیدا ہوئے ہیں اور جن کی اپنی آپسی حکمتِ عملی اور ذہنی وفکری اجتہاد نے برِعظیم پر ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کو جنم دیدیا۔ ایک جانب شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ تھے تو دوسری جانب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اللہ ان ہر دو کو اعلیٰ علیین میں عزت دے۔ آمین۔

مدرسہ مظاہر علوم (سہارن پور) کا طبعی مزاج گوشہ نشینی، خاموش خدمتِ علمی اور یکسوئی کی جانب مائل تھا یہاں نہ جلسے جلوس نہ استقبالات اور نہ ہی وفود و شاہی مہمانوں کی آمد ورفت، گویا ایک شہر خموشاں تھا، اسی شہر خموشاں کے دُرِّ یتیم محدث کبیر مولانا خلیل احمد صاحبؒ، شارحِ ابوداؤد اور صوفی صافی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ مزاج مظاہر علوم کے شاہدِ عدل ہیں۔

آپ کے اس خادم کا مزاج بھی کچھ ایسے ہی گوشہ نشینی اور پُرسکونی قسم کا تھا مدرسہ مظاہر علوم کا یہ ماحول میرے لئے طَابَقَ النَّعْلُ بِالنَّعْلِ ثابت ہوا۔ اللہ استاذِ مرحوم کو اعلیٰ علیین نصیب کرے بڑا ہی مناسب اور موافقِ طبع انتخاب فرمایا۔ ماحول کی یکسوئی، اساتذہ کرام کی یکجہتی اور اپنی طبیعت کی گوشہ نشینی، یہ کچھ ایسے اسباب تھے جس نے تحصیلِ علم کی منزل کو بہت ہی قریب کردیا۔

مدرسہ مظاہر علوم ماہِ شوال ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (یو، پی) آیا اور بحمد للہ شعبان ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۶ء تحصیل علم سے فراغت حاصل کی یہ چند سال میری حیاتِ دنیا کا وہ قیمتی سرمایہ ہیں جس نے مستقبل میں خدمتِ دین واسلام کیلئے سب کچھ مہیا کردیا۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ط

میرا یہ تعلیمی دَور اکابرِ ملّت کا آخری دور سمجھا جاتا تھا اس وقت برصغیر ہندو پاک کے نامی گرامی علماء میں چند ایک ہی باقی رہ گئے تھے اور جن کی ذوات نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے باقیات الصالحات کی حیثیت اختیار کرلی تھی، یہ حضرات علم و عمل و تقویٰ و طہارت کے روشن مینار تھے جن سے اسلام و ایمان کی شعاعیں اقصائے عالم تک پہنچ رہی تھیں ۔

(۱) شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ (۲) شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ (۳) مفتیٔ اعظم مولانا کفایت اللہ صاحبؒ (۴) شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ (۵) شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ (۶) شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس صاحبؒ کاندھلویؒ (۷) مفتی اعظم مولانا سعید احمد صاحبؒ (مظاہر علوم) (۸) استاذ الاساتذہ مولانا عبداللطیف صاحبؒ (مظاہر علوم) (۹) مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع صاحبؒ (پاکستان)، (۱۰) مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ الہ آبادی۔ (۱۱) مولانا محمد حسن صاحب امرتسریؒ (۱۲) امیر جماعت تبلیغی مولانا محمد یوسف صاحبؒ (۱۳) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ (۱۴) فخر الاسلام حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ (۱۵) حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند (۱۶) حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہ، اجلال آباد یو، پی، (۱۷) حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہ (ہردوئی) یو، پی)

اِن سطور کی تحریر ۱۹۹۲ء تک مؤخر الذکر دونوں بزرگوں کا شمار اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی سمجھی جاتی ہے اب یہ اسی بزم اکابر کی آخری یادگار ہیں۔ اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِطُوْلِ بَقَآءِهِمْ " ہندو پاک کا کوئی مدرسہ کوئی ادارہ اور دینی و اسلامی تحریک

ایسی نہیں جس میں ان حضرات کے فیض یافتہ کا واسطہ یا بلا واسطہ عمل دخل نہ رہا ہو۔ فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ ؀

ان اکابر ملت میں بعض میرے اساتذہ بھی ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مناصب سے سرفراز کرے۔ آمین۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کا طبعی اور اساسی مزاج خاموشی خدمت تھا۔ اس وجہ سے اس پُرسکون ماحول میں تحصیل علم کیلئے بہت بڑا میدان ہاتھ آیا، ماحول کی اس پُرسکونی کے علاوہ اساتذہ کرام کی خصوصی عنایات و توجہ اور منتظمین مدرسہ کا پاس و لحاظ نے حصولِ علم کو مزید آسان بنا دیا، علمی ذوق و شوق تو بحمد للہ طبعًا نصیب تھا، طلب و جستجو، تحقیق و تدقیق، بحث و مناظرہ اور سب سے اہم اوقات کی قدردانی نے دُنیا و مافیہا سے بہت حد تک دُور کر دیا، مہینوں گزر جاتے۔ سیر و تفریح تو درکنار بازاروں کی گشت بھی نہ ہونے پاتی،

اس مدرسہ میں میرے رفیق مولوی عبد العزیز صاحب حیدرآبادی بھی ساتھ تھے یہ مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی (یو،پی) کے ذہین و فہیم طالب علم سمجھے جاتے تھے اعلیٰ تعلیم کے لئے یہ بھی مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور روانہ کئے گئے اس طرح ایک حقیقی طالب علم کی رفاقت بھی نصیب رہی)۔

ناظم مدرسہ مولانا عبد اللطیف صاحبؒ نے بغیر کسی سفارش و گذارش ہم دونوں کیلئے مدرسہ کے دارالاقامہ میں ایک مستقل حجرہ مختص کر دیا جو دیگر طلبہ کے لئے باعثِ رشک اور قابلِ اعتراض بھی قرار پایا۔ دارالاقامہ (بورڈنگ) کے قواعد و ضوابط کے تحت عام طور پر ایک حجرے میں کم از کم پانچ سات طلبہ کو جگہ دی جایا کرتی تھی، بعض بنگالی طلبہ نے ہماری اس خصوصیت پر ناظمِ مدرسہ سے شکایت کی

لیکن ناظمِ مدرسہ نے سب کو یہ کہکر خاموش کردیا کہ مدرسہ میں طلبہ کو حسبِ مراتب جگہ دی جاتی ہے کسی کو اعتراض کی اجازت نہیں۔
لیکن کچھ ہی عرصہ بعد یہی طلبہ نے ہمارے اس اختصاص کو تسلیم کرلیا۔ ہماری بود و باش، رفتار گفتار، اخلاق و کردار، لیل و نہار دیگر طلبہ سے بالکل مختلف تھے نہ ہماری کوئی سوسائٹی تھی نہ دوست و احباب کا جمگھٹا، حجرے میں ہوتے تو صرف دونوں، باہر نکلتے تو صرف دونوں، دوڑ کا میدان تھا تو صرف درسگاہ۔ اس طرح عام طلبہ میں خصوصی نظروں سے دیکھے جانے لگے، علاوہ ازیں میرے ساتھ مولوی عبدالعزیز صاحب اسباق کی تکرار (جس کا تذکرہ گذشتہ اوراق میں آچکا ہے) میں ایک خصوصی شان رکھتے تھے، استاذ کی تقریر و تفہیم کو من وعن نقل کردیا کرتے تھے۔ جس سے دن کے اسباق کا رات میں اعادہ ہوجایا کرتا تھا، تکرار کی اس مجلس میں طلبہ کی کثیر تعداد شریک ہوا کرتی تھی چند ہی ہفتوں میں ہماری یہ مجلسِ تکرار مستقل درسگاہ کی حیثیت اختیار کرلی۔ رات دیر گئے یہ سلسلہ جاری رہتا تھا اور طلبہ ذوق و شوق سے شریک ہوا کرتے تھے۔
ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ہم عصر طلبہ ہم کو عزت و اکرام کی نظروں سے دیکھنے لگے اور ہماری تکرار والی خدمت کو اپنے لئے ایک نعمت اور فضلِ الٰہی محسوس کرنے لگے۔
اساتذہ کرام بھی درسگاہ میں ہم کو پہلی صف میں جگہ دیا کرتے تھے اس طرح ان حضرات کی عنایات اور خصوصی توجہات سے خزائن علمی کے ابواب کھلتے چلے گئے اور علم کا ہر شعبہ پوری حقیقت اور بصیرت سے نصیب ہونے لگا۔

ایک علمی کرامت

البتہ علوم اسلامی کے اس ذخیرے میں "علم منطق" ایک ایسا علم تھا جس سے طبیعت کو مناسبت ہی نہ ہوتی

تھی اور نہ یہ علم سمجھ میں آتا تھا اس فن میں چار چھ کتابیں پڑھ چکا تھا لیکن پھر بھی وابستگی پیدا نہ ہو سکی ایک دن اپنی اس مشکل کو اپنے میزبان استاذ حضرت مولانا سید ظہور الحسن صاحبؒ سے عرض کیا حضرت موصوف نے اپنے ہاں اس علم کے چند اسباق پڑھنے کا مشورہ دیا بعد نماز مغرب حضرت نے اپنے مکان پر درس منطق شروع کیا دو تین ہفتے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ علمِ منطق اتنا آسان اور عام فہم ہو گیا کہ اب کوئی مشکل باقی نہ رہی "کرامت علمی" کا لفظ کتابوں میں پڑھا تھا وعظ و تقریروں میں بھی سُنا تھا لیکن اس کا مشاہدہ اور تجربہ زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ حضرت استاذ کی تفہیم کے بعد علم منطق صرف آسان ہی نہیں بلکہ ایسا پسندیدہ اور دلچسپ علم ہو گیا کہ اس کا ہر نیا درس مزید طلب و خواہش کا ذریعہ بنا فللہ الحمدُ علم منطق کی اس دلچسپی سے مزاج میں ایک نیا تغیر پیدا ہونے لگا۔ بحث و مباحثہ، مکالمہ و مناظرہ کی جانب میلان بڑھنے لگا اسی سلسلے میں "مجلس علمی" کی بنیاد رکھنے کا داعیہ پیدا ہوا چنانچہ ایک مجلس جس میں اکثریت صوبۂ بہار کے طلبہ کی تھی قائم کی گئی جس کا بنیادی مقصد وعظ و تقریر کی عملی مشق کرنا اور اپنے مافی الضمیر کو عمدہ طریقے پر ظاہر کرنا تھا۔ ہر جمعرات کو بعد نمازِ عشاء اس مجلس کا انعقاد ہوا کرتا تھا، اور طلبہ مختلف عنوانات پر تقریر کیا کرتے۔ یہ ایک عملی مشق تھی۔ جو آئندہ زندگی کے منصب میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے میرا ابتدائی تعلیمی زمانہ اکابر ملت کا آخری دَور سمجھا جاتا تھا۔ جن دنوں ہم مدرسہ مظاہر علوم پہنچے ہیں اس وقت استاذ العلماء مولانا عبد اللطیف صاحبؒ ناظم مدرسہ تھے حضرت موصوف کا یہ آخری زمانہ تھا ضعف اور پیرانہ سالی کی وجہ سے تدریسی سلسلہ بند رکھا تھا۔ مدرسہ کے صرف

انتظامی امور دیکھ لیا کرتے تھے، لیکن ہم دو حیدر آبادی طالب علم کی خواہش پر ترجمۂ قرآن کا درس شروع فرمایا۔ جس میں بعض دوسرے طلبہ بھی شریک ہوگئے، یہ ایک ایسی نعمت تھی جو اکثر ہم عصر طلبہ کو میسّر نہ ہوسکی، تحصیلِ علم میں "سلسلۂ اساتذہ" بڑی اہمیت رکھتا ہے احادیث سے بھی اس نظریہ کی تائید ملتی ہے۔ احادیث صحیحہ میں یہ مضمون ملتا ہے کہ یہ علم دین ہے اور تم اس بات کو اچھی طرح غور کرلو کہ یہ دین کس سے حاصل کیا جارہا ہے (الحدیث) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ جو میرے استاذِ حدیث ہیں، حضرت استاذ العلماء مولانا عبداللطیف صاحبؒ کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں اس لحاظ سے حضرت شیخ الحدیثؒ کے استاذِ محترم میرے بھی استاذ قرار پائے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند

دورانِ تعلیم ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آیا جس کا تذکرہ مدرسہ اشرف المدارس (ہردوئی) کے تذکرے سے کچھ کم نہیں (جس کی تفصیل آپ نے گزشتہ اوراق میں پڑھ لی ہے۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) میں میرے دوست مولوی عبدالعزیز صاحب بھی ساتھ تھے جن کی معیت و رفاقت میں دو سال گزرے تیسرے سال موصوف نے دارالعلوم (دیوبند) منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا اگرچہ ان کا علمی ذوق مدرسہ مظاہر علوم میں تکمیل پارہا تھا لیکن وہ غیر شعوری طور پر یہاں ایک قسم کی تشنگی محسوس کررہے تھے غالباً وہ تشنگی اساتذہ کرام کی تقریر و تفہیم سے متعلق تھی مدرسہ مظاہر علوم کے اساتذہ کرام عام طور پر اسباق کی تفہیم میں اختصار کو ملحوظ رکھا کرتے تھے تقریر مختصر ہوتی لیکن ایسے طور پر کہ مضمون کا منشاء و مراد واضح ہوجائے جس سے کلام کی پوری حقیقت سامنے آجاتی تھی۔

اس کے برعکس دارالعلوم (دیوبند) کے اساتذہ کرام کا طرز تعلیم عام طور پر تفصیلی اور جامع جوانب ہوا کرتا تھا، کلام کے طول و عرض دراز اور بلند ہوا کرتے جس کا لازمی نتیجہ حقیقتِ کلام کے ساتھ تقریر و تفہیم کی طوالت میں ظاہر ہوا کرتا تھا یہ معرکۃ الآرار تعلیمی طرز ہمارے دوست مولوی عبدالعزیز صاحب کو بہت پسند تھا ان کی علمی طبیعت اس سے سیرابی محسوس کرتی تھی۔ (یہ تجربہ وقتاً فوقتاً دیوبند آنے جانے سے انھیں ہوتا رہتا تھا لیکن اسی بہانے مجھکو بھی اساتذۂ دیوبند کے حلقۂ درس میں شرکت کے مواقع ملے) بہرحال موصوف نے دیوبند میں داخلہ لے لیا اس طرح ایک مخلص دوست کی رفاقت جاتی رہی اور میں تنہا رہ گیا لیکن گزشتہ دو سالہ معیت ایسی نہ تھی کہ اجنبیت اختیار کرلے، گاہے گاہے وہ سہارنپور آجاتے۔ اسی طرح میں بھی کبھی کبھار دیوبند چلا جاتا۔

لیکن ہر بار موصوف کا اور میرے ایک اور دوست مولوی سیّد حسین صاحب کا اصرار ہوا کرتا تھا کہ دیوبند آجائے اور یہاں اپنی تعلیم مکمل کریں سب ایک ساتھ ہوجائیں؛ لیکن میری طبیعت مائل ہی نہ ہوتی تھی کیونکہ مجھکو درسیات میں مختصر اور صرف مغز والی تقریر سے سیرابی ہوا کرتی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی معرکۃ الآرار تقاریر سے طبیعت کو مناسبت نہ ہوئی، اس طرح میں مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) ہی میں مقیم رہا۔

پُرحقیقت خواب

اس طرح کچھ زیادہ عرصہ گزرا نہ تھا بات ۱۹۵۶ء کی ہے کہ ایک رات خواب آیا، میں دارالعلوم دیوبند میں ہوں کسی نے کہا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ دارالعلوم کے "مدنی گیٹ" کے اوپر والے حجرے میں تشریف فرما ہیں۔ میں تیزی سے اوپر گیا اور دروازے پر رُک گیا۔ حضرت شیخ الہند چارپائی پر بیٹھے تھے۔ فرمایا آجایئے۔ داخل ہوکر سلام کیا

اور نیچے بیٹھنا چاہا۔ فرمایا اُوپر آیئے، میں چارپائی کے ایک جانب بیٹھ گیا، اب یہ یاد نہیں کہ کیا کیا ارشادات تھے میں پورے انہماک سے سُن رہا تھا کچھ دیر بعد مجھکو پیاس محسوس ہوئی کمرے کے ایک جانب نئی صراحی رکھی ہوئی تھی غیر شعوری طور پر اُس جانب دیکھنے لگا حضرت شیخ الہند نے فرمایا پینا چاہتے ہو؟ میں نے جی ہاں کہی۔ فرمایا جاؤ پی لو۔ صراحی کے مُنہ پر ایک خوبصورت کٹورا تھا۔ جب میں نے کٹورے پر صراحی جھکائی تو خالص دُودھ نکلا، میں نے تعجب سے شیخ الہند کی جانب نظر کی فرمایا، پی لو، پی لو، بڑا لذیذ اور ٹھنڈا دودھ تھا، دوبارہ لینے کیلئے پھر آپ کی جانب دیکھا تو فرمایا تکلف نہ کرو جتنا چاہو، پی لو، میں نے سات کٹورے یکے بعد دیگرے پی لئے۔ کسی قِسم کی گرانی محسوس نہ ہوئی پھر صراحی پر کٹورا رکھ دیا فرمایا اور پی لو؟ میں نے عرض کی حضرت پیٹ بھر گیا۔

فرمایا! تو پھر آجایئے، میں آکر اپنی جگہ بیٹھ گیا، اسی درمیان میرے ایک دوست آگئے تھے اور وہ یہ عجیب وغریب منظر دیکھ رہے تھے وہ بھی صراحی کی جانب دیکھنے لگے، حضرت شیخ الہند نے فرمایا پینا چاہتے ہو؟ کہا جی ہاں وہ اٹھے اور اس کٹورے پر صراحی جھکائی تو پانی نکلا۔ ایک لحظہ تردّد کیا پھر پی گئے اس کے بعد حضرت شیخ الہند کی جانب دیکھا تو آپ نے فرمایا اور پی لو، انھوں نے دوبارہ صراحی جھکائی تو پانی ہی نکلا، پی لیا پھر واپس آگئے۔ (بس ہمارا خواب ختم ہو گیا) اذانِ فجر کا وقت تھا اٹھ بیٹھا قلب پر فرحت طاری تھی نماز ادا کی، اچانک احساس ہوا کہ دوستوں کا اصرار حق بجانب ہے مجھ کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لینا چاہیئے۔ غالباً میرا علمی حِصّہ وہاں مقدر ہے اس خواب سے چند ماہ پہلے بھی اسی طرح کا خواب آیا تھا کہ احاطہ مولسری دارالعلوم دیوبند کے قدیم کنویں پر بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی ڈول کے ذریعہ پانی نکال کر طلبہ کے برتن بھر

رہے ہیں۔ میں نے بھی پیش قدمی کی تو مسکراتے ہوئے میرے برتن میں بھی ڈالدیا
سارا کا سارا خالص دودھ تھا، بہر حال اُس دوسرے خواب کے بعد دو چار دن
میں یہ تقاضا شدید ہوگیا، آخر میں نے ارادہ کرلیا کہ دیوبند چلا جاؤں لیکن
اس ارادے کو مخفی رکھا کسی سے بھی مشورہ کرنا تو درکنار ذکر تک نہ کیا۔ دوسرے
ہفتے دار العلوم دیوبند پہنچا دونوں دوستوں پر اپنا خواب ظاہر کیا ویسے بھی وہ
خواہشمند تھے جب میں نے اپنا فیصلہ سنایا تو بہت خوش ہوئے اور داخلہ کی
کاروائی شروع کردی، اندرونِ دو یوم داخلہ مل گیا۔ قیام وطعام کا بھی
انتظام ہوگیا، تیسرے دن سے اسباق میں شرکت ہوگئی۔

پہلا دن گذر گیا لیکن دل اُداس اداس تھا۔ دوسرے دن اسباق میں
کچھ دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ ساتھیوں نے کہا ابتداء میں ایسے ہی ہوا کرتا ہے پھر
مناسبت اور دلچسپی پیدا ہوجائے گی۔

تیسرے دن وہی کیفیت برقرار رہی بلکہ بیقراری کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی
اور اپنا فیصلہ کچھ صحیح معلوم نہ ہوا لیکن اس کا اظہار کسی سے نہیں کیا۔

چوتھے دن حسبِ معمول درسگاہ گیا لیکن ہر تھوڑی دیر بعد اٹھ بھاگنے کا
ارادہ ہوتا رہا ایک تو درسیات کی تفہیم وتقریر کچھ پلّے نہ پڑتی تھی دوسرے مدرسہ کی
بین الاقوامی برادری کی ہمہ ہمی اور طلبہ کی کثرت، بڑے بڑے ہال طلبہ سے
بھرے ہوئے۔ دل پراگندہ اور وحشت کھانے لگا۔

بعد برخاستِ مدرسہ اپنے کمرے آیا سب کے ساتھ کھایا پیا، ظہر سے پہلے
طلبہ اپنے معمول کے مطابق استراحت کیا کرتے تھے میں بھی لیٹ گیا جب ساتھیوں
کی آنکھ لگی اُٹھ بیٹھا اپنا بیگ سنبھالا اور دیوبند ریلوے اسٹیشن جا پہنچا
خدا کی شان ریل تیار کھڑی تھی۔ گویا میرا انتظار ہو رہا تھا۔ دو گھنٹے سہارنپور

پہنچ گیا، مدرسہ میں داخل ہوا ایسا معلوم ہوا کہ راہ بھٹکا ہوا اپنی منزل پا گیا وہ ساری وحشت، اُداسی اور بے قراری غائب تھی گویا بچہ اپنی ماں کی گود آ گیا سابقہ سکون لوٹ آیا. مظاہر علوم سے فرار ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا نظام دارالاقامہ کے تحت ہمارا دو وقتی طعام بند ہوگیا اس کو جاری کروانے کیلئے ناظم مدرسہ مولانا اسعداللہ صاحبؒ کے پاس جانا پڑتا تھا۔

خیر اسی میں معلوم ہوئی کہ ہیرا پھیری نہ کی جائے صاف صاف بیان کردیا جائے۔ پھر میں نے دوستوں کا تقاضہ، اپنا خواب اور اس کی اپنی خانہ زاد تعبیر اور اپنا فیصلہ بھی سُنا دیا۔

حضرت ناظم صاحبؒ بے ساختہ ہنس پڑے فرمایا سبحان اللہ کیا کوئی بیمار خود اپنا علاج بھی کیا ہے؟ جو آپ کرنے چلے؟ صاحبزادے خواب تو سچا ہے لیکن تم نے اس کی تعبیر غلط سمجھی، تمہارا علمی مقدر انشاء اللہ تعالیٰ مدرسہ مظاہر علوم (سہارن پور) ہی ہے۔ تم کو یہاں سے علم ملے گا اور بھرپور ملے گا۔ رہی شیخ الہند کی زیارت اور دارالعلوم (دیوبند) کا کمرہ وہ مظاہر علوم (سہارن پور) کی صورت مثالی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند بھی مدرسہ مظاہر علوم کے ایک فرزند ہیں کیونکہ انکے ایک استاذ حضرت مولانا سعادت علی صاحبؒ ہیں (اپنے زمانے کے فقیہ العصر سمجھے جاتے تھے) جو مدرسہ مظاہر علوم کے سرپرست رہے ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت شیخ الہند کا تعلق مدرسہ مظاہر علوم سے جُدا نہیں ہوا۔ چونکہ تم کو علم کا بڑا حصہ ملنے والا تھا اس لئے خواب میں مدرسہ بھی بڑا (دارالعلوم دیوبند) اور استاذ بھی (شیخ الہند) عظیم الشان حیثیت والا دکھایا گیا، احادیث میں دُودھ کی تعبیر "علم دین" بیان کی گئی ہے۔ تمہارے خواب میں، اس کی بشارت ہے اور پیٹ بھر دُودھ پی لینا یہ علم کامل کی جانب اشارہ ہے۔ انشاء اللہ علم ملے گا

خالص ملے گا، بھرپور ملے گا، اور مظاہر علوم (سہارن پور) سے ملے گا. تم نے اچھا کیا جو واپس چلے آئے، اب آئندہ اس چکر میں نہ پڑو یکسوئی سے اپنی تعلیم جاری رکھو انشاء اللہ سب کچھ مل جائے گا۔

اس تعبیر کے بعد قلب کی کایا بالکل پلٹ گئی. سارے وساوس، اندیشے ختم ہوگئے. شروع ہی سے مزاج یکسوئی پسند تھا۔ دوستوں کا رخصت ہوجانا مزید یکسوئی کا باعث ہوا۔

پھر تو بقول مجذوبؒ

سب تمنّا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی!

پُرحقیقت بات

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ (ناظم مدرسہ مظاہر علوم) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اجلہ خلفاء میں شامل ہیں حضرت استاذ العلماء مولانا عبداللطیف صاحبؒ کی وفات کے بعد مدرسہ مظاہر علوم کے ناظم مقرر ہوئے اور آخری وقت تک اسی منصب پر قائم رہے جوانی میں شعر و شاعری کا خاصا رجحان تھا۔ اُردو، فارسی، عربی میں بے تکلف اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان کے نامی گرامی شعراء آپ کے شاگردوں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ جب کبھی ضلع سہارن پور کے نواح میں کوئی محفل مشاعرہ ہوتی تو واپسی پر یہ شعراء حضرت مولانا سے ملاقات کرنے مدرسہ مظاہر علوم حاضری دیتے اور اپنا تازہ کلام سُنا کر حضرت سے دُعائیں لیتے ایسے ہی ایک موقع پر شعراء کی ایک جماعت آئی جس میں جگرؔ مراد آبادی مرحوم اور فنا کانپوری وغیرہ تھے مظاہر علوم آئے پھر سب نے حضرت استاذ کو اپنا اپنا تازہ کلام سنایا اور دُعالی یہ علم وادب وشاعری کی عجیب و غریب محفل تھی طلبہ کو اسی محفل میں داخل

ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ویسے بھی کوئی طالب علم ایسی جرأت نہیں کرسکتا تھا چونکہ حضرت ناظم صاحب کی خانگی خدمت گزاری میرے سپرد تھی میں آزادانہ آمد و رفت رکھتا تھا محفل مشاعرہ برخاست ہونے کے بعد میں نے جگر صاحب سے اپنا تعارف کروایا کہ میں لطیف ساجد مرحوم کا چھوٹا بھائی ہوں جگر صاحب یکدم سکتے میں آگئے کہنے لگے ساجد تمہارا حقیقی بھائی؟ میں نے کہا جی ہاں، گلے لگالیا پھر مرحوم کے بچوں کے بارے میں خیر خیریت دریافت کی، یادِ رفتگاں سے جگر صاحب کا دل بھر آیا۔

میرے ایک ہم سبق مولوی ابرار احمد بستوی جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ کہنے لگے جگر صاحب میں اپنے اشعار کی آپ سے اصلاح لینا چاہتا ہوں جناب کا پتہ؟ جگر صاحب فوری بولے۔ جگر۔ گونڈہ۔ اللہ اللہ دُنیاوی شہرت بھی ایک عجیب و غریب افسانہ ہے کسی بھی کونے سے جگر صاحب کو خط لکھ دیا جائے تو بس اتنا پتہ کافی ہے۔ جگر۔ گونڈہ (یعنی ضلع گونڈہ۔ یو۔پی۔ انڈیا)

ایک لطیفہ

اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ دورِ آصف جاہی (نظام حیدرآباد) کا زمانہ تھا۔ غالباً اس وقت میری عمر آٹھ دس سال ہوگی جگر صاحب کسی سلسلہ میں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ بڑے بھائی ساجد مرحوم سے ملاقات کرنے ہمارے گھر تشریف لائے، دروازے پر دستک دی میں نے کہا کون؟

بس جواب صرف اتنا ہی تھا۔ "جگر" میری بچکانی زبان نے اسی لہجہ میں گردہ، کلیجہ کہدیا، جگر صاحب خاموش ہوگئے۔ باہر آکر دیکھا چار چھ حضرات خوش پوشاک، ثقہ قسم کے ہیں۔ فوری اندر آیا۔ ساجد مرحوم غسل خانے میں تھے میں نے کہا بھائی جان جگر صاحب آئے ہیں بس دیر نہ لگی صرف ایک منٹ کے اندر اندر بھائی صاحب نکل پڑے۔ اور بڑے استقبال سے سب کو اپنے کمرے

میں لے آئے۔ میرے تو ہوش وحواس گم ہو گئے اللہ اللہ یہ کون ہیں؟ اور میں کیا حرکت کر گیا؟ جگر میری بدتمیزی بھائی صاحب سے بیان کر دیا گئے۔ تو میرا حشر ہو جائے گا۔ لیکن خیر گذری ایسی کوئی بات نہ ہوئی بڑے لوگوں کے حوصلے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ میں تو اسی وقت گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ بات دُور نکل گئی میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کو اللہ نے دین ودنیا دونوں کی عزّت عطا فرمائی تھی علم وادب کے علاوہ تقویٰ طہارت، اور علم مناظرہ میں کمال حاصل تھا، اسلامی گمراہ فرقوں کے علاوہ یہودیت، نصرانیت اور آریہ مذہب (مشرکین) کے بڑے بڑے پنڈتوں اور پادری صاحبان سے بے خوف وخطر مناظرہ کر لیا کرتے تھے، یہ حضرت کے عین جوانی کا زمانہ تھا جبکہ غیر منقسم ہندوستان میں آریہ سماجوں اور عیسائیوں کا زور وشور تھا۔ انگریزی حکومت یورپ سے بڑے بڑے پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کیلئے ہندوستان رَوانہ کر رہی تھی۔ اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تحریک جاری تھی اسوقت ارضِ ہند پر صرف علماء دیوبند کی ایک جماعت تھی جو اس فتنے کی سرکوبی کیلئے میدانِ عمل میں سرگرم عمل تھی۔

مولانا اسعد اللہ صاحبؒ بھی اسی جماعت کے ایک بازو تھے، اس سلسلے میں عجیب وغریب معرکے سر کئے ہیں، آریہ سماج (ہندو مذہب) کا ایک سربرآوردہ رہنما پنڈت رامچندر (دہلی) جو علم مناظرہ میں بڑی مہارت رکھتا تھا، کہا کرتا تھا کہ ہندوستان میں صرف ساڑھے تین مناظر ہیں۔ باقی تو صرف ایسے ویسے ہی ہیں جب اُس سے تفصیل پوچھی گئی کہ وہ کون ہیں؟ تو کہنے لگا۔

(۱) مولوی ثناء اللہ امرتسری (۲) مولوی مرتضیٰ حسن چاندپوری

(۳) مولوی انور شاہ کشمیریؒ (۴) اور آدھا مناظر مولوی اسعد اللہ رام پوری

استاذ کی خدمت

غالباً وجہ اس کی یہ تھی کہ اس وقت حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب اِن تینوں سے کم عمر تھے یہ تقسیم ہند سے بہت پہلے کی بات ہے۔ جب میں مدرسہ مظاہر علوم میں داخل ہوا اُسی دن سے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ نے اپنی خدمت گزاری کیلئے مجھ کو قبول کر لیا تھا، ہر روز صبح کمرے کی صفائی، ناشتے کا انتظام، برتن کی دُھلوائی، وضو کا پانی وغیرہ میرے ذمّے تھا اس کے علاوہ ہر جمعہ پورے کمرے کی تفصیلی صفائی اور نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد (سہارن پور) لانا لیجانا بھی میرے خدمات میں شامل تھا۔ وہاں بعد نماز حضرت کا وعظ ہوا کرتا تھا۔

یہ تو میری اپنی خدمات تھیں جو میں نے اپنے آپ تجویز کر لی تھیں۔ حضرت مولانا نے اپنی جانب سے ایک اور خدمت عنایت کی تھی وہ پیر دبانے کی خدمت تھی، بعد عشاء رات دیر گئے جب میں درسیات کی تکرار سے فارغ ہوتا اس وقت حضرت مولانا کا کمرہ جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا داخل ہوتا اور پیر دبایا کرتا (جس کو مدرسہ کی زبان میں پیر کی چپی کہا جاتا تھا) عموماً یہ خدمت رات کے بارہ بجے کے بعد ہی پیش آتی تھی بحمد للہ پانچ سال تک یہ خدمات انجام دی ہیں ایسے ہی ایک رات میں درسیات کی تکرار کے بعد کمرے میں داخل ہوا اور چپی شروع ہی کی تھی کہ حضرت مولانا اٹھکر بیٹھ گئے عام طور پر ہر روز تو یہی معمول تھا کہ جونہی چپی شروع کی بیدار ہو جاتے نام پوچھتے اور رخصت کر دیتے بمشکل پاؤ منٹ گزرتا ہو گا۔ بس اتنی ہی خدمت تھی مجھے یاد نہیں کہ کبھی آدھا منٹ ہی چپی لگائی ہو، اگر کبھی ناغہ ہو جاتا تو دن میں شامت آجاتی ویسے یہ بھی یاد نہیں کہ دو ایک مرتبہ کے سوا کبھی ناغہ کیا ہوگا

بہرحال اس رات حضرت مولانا خلافِ معمول اٹھ کر بیٹھ گئے فرمایا کون؟ میں نے کہا عبدالرحمٰن۔ فرمایا کیا وقت ہے؟ عرض کیا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ فرمایا تہجد کا

وقت شروع ہو گیا میں نے کہا جی ہاں۔ پھر فرمایا کیا تاریخ ہے ؟ میں نے کہا ۱۰ ذو الحجہ۔ اور کل دن کیا ہے ؟ کہا "جمعہ" نہایت بشاشت سے فرمایا۔ اللہ اکبر آج کی رات تین فضائل جمع ہو گئے ہیں ؟

(بقرعید کی شب، جمعہ کی شب، تہجد کا وقت)

آؤ تم کو تین دعائیں دی جاتی ہیں۔ انشاء اللہ۔

(۱) دین کی خدمت کا غیر معمولی موقعہ ملے گا۔

(۲) دنیا کی دولت بھی بہت ملے گی۔

(۳) عمر بھی دراز ہو گی۔

اس کے بعد فرمایا ایک اور دعا بھی ہے انشاء اللہ خاتمہ بھی ایمان پر ہو گا۔ یہ کہکر آپ لیٹ گئے فرمایا اچھا جاؤ آرام کرو۔ میں اٹھ آیا۔ نیند کہاں آتی۔ خوشیوں اور مسرتوں سے دل اُڑ رہا تھا۔ انہی جذبات میں صبح ہو گئی۔ اللہ کے نیک بندوں کی دعائیں کب ضائع ہوئی ہیں جو یہ ضائع ہو گی ؟

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ پہلی تین دعائیں آج ۱۹۹۲ء مطابق ۱۴۱۲ھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور چوتھی دعا سے انشاء اللہ محروم نہ رہوں گا۔

ع۔ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید،

فَسُبْحَانَ الَّذِی بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْئٍ وَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ

مذکورہ دعاؤں کی صداقت جہاں ایک حقیقت ہے وہاں یہ ایک واقعہ بھی ہے۔ بزرگانِ دین کی زندگیوں میں ایسے بکثرت واقعات ملتے ہیں جہاں انھوں نے اپنے شاگردوں، عقیدت مندوں، خادموں کو خصوصی دعاؤں سے نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اہل علم کی ایک بڑی تعداد نے بزرگانِ دین (اہل اللہ)

سے دائمی وابستگی قائم رکھی ہے۔
اور "جوئندہ یابندہ" جن کو بھی جو کچھ ملا وہ اسی نظر کرم کا فیض تھا۔
اکبر الہ آبادی کی زبان سے کس خوبصورتی کے ساتھ یہ حقیقت جاری ہوئی۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے بزرگان دین کے ان واقعات کو تائید و تقویت ملتی ہے۔
اہل اللہ کی ذوات سے اِن جیسے واقعات کا جاری ہونا اسلامی زبان میں کرامت کہلاتا ہے اور کرامت ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کا انکار کرنا یا مذاق اُڑانا جہالت کی علامت ہے۔

اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَکُونَ مِنَ الجَاهِلِینَ۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک رات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کمزور حافظہ کی شکایت کی۔
یا رسول اللہؐ میں آپ کے ارشادات کو دن بھر محفوظ کر لیا کرتا ہوں
پھر رات کو وہ تمام ارشادات دُہرائے بغیر سوتا نہیں،
لیکن دوسرے دن پھر بھول جاتا ہوں۔
یا رسول اللہؐ میرے لئے دُعا فرما دیجئے کہ آپ کے ارشادات میرے سینے میں محفوظ ہو جایا کریں۔
حضرت ابو ہریرہؓ کی اس طلب کو سرکار نے اس طرح نوازا تھا
ابو ہریرہؓ اپنی چادر زمین پر بچھا دو۔
ابو ہریرہؓ نے اپنی چادر زمین پر بچھا دی، پھر آپ نے چند کلمات کی تلاوت

فرمائی اور چادر پر پھونک دیا، اور فرمایا:
ابوہریرہؓ چادر کے چاروں کونوں کو لپیٹ کر درمیان میں یکجا کر دو،
چنانچہ ابوہریرہؓ نے ایسے ہی کر دیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا۔
ابوہریرہؓ چادر کو اپنے سینے سے لگالو۔ چنانچہ ابوہریرہؓ نے چادر کو سینے سے لگا لیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا بس اب جاؤ اور آرام کرو۔
حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میرے حافظہ سے آپ کا کوئی ارشاد کبھی ضائع نہ ہوا۔ طبقۂ صحابہ میں جن جن حضرات کو علومِ نبوت سے بھرپور حصہ ملا تھا ان میں ایک حضرت ابوہریرہؓ بھی ہیں، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔
حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب جن کی دعاؤں کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ میرے استاذ حدیث بھی ہیں۔ حدیث کی مشہور و معروف کتاب طحاوی شریف حضرت مولانا ہی سے پڑھی ہے، حضرت مولانا اثنائے درس بعض اہم نکات کو اشعار میں نقل کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں خاص طور پر کسی امام و محدث کی تاریخ ولادت، تاریخِ وفات اور ایسے ہی دیگر ضروری باتیں۔
درس طحاوی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث کو ایک فارسی شعر میں اس طرح بیان فرمایا جو آج تک یاد ہے۔

کن حدیثِ بوہریرہؓ راشمار پنج الف وسہ صد و ہفتاد و چار

(حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ جملہ احادیث شریفہ کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے (۵۳۷۴) بہرحال حضرت ابوہریرہؓ کو روایت حدیث کا وہ بھرپور حصہ ملا جو دیگر اصحاب کو میسّر نہ آیا، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا اور توجہ ہی کی تو برکت تھی اکبر الہ آبادی مرحوم کا وہ شعر بھی تازہ کر لیجئے۔

ع۔ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔

سیّدہ عائشہ صدّیقہؓ کی زیارت

انہی دنوں کی بات ہے مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) میں ایک رات خواب آیا کہ مدرسہ کی درسگاہ میں سیّدہ عائشہ صدیقہؓ تشریف لائی ہیں اس اطلاع پر طلبہ دوڑنے لگے میں بھی عجلت کے ساتھ آگے ہوگیا اور درسگاہ میں سب سے پہلے داخل ہوا۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ استاذ کی جگہ تشریف فرما تھیں نہایت جمیل شکل وصورت، زنانہ پنجابی لباس، سر پر اوڑھنی اور سامنے کتاب کھلی ہوئی۔ میں بالکل مقابل بیٹھ گیا۔ فرمایا شروع کیجئے۔ میں نے اپنی کتاب کھولی علم فقہ کی درسی کتاب کنز الدقائق تھی پڑھنا شروع کیا، سیدہ عائشہ صدیقہؓ نہایت مسرور ہونے لگیں اتنے میں آنکھ کھل گئی۔

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے میں نے یہ خواب بیان کیا حضرت بے حد مسرور ہوئے فرمایا خواب مبارک ہے انشاء اللہ دین کی حقیقتیں نصیب ہونگی۔ (کتاب کا نام کنز الدقائق (حقائق ومعارف کا خزانہ) یہ کتاب فقہ حنفی کی اساسی کتب میں شمار کی جاتی ہے اور ہند و پاک کے مدارس اسلامی کے نصاب میں داخل ہے)

ایک اور بشارت

اس واقعہ کے چند دنوں بعد ضلع ارکان (برما) کے ایک ہم سبق دوست مولوی فضل حق صاحب ایک دن فجر کی نماز کے بعد ہمارے کمرے میں اچانک آئے یہ کوئی ملاقات کا وقت نہ تھا۔ میں لیٹا ہوا تھا آتے ہی پیر دبانے لگے میں فوری اٹھ بیٹھا اور کہا برادر کیا غضب کرتے ہو؟ ہم کو کیوں گنہگار بناتے ہو؟ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رقت طاری ہوگئی کہنے لگے للہ معاف کیجئے۔ خدارا انکار نہ کیجئے؟ اپنی پیشانی کا بوسہ لینے دیجئے؟ میں حیران ہوگیا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ لیکن ابھی میں کچھ جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وہ قریب آئے اور ادب و احترام

سے پیشانی کا بوسہ لیا اور پھر زار و قطار رونے لگے، میں نے کہا آج آپ خلافِ معمول ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کیا واقعہ پیش آیا؟ اس سوال پر ان کا گریہ اور تیز ہو گیا۔ دو چار منٹ بعد کہنے لگے گزشتہ رات میری زندگی کی عظیم رات تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے قریب تشریف لائے اور آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا بس یہ کہہ کر بے تحاشا رو پڑے۔ ماحول کچھ ایسا سوگوار قسم کا ہو گیا کہ ان کی اس کیفیت سے مجھ پر بھی گریہ طاری ہو گیا، اللہ اللہ ہم جیسے حقیر فقیروں پر اللہ و رسول کی یہ عنایات ہیں فصلوات ربی وسلامہ علیہ۔ میں نے کہا مولوی صاحب براہِ کرم یہ خواب کسی پر ظاہر نہ کرو۔ اس کی تعبیر اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو گئی۔ شکر ادا کرو۔

اس کے بعد ان صاحب کا یہ حال ہو گیا کہ راستے میں جہاں کہیں میں نظر آتا اُسی حالت میں کھڑے ہو جاتے جب تک کہ میں گزر نہ جاؤں، میں نے بارہا گزارش کی کہ ایسا نہ کیجئے لیکن وہ اپنے اس عمل سے باز نہ آئے۔ اللہ ان کو اور ہم سب کو اپنے نبی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و شفاعت نصیب کرے۔ آمین۔

احادیث شریفہ میں ایسے خوابوں کو "بُشری المؤمن" کہا گیا ہے جس کو مومن دیکھتا ہے یا اس کے بارے میں کسی کو دکھایا جاتا ہے یہ ایک خوش خبری ہے جو دُنیا میں مؤمن کو دی جاتی ہے۔ قرآن حکیم کی آیت۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ الآیۃ یونس آیت ۶۴)

ان کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشخبری ہے۔

دُنیا کی خوش خبری سے مراد اچھے اور نیک خواب مراد ہیں۔ الحدیث۔

(ابن کثیر)

چار دوستوں کی کہانی

انہی ایام عام طور پر طلباء میں یہ بات پھیل گئی اور وہ خواب مشہور ہو گیا۔ ردِ عمل کا تو علم نہ ہو سکا البتہ طلباء میں ہماری غیر معمولی پذیرائی ہونے لگی۔ اس کا اثر اسباق کی تکرار والی مجلس میں ظاہر ہوا۔ اس مجلس میں طلباء بکثرت شرکت کرنے لگے۔ اہتمام اور بڑھ گیا۔ جس سے ہمارا حلقۂ درس وسیع تر ہونے لگا۔ اللہ نے ہمارے اس خواب کو ہمارے ازدیادِ علم کا ذریعہ بنایا۔

اس واقعہ کے چند ہفتوں بعد ہمارے رفیق عزیز مولوی عبدالعزیز صاحب مدرسہ مظاہر علوم سے مدرسہ دارالعلوم دیوبند منتقل ہو گئے۔ (جس کا مفصل تذکرہ گزشتہ اوراق میں آچکا ہے)۔

یہ ایسا واقعہ تھا جس نے بے سکونی کی کیفیت پیدا کر دی ایک مخلص ہمدم کا چھوٹ جانا کسی حادثے سے کم نہ تھا۔ مسلسل ڈیڑھ سال کی رفاقت اچانک ختم ہو گئی۔ دل برداشتہ رہنے لگا، چند دوستوں نے خاص طور پر الٰہ آباد کے مولوی انیس الرحمٰن صاحب بھوپال کے مولوی عتیق احمد صاحب، ضلع بستی (یو، پی) کے مولوی ابرار احمد صاحب نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا اور تفریحِ طبع کیلئے ایک پروگرام بنایا۔ سہارنپور سے چند میل کے فاصلہ پر قصبہ گنگوہ واقع ہے یہ قصبہ اکابر دیوبند کا وطن رہا ہے۔ یہاں اکابر اولیاء اللہ کے مزارات بھی ہیں، شیخ الشیوخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ ابوسعید گنگوہیؒ، قطب العالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ وغیرہم یہیں آسودۂ خواب ہیں۔

مؤخر الذکر بزرگ کی اولاد میں حضرت مولانا حکیم عبدالرشید صاحب جن کو اہل قصبہ ننھے میاں کہا کرتے ہیں۔ موجود تھے۔ اطراف و اکناف میں موصوف کی حکمتِ طبی کا غیر معمولی چرچا تھا، ویسے بھی مجھکو گنگوہ کی زیارت کرنے کا عرصہ

سے اشتیاق تھا بہرحال دوستوں نے پروگرام بنا ہی لیا،

جمعہ کی چھٹی میں گنگوہ پہنچے، مزارات کی زیارت کرنے کے بعد ننھے میاں صاحب سے ملاقات کیلئے موصوف کے مکان آئے، معلوم ہوا کہ حضرت کی ملاقات کا یہ وقت نہیں ہے لیکن بہرحال ہم طالب علم تھے اپنی شکست کیوں قبول کرتے؟ اطلاع کروائی گئی کہ مدرسہ مظاہر علوم کے چند طلبہ ہیں صرف سلام و دعا کیلئے آئے ہیں، مغرب سے پہلے پہلے مدرسہ واپس ہونا ضروری ہے۔

گذارش منظور ہو گئی حضرت ننھے میاں صاحب تشریف لائے لباس نہایت نفیس و پاکیزہ زیب تن اور شکل و صورت اس سے کہیں زیادہ خوبصورت، پُروقار شخصیت مسکراتے ہوئے ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ خیر خیریت پوچھی پھر ہر ایک کا تعارف حاصل کیا، کلام کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ موتی جھڑ رہے ہیں، زمزم اور کھجور سے تواضع کی پھر ہم چاروں سے مستقبل کے بارے میں دریافت کیا کہ فراغت علم کے بعد کیا کام کرو گے؟

سوال غیر متوقع تھا جس کے جواب کیلئے ہم تیار نہ تھے لیکن جواب بہرحال دینا تھا۔ مولوی عتیق احمد بھوپالی نے پہل کی۔ کہا فراغت کے بعد انگریزی پڑھونگا پھر کالج میں لکچرار بن کر طلبہ میں اسلام کی تبلیغ کروں گا۔

مولوی ابرار احمد صاحب بستوی نے کہا میں علم طب حاصل کروں گا اور اس کو اپنا ذریعۂ معاش بناؤں گا اور دین کی لوجہ اللہ خدمت کروں گا۔

مولوی انیس الرحمٰن الٰہ آبادی مزاجاً قلندر صفت تھے اور عمر میں بھی ہم سب سے کچھ بڑے تھے۔ اپنے مخصوص لہجہ میں نہایت انکساری سے کہا بندہ کسی خانقاہ یا مدرسہ میں پڑا رہے گا۔

بس ہماری باری آگئی میں بے چین تھا کہ وقت قریب آرہا ہے کیا جواب دوں؟

اب تو یہ معلوم نہیں کہ ان تینوں دوستوں نے پہلے ہی سے اپنا مستقبل طے کرلیا تھا یا بروقت جو دل میں آیا کہدیا لیکن میں نہ اس سے پہلے اس مسئلہ پر کبھی غور کیا تھا اور نہ موجودہ وقت جب کہ مجھ کو غور کرنے کا نسبتاً زیادہ موقعہ بھی ملا تھا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ۔ چند سکنڈ کے بعد بے ساختہ اس طرح بول پڑا ۔ حضرت ہمارے وطن حیدرآباد دکن میں شرک و بدعات مذہب کی شکل اختیار کرگئے ہیں میں انشاءاللہ اس کے خلاف کام کروں گا ۔ بس بات ختم ہوگئی ۔

حضرت ننھے میاں صاحب پہلے تو سب کے لئے چند ہمت افزائی کے کلمات فرمائے اور دعا دی پھر اچانک میری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا تم سے دکن میں دین کی خوب اشاعت ہوگی اور انشاءاللہ توحید و سنت زندہ ہوں گے ۔ بات آئی گئی ہم چاروں مصافحہ کرکے رخصت ہوگئے ۔

۱۹۵۷ء و ۱۹۵۸ء میں سب کی علمی فراغت ہوگئی سب اپنے اپنے وطن آگئے عرصہ دراز تک پتہ نہ چلا کہ کون کہاں ہے ؟ کس حالت میں ہے ؟ شاذ و نادر مولوی انیس الرحمٰن صاحب الہ آبادی سے ملاقات ہوجاتی تو کچھ پرانی یادیں تازہ ہوجاتیں و بس ۔

بہرحال کس کو معلوم تھا کہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید ۔

فراغت علمی کے بعد مولوی عتیق احمد صاحب نے وہی کالج کا میدان سنبھالا مولوی ابرار احمد صاحب نے حکمت کے ساتھ تجارت کو اپنا معاش بنایا اور لوجہ اللہ مقامی مدرسہ کی خدمت اختیار کی ، مولوی انیس الرحمٰن صاحب نے قلندرانہ زندگی اختیار کی مدرسہ و خانقاہ کی نذر ہوگئے ۔

رہا ہمارا حال تو ہماری تبلیغی زندگی کا آغاز جامع مسجد ملّے پلی حیدرآباد کی خطابت اور علمی زندگی مدرسہ نظامیہ حیدرآباد سے شروع ہوئی پھر کچھ ہی عرصہ بعد

گنگوہ کے اس مردِ قلندر کی بات پوری ہونے لگی شہر کی مساجد میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ اور علم فقہ کے درس شروع ہو گئے۔ اشاعت وتبلیغ کا سلسلہ چل پڑا۔ اہلِ علم کیلئے موجودہ تبلیغی جماعت کے نہج پر ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء "مجلسِ علمیہ" کا قیام عمل میں آیا۔ مجلس کے اغراض ومقاصد کے تحت ہر عالم کیلئے ہفتہ میں کم از کم دو درس، درسِ قرآن، درسِ حدیث کی پابندی ضروری قرار پائی، شہر کی مساجد کے علاوہ بیرون شہر بھی یہ سلسلہ شروع ہو گیا، دو سال کے اندر اندر مجلسِ علمیہ کا حلقہ اثر صوبہ آندھرا پردیش سے گزر کر صوبہ مہاراشٹر، صوبہ کرناٹک کے اضلاع میں پھیل گیا۔ ڈیڑھ سو سے زائد علماء کرام نے مجلسِ علمیہ کی رکنیت اختیار کر لی۔

مجلسِ علمیہ کا پہلا سالانہ اجتماع ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۴ء مسجد محی الدین النساء بیگم جدید ملک پیٹ (حیدرآباد) میں منعقد ہوا جس میں شہر و بیرون شہر کے کم و بیش ستر علماء کرام نے شرکت کی، اس اجتماع نے دکن کی تاریخ کا وہ عظیم کارنامہ انجام دیا جس کو دکن کی تاریخ لکھنے والا مسلمان مؤرخ علماءِ دکن کا تجدیدی کارنامہ قرار دے گا۔

سلطنت آصفجاہی کے دو سو سالہ دورِ حکومت میں پہلی بار توحید وسنت کی دعوت اور شرک و بدعت کی علی الاعلان تردید و برأت کی عام تحریک کا آغاز ہوا اور اس زور شور سے ہوا کہ ان اجتماعات میں دو دو تین تین لاکھ مرد وخواتین شرکت کرنے لگے۔ مجلسِ علمیہ توحید وسنت کی علامت قرار پائی۔ ان اجتماعات میں دکن کے مسلمانوں نے پہلی مرتبہ توحید و شرک، سنت و بدعت کے امتیاز کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ ہزاروں مسلمانوں نے شرک و بدعت سے توبہ کی، خواتین میں اس سے کہیں زیادہ اثرات مرتب ہوئے۔ مکمل تفصیل

آئندہ اوراق میں بیان کی جائے گی۔
بہرحال میں گنگوہ کے اُس مرد قلندر کی پیش گوئی کا تذکرہ کر رہا تھا جس نے اپنی فراست ایمانی سے ایک نووارد کم عمر مہمان کی ملاقات پر ایک ایسے عظیم انکشاف کا اظہار کیا جس کو بہت جلد مسلمانانِ دکن نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ۔

انجمن ہدایتُ الرّشید

مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) کی علمی سرگرمیوں میں طلبہ کیلئے انجمن "ہدایت الرشید" نامی ایک مجلس بھی تھی جس کے اغراض و مقاصد میں منتہی طلبہ کو بحث و مباحثہ، مکالمہ و مناظرہ کی عملی مشق بھی کروائی جاتی تھی تاکہ وہ اپنی عملی زندگی کیلئے اسلام کے دفاع و بقا کی ذہنی و فکری صلاحیت حاصل کرسکیں، ناظم مدرسہ مولانا اسعد اللہ صاحبؒ جو خود بھی بہت بڑے مناظر اور متکلم تھے اس انجمن کی سرپرستی فرمایا کرتے تھے۔ ہفتہ کے آخری دن جمعرات کو یہ محفل منعقد کیجاتی تھی۔
طلبہ کو دو ۲ فریق کر دیا جاتا تھا مسلم اور عیسائی، مسلم اور یہودی، مسلم اور آریہ سماجی، مُسلم اور قادیانی، مسلم اور دہری (بے دین) مسلم اور بدھ مت وغیرہ وغیرہ ہر ہفتہ طلبہ کو ایک موضوع دیکر تیاری کرنے کا اعلان کیا جاتا دوسرے ہفتے باضابطہ دونوں فریق میں بحث و مناظرہ کروایا جاتا اور پھر آخر میں صدر جلسہ فریقین کے دلائل پر تبصرہ کرتے اور فیصلہ دیا کرتے اور طلبہ کو تفہیم کرتے کہ بحث و مناظرہ میں کن کن امور کی رعایت رکھنی چاہیئے، یہ ایک ایسی مفید و مؤثر تدبیر تھی کہ فراغت علمی کے ساتھ طالب علم اسلام کے داعی اور مبلغ کی صفات لیکر مدرسہ سے رخصت ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں

جب یورپ کی عیسائی تحریک ٹوٹ پڑی اور اندرون ہند آریہ سماجی پنڈتوں نے شدھی کی تحریک چلائی (مسلمان کو ہندو بنانا) اور ایسے ہی دوسرے باطل فرقوں نے مسلمانوں کے خلاف سر اٹھایا اُس وقت انہی مدارس اسلامیہ کے علماء و طلبہ تھے جو پورے عزم و ثبات سے میدانِ عمل میں اُتر پڑے اور ساری باطل قوتوں کا مقابلہ کیا اور اسلام اور مسلمانوں کو ان کی یلغار سے بچا لیا۔

بحمداللہ میں بھی اس انجمن کا شریک تھا، جو بھی عنوان دیا جاتا ہفتہ بھر اس کی تیاری کر لیتا اور مجلسِ مناظرہ میں بے باک بولا کرتا تھا ایک ایسے ہی موقعہ پر "عصمتِ انبیاء کرام کا عنوان دیا گیا تھا (یعنی انبیاء کرام گناہوں سے معصوم ہوا کرتے ہیں) دوسری جماعت اس کے خلاف تھی میں اس جماعت میں تھا جو عصمتِ انبیاء کی حامی تھی

دونوں جماعتوں میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا مخالف فریق نے بڑے زور و شور سے یہ ثابت کیا کہ (حضرت) آدم (علیہ السلام) اگر معصوم ہوتے تو اُن سے خطا نہ ہوتی اور نہ وہ اللہ کے حکم کو توڑتے؟ اس بات کی شہادت خود آپ کا قرآن دے رہا ہے کہ

(حضرت) آدم (علیہ السلام) کو درخت کے قریب ہونے سے منع کیا گیا تھا لیکن وہ درخت کا دانہ کھا گئے۔

جواب دہی کیلئے میری باری تھی میں اسی لب و لہجہ میں بول پڑا جناب آپ دھوکہ کھائے ہیں یا دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ جنابِ عالی!

سیدنا آدم علیہ السلام نے نہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی اور نہ اسکا حکم توڑا۔ اللہ تعالیٰ نے تو سیدنا آدم علیہ السلام کو درخت کے قریب ہونے سے منع کیا تھا۔ درخت کا پھل کھانے سے منع نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ تھا۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ الآیۃ (اعراف آیت ۱۹)

اس درخت کے قریب نہ جانا و بس! کھانے کو کہاں منع کیا ہے ؟ چنانچہ سیدنا آدم علیہ السلام درخت کے قریب ہرگز نہیں گئے۔ اگر گئے ہوں تو قرآن ہی سے ثابت کرو کہ وہ درخت کے قریب چلے گئے۔ اگر ایسی کوئی آیت ہو تو پیش کرو ہم آپ کا دعویٰ قبول کرلیں گے۔

یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا، مزید دو چار سوال جواب کے بعد مناظرہ کا وقت ختم ہوگیا صدر جلسہ مولانا اسعد اللہ صاحبؒ اٹھے اور دونوں فریق کے دلائل پر تبصرہ کیا۔ پھر فرمایا کہ مولوی عبدالرحمٰن کی دلیل پر خصوصی تبصرے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ موصوف نے اہل سنت کی جانب سے نہایت کمزور بلکہ خطرناک قسم کی وکالت کی جس کو خود اُن کے اپنے بزرگ تسلیم نہیں کرتے اور نہ قرآن کا یہ مفہوم ہے جس کو موصوف نے بیان کیا ہے علاوہ ازیں عربی زبان کے لحاظ سے بھی یہ مفہوم غلط ہے۔

سیدنا آدم علیہ السلام کو جو حکم دیا گیا تھا لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (الآیۃ) اس کے معنیٰ تو یہی ہیں کہ کھانا تو درکنار قریب تک نہ ہونا لیکن سیدنا آدم علیہ السلام قریب بھی ہوئے اور دانہ بھی کھایا قرآن کی دیگر آیات بھی یہی مضمون بیان کرتی ہیں تو پھر آپ کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے درخت کے قریب ہونے سے منع کیا تھا کھانے سے منع نہ کیا تھا قَوْلٌ لَا یَرْضیٰ بِهِ الْقَائِلُ (ایسی بات جس کو کہنے والا خود تسلیم نہیں کرتا) نہیں تو اور کیا ہے ؟

دوسری بات اس سے زیادہ خطرناک ہے وہ یہ کہ آپ کی تقریر پر اگر آپ کا مخالف یہ کہے کہ جناب آپ کے قرآن میں زنا کرنے کی اجازت ہے کیونکہ قرآن نے لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (الآیۃ) کہا ہے یعنی زنا کے قریب نہ ہونا البتہ زنا کرسکتے ہو تو اس کا کیا جواب ہوگا ؟

اسی طرح قرآن نے کہا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ (الآیۃ) مالِ یتیم کے قریب نہ ہونا البتہ یتیم کا مال کھایا جاسکتا ہے۔ تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

اسی طرح قرآن میں آیا ہے وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ (الآیۃ) بُرے کاموں کے قریب نہ ہونا البتہ بُرے کام خوب کئے جاسکتے ہیں تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

اس طرح اور بہت سی آیات ہیں جو آپ کی تقریر پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

صاحبزادے جواب دہی میں جلد بازی نہ کرنا چاہیئے خاص طور پر میدانِ مناظرہ میں تو بہت ضبط و تحمل کی ضرورت پڑتی ہے اور تول تول کر جواب دینا پڑتا ہے ورنہ پیٹھ پھیرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا، اس کے بعد حضرت مولانا نے علم مناظرہ کی بڑی دلچسپ اور اہم نکات بیان فرمائی اور اپنی جوانی کا ایک واقعہ بیان کیا۔

(جیسا کہ گذشتہ اوراق میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ہندوستان کے ان چند نامی گرامی مناظرین میں شمار ہوتے تھے جو تقسیم ہند سے پہلے انگریزی دورِ حکومت میں غیر مسلموں سے بحث و مناظرہ سوال، جواب کے کئی ایک معرکہ سر کئے ہیں)

ارشاد فرمایا ضلع شاہجہاں پور (یو، پی) میں اہل سنت اور اہل بدعت (بریلی جماعت) کا ایک مناظرہ طے پایا۔ اہل سنت کی طرف سے مولانا ثناء اللہ صاحبؒ امرتسریؒ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری اور مولانا .... اور چوتھا میں تھا، شریک مناظرہ ہوئے۔

اہل بدعت کی جانب .... سے پنجاب کے نامی گرامی پیر صاحب (جن کا نام اب یاد نہ رہا) دوسرے مشہور مناظر مولوی حشمت علی صاحب بریلوی

اور ایک اور عالم صاحب مقابلہ پر آئے نظام مناظرہ کے تحت ہر مناظر کو ابتداءً دس دس منٹ کا وقت دیا گیا جس میں ہر ایک نے اپنا اپنا تعارف کروایا، اس سلسلے میں مولوی حشمت علی صاحب بریلوی کا نمبر آیا، موصوف بولنے میں بڑے بے باک تھے اہلِ سنّت کے مناظرین کا نام لے کر یوں مخاطب ہوئے۔

حضرات! یہ مولوی مرتضیٰ حسن جو اپنے آپ کو بہت بڑا مناظر سمجھا کرتے ہیں اس سے پہلے بارہا میرے مقابلہ میں آئے ہیں اور ہر بار میں نے ان کو نیچا دکھایا۔ آج پھر آئے ہیں۔ اور یہ مولوی ثناء اللہ غیر مقلد جو اپنے آپ کو محدّث اعظم سمجھا کرتا ہے کئی مرتبہ نیچا دیکھ چکا ہے۔ لیکن اِس کو شرم نہیں آتی آج پھر ہمّت کی ہے۔

اور یہ نوجوان چھوکرہ اسعد اللہ جس کے ایک گال میں دُودھ دوسرے میں شہد باقی ہے آج میرے مقابلہ کیلئے آیا ہے، ابھی ابھی معلوم ہو جائے گا کہ کون نیچا دیکھتا ہے؟ اس قسم کی پانچ دس باتیں اور کہہ کر بیٹھ گئے۔

اہلِ سنّت کے پہلے دونوں مناظرین نے بھی اپنا اپنا تعارف کروایا اسکے بعد میری باری آئی جب میں اسٹیج پر آیا تو مخالفین کی جانب سے مذاق اڑایا گیا اور تالیاں بجائی گئیں جب کچھ شور کم ہوا تو میں نے اپنے تعارف سے پہلے اس طرح خطاب کیا۔

حضرات! میں اپنا تعارف تو بعد میں کراؤں گا پہلے میں ایک حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں مولوی حشمت علی صاحب نے مولوی مرتضیٰ حسن صاحب کو ہمیشہ نیچا دکھایا ہے جس کی میں بھی تصدیق کرتا ہوں اور مولوی صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

مولوی ثناء اللہ صاحب کو بھی موصوف نے موقعہ بموقعہ نیچا دکھایا اس کی بھی

میں تصدیق کرتا ہوں اور مولوی ثناء اللہ صاحب کو بھی اسکا انکار نہیں ہے۔
اور آج میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اور آپ سب حضرات کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں کہ اگر آج مولوی حشمت علی صاحب نیچا دکھانے کی کوشش کریں گے تو خدا کی قسم میں ہرگز نہ دیکھوں گا اپنا منہ پھیر لوں گا۔ (شمالی ہند کی بول چال میں نیچا دکھانا گالی کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے) بس یہ کہکر میں بیٹھ گیا اس کے ساتھ ہی مجمع میں زبردست شور برپا ہوا آوازیں بلند ہونے لگیں، شرم، شرم کے نعرے اتنے بلند ہوئے کہ فضا گونج اٹھی، مناظرہ کا نظام درہم برہم ہو گیا، سارا مجمع مسلسل کہنے لگا ہم بھی نہ دیکھیں گے، ہم بھی نہ دیکھیں گے۔ ہرگز نہ دیکھیں گے۔ مولوی حشمت علی صاحب بریلوی اور ان کی پارٹی نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ مناظرہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ چنانچہ وہ جلسہ گاہ سے بڑبڑاتے نکل گئے۔
مناظرہ ختم ہو گیا، نفس موضوع پر بات تو کیا ہوتی یہ بھی اعلان نہ ہو سکا کہ آج بحث فلاں مسئلہ پر ہے۔
الغرض مولانا اسعد اللہ صاحبؒ نے اپنا یہ واقعہ بیان فرما کر ایک اہم مناظرانہ نکتہ ظاہر کیا کہ عام طور پر فریق مخالف اثنائے مناظرہ اپنے مقابل فریق کو غیظ و غضب میں لانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اپنی سنجیدہ غور و فکر سے محروم ہو جائے اس کے بعد اس کو مغلوب کر دینا بہت آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ دورانِ مناظرہ الزام تراشی، اتہام بازی حتیٰ کہ مقابل کے حسب و نسب پر بھی حملہ کر دیتا ہے تاکہ مقابل مشتعل ہو جائے اور اس سے صحیح اور درست جواب بن نہ پڑے جو حضرات فنِ مناظرہ کے ماہرین شمار کئے جاتے ہیں وہ کبھی بھی مشتعل نہیں ہوتے اور مخالف کی ہر کڑوی و ٹیڑھی بات سے صرفِ نظر کر جاتے

ہیں ایسے وقت اِن کا صبر و تحمل مخالف کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے اور پھر مخالف کی تدبیر اُلٹی پڑ جاتی ہے۔

عزیز طلبہ تم کو آیندہ عملی زندگی میں ایسے امور سے سابقہ پڑے گا میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ کسی بھی مرحلہ پر ضبط و تحمل کو جانے نہ دینا، دعوت و تبلیغ کی انجام دہی میں یہ بات اساسی حیثیت رکھتی ہے۔

بہر حال یہ تھا انجمن ہدایت الرشید کا مختصر تعارف جس نے ہمیں تبلیغی زندگی کیلئے بہت کچھ سرمایہ فراہم کیا، اللہ اس کے بانیوں کو جنّت الفردوس کے اعلیٰ مناصب عطا کرے۔ آمین

ایک مخلص کا خفیہ تعاون

جیساکہ گذشتہ اوراق میں لکھا گیا میری اعلیٰ تعلیم کا آغاز وانجام مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک رہا، اس طویل عرصہ میں جہاں والد مرحوم اور بڑے بھائی لطیف ساجد مرحوم کا گرانقدر تعاون رہا وہاں شہر حیدر آباد کے محلّہ ریڈ ہل (لال ٹیکری) کے ایک گمنام بزرگ مولوی سردار علی صاحب مرحوم کا ماہانہ تیںن روپے والا تعاون بھی قابلِ ذکر ہے اور طلبۂ علم دین کا تعاون کرنے والے مخلصین کے لئے باعثِ تقلید بھی۔

موصوف دَورِ نظام شاہی میں وظیفہ حُسن خدمت پر علیحدہ ہوگئے تھے اور زہد و قناعت کی زندگی بسر کر رہے تھے مرحوم کو کسی طرح میری معاشی حالت کا علم ہوا مجھ کو خط لکھا کہ میں لوجہ اللہ ماہانہ تین روپیوں سے آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اس کو قبول کیجئے اور براہِ کرم میری حیات تک اس خدمت کو ظاہر نہ ہونے دیں؟

عجیب مخلصانہ گذارش تھی میں نے اس کو تبرّک خیال کیا اور قبول کرلیا۔

ہر ماہ مقررہ تاریخ پر تین روپیوں کا منی آرڈر آتا رہا ، اللہ اللہ مبالغہ کی بات نہیں حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں کہ ان تین روپیوں میں ایسی برکت دیکھی ہے جو بڑی بڑی رقم میں اہل دنیا نے نہ پائی ہوگی ، ہر ماہ سرکاری خزانے سے اپنا وظیفہ لے کر منی آرڈر کئے بغیر اپنے گھر نہیں آتے ۔ حسب ہدایت مرحوم کی زندگی تک اس خصوصی تعاون کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا ۱۹۷۹ء میں انتقال فرمایا ۔ اللہ ان سب معاونین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مناصب نصیب کرے ۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منظور احمد نعمانی

زمانہ طالبعلمی میں جیسے بزرگوں کی خدمت کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا ایسے ہی ان حضرات کی کبھی کبھی دعوت کرنا بھی پسندیدہ عمل تھا دعوت کیا ہوتی چند پیسوں کی دو ایک چیزیں لے آتا اور ان حضرات کی تواضع کر دیتا یہ حضرات اپنی اعلیٰ ظرفی اور طلبہ نوازی کے جذبے سے یہ زحمت قبول فرما لیتے اور دعائیں دیتے ایسے ہی ایک موقع پر مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منظور نعمانی سہارنپور آئے یہ دونوں حضرات اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری سے ملاقات کیلئے وقتاً فوقتاً سہارنپور آیا کرتے تھے چند گھنٹے مدرسہ مظاہر علوم میں قیام کر کے قصبہ رائے پور تشریف لیجاتے اسی طرح واپسی پر بھی چند گھنٹے مدرسہ میں قیام فرماتے اور اس عرصے میں ہمارے استاذ حدیث مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث کے مہمان ہوتے ہیں نے ایک دن ان دونوں کی چائے پر دعوت کر دی دعوت قبول ہو گئی بازار سے دو آنے کے پاپے (سہارنپور کے خاص بسکٹ) خریدے اور چائے بنائی بس دعوت کا انتظام ہو گیا ، دونوں مہمان تشریف لائے دسترخوان کی سادگی پر انھیں وہ

وہ لطف آیا جو بھرپور دسترخوان پر نہ دیکھا گیا ہو، بڑے مزے لے لے کر چائے فرماتے رہے۔ اس خوشگوار ماحول سے میں نے فائدہ اٹھایا اور مولانا علی میاں صاحب سے ایک سوال کر دیا۔

مولانا! عربی بولنا اور لکھنا کس طرح آتا ہے؟ (یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے مولانا علی میاں صاحب ایک کامیاب ادیب اور مشہور زمانہ مصنّف ہیں)

میرے سوال پر مولانا مُسکرا دیئے اور فرمایا اسی طرح جس میں آپ اس وقت مشغول ہیں (یعنی تحصیل علم میں جدوجہد سے) میں خاموش ہو گیا، مولانا نے میری عدم تسلّی کو محسوس کیا فرمایا جواب تو یہی ہے۔ البتہ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ایک ہزار صفحات کا مطالعہ کرنے سے ایک صفحہ لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اس بات پر میرے تعجب کو محسوس کیا فرمایا غالباً آپ یہ سمجھتے ہوں کہ ایک ہزار صفحات کے مطالعہ کے بعد آپ ایک صفحہ لکھ دیں گے؟

میں نے کہا جی ہاں! فرمایا جی نہیں میں صلاحیت اور قدرت کی بات کر رہا ہوں لکھنے کی نہیں اور یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ آپ لکھنے کے کب قابل ہونگے؟ بس مطالعہ جاری رکھئے بات ختم ہو گئی۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی خاموش اپنے کام میں مشغول تھے (یعنی چائے نوشی) میں نے انھیں بھی چھیڑا عرض کیا مولانا مجھکو علم مناظرہ سے دلچسپی ہے، مناظرہ کے بارے میں کچھ ہدایات فرمایئے؟ (مولانا محمد منظور صاحب نعمانی علم مناظرہ کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں، انگریزی دَور میں ان کی بیش بہا خدمات رہی ہیں باطل فرقوں سے کامیاب مقابلے کئے ہیں اپنی ساری جوانی اسی کام میں صرف کی ہے) میری درخواست پر مولانا اچانک کھِل پڑے فرمایا یہ حقیقت ہے کہ میری جوانی اسی کام میں صرف ہوئی ہے۔ عمر عزیز کے تیئس سال باطِل فِرقوں سے مناظرہ کرنے میں ختم ہوئے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان

میں اعلان عام کر چکا تھا کہ عیسائی، یہودی، آریہ سماجی، قادیانی غرض کوئی بھی فرقہ اسلام یا اہلِ اسلام کو چیلنج کرے تو لکھنؤ دیو، پی ، تار کر دیا جائے اندرون پندرہ منٹ گھر سے نکل پڑتا تھا۔ خارجی ضرورتوں کے علاوہ خانگی تقاضے اور سردی، گرمی بارش، طوفان، بیماری دُکھ دَرد غرض کوئی عذر بھی مجھکو باز نہ رکھتا تھا، بے شمار معرکہ سر کیئے۔ غیر مُسلموں سے ہٹ کر اندرون خانہ گمراہ فرقوں سے بھی نبرد آزمائی رہی۔ اہل سنّت کو ہر جگہ غلبہ نصیب ہوا۔ بہرحال جو ہونا تھا، سو ہو گیا، لیکن اب میں دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ موجودہ دَور میں تبلیغ کے لیئے مناظرہ کا میدان اختیار نہ کیا جائے۔ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔ مناظروں سے بہت کم لوگوں کو ہدایت ملی ہے۔ البتہ موقتی طور پر فتنہ ضرور دب جاتا ہے۔ اس لیئے صاحبزادے میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ موجودہ زمانے میں تبلیغ اسلام کے لیئے کوئی مثبت کام اختیار کیا جائے یہ کام جہاں پُر امن ہے پُر نفع بھی ہے البتہ علم مناظرہ کی ضرورت اپنی جگہ مسلّم رہے گی۔ اس مختصر گفتگو کے بعد دعوت کا وقت ختم ہو گیا اور دونوں مہمان دعائیں دیتے رخصت ہو گئے۔

شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباری

یہ دونوں بزرگ جامعۃ الازہر (مصر) کے ممتاز اساتذہ عربی ادب اور فلسفۂ اسلامی کے ماہرین میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ حکومتِ مصر کی جانب سے ثقافت اور اسلامی تہذیب و تمدّن کی نشر و اشاعت کے لیئے دارالعلوم روانہ کیئے گئے تھے۔ ان علماء کا دارالعلوم دیوبند میں دو سال قیام رہا، اعلیٰ جماعت کے طلبہ کو عربی ادب (تحریر و تقریر) کا درس دیا کرتے تھے۔ درسِ نظامی (ہندوپاک کے دینی مدارس کا نصاب تعلیم) میں جہاں سینکڑوں خوبیاں ہیں وہاں ایک کمی ہر زمانے میں یہ محسوس کی جاتی رہی ہے کہ اس کے

فارغین میں عام طور پر برجستہ عربی بولنے لکھنے کی استعداد ناتمام رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نصابِ تعلیم کا عیب نہیں بلکہ نصابِ تعلیم کے مقاصد میں تحریر وتقریر کو شامل نہیں رکھا گیا۔ لِكُلِّ قَوْمٍ مَقَاصِدُ۔

چونکہ عربی تحریر وتقریر بھی اشاعتِ دین میں ممدّ ومعاون رہی ہے اس لئے دارالعلوم دیوبند نے حکومتِ مصر کی اس مخلصانہ پیشکش کو قبول کرلیا، یہ دونوں اساتذہ مدرسہ کے خارجی اوقات میں عربی ادب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ طلبہ کی کثیر تعداد استفادہ کرتی تھی لیکن مظاہرِ علوم (سہارن پور) جہاں میرا قیام تھا ایسا کوئی انتظام نہ تھا میں کبھی کبھی اپنے بعض دوستوں کے ساتھ دیوبند چلا جاتا تو ان مصری علماء سے ملاقات کے لئے ان کے گھر بھی جایا کرتا تھا۔ ایک ایسے ہی موقعہ پر ہم شیخ عبدالمنعم کے گھر پر موجود تھے اندرونِ خانہ سے ان کی کمسن لڑکی (ڈھائی سالہ) تیزی سے دوڑتی شیخ کے پاس آئی اور ہم کو دیکھ کر درمیانِ راہ رُک گئی۔ شیخ نے بلند آواز سے کہا تَعَالِیْ یَا عَزِّیْ تَعَالِیْ۔ (عزّی بچّی کا نام تھا) پھر جب وہ قریب آئی تو سب کو سلام کیا، شیخ نے ہم سے کہا کہ ہماری اس بچّی نے اُردو بولنا سیکھ لیا ہے پھر بچّی سے کہا۔ یَا عَزِّیْ قُوْلِیْ کَیْفَ تَقُوْلِیْنَ اُرْدُوِیَّہ۔ پھر کیا تھا وہ نان اسٹاپ اُردو کی موٹی موٹی گالیاں بولنے لگی، ہم حیران ہوگئے۔ لیکن شیخ بہت خوش ہورہے تھے کہ ماشاء اللہ کس روانی سے اُردو بول رہی ہے۔ میں نے کہا شیخ یہ تو اُردو زبان کی فحش گالیاں ہیں۔ اس کو کس نے سیکھا دیا ہے؟ اس پر شیخ کو بھی بہت تعجب ہوا کہنے لگے پڑوسی بچّوں کے ساتھ دن رات کھیلتی ہے ان کی بول چال سیکھ لیا ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝

الغرض میں اس ملاقات میں ان مصری علماء سے یہ گذارش کرنا چاہتا تھا کہ

اپنی خصوصی سفارش سے کسی بھی طرح مجھکو جامعۂ ازہر (مصر) میں داخلہ دلوایا جائے جامعۂ ازہر کی عالمی شہرت سے میں خوب واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ رازیؒ غزالیؒ جیسے آفتاب و ماہتاب اسی درسگاہ کے فیض یافتہ ہیں میں نے ان حضرات سے اپنی اس دیرینہ خواہش کا اظہار کر دیا، شیخ عبدالمنعم مسکرادیئے پوچھا آپ جامعۂ ازہر میں کیوں پڑھنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا حدیث و تفسیر و فقہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

اس پر اپنے رفیق شیخ عبدالعال کی طرف متوجہ ہوئے کہنے لگے دیکھئے اس لڑکے کا کتنا اونچا مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے جامعۂ ازہر میں پڑھنا چاہتا ہے۔

پھر میری جانب متوجہ ہوئے فرمایا صاحبزادے حدیث و تفسیر کی تعلیم یہاں دارالعلوم دیوبند میں جس اعلیٰ پیمانے پر دی جاتی ہے وہ تو دنیائے اسلام کے کسی بھی ملک میں اس کی مثال نہیں ہے آپ اپنے مقصد کیلئے اعلیٰ ترین مدرسہ میں آچکے ہیں اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر آپ کو عربی ادب، اسلامی فلسفہ، تاریخ و سیرت اور دیگر علوم اسلامی کی خواہش ہو تو جامعۂ ازہر اس کے لئے بہترین درسگاہ ہے ہم آپ کی خواہش پوری کر دیں گے۔

فرمایئے آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا نہیں نہیں میرا مقصد تو وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ بات ختم ہوگئی، اللہ اکبر، دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور اور اس جیسے مدارس کے بارے میں غیر ملکی اہل عرب خاص طور پر جامعۂ ازہر کے ممتاز اساتذہ کا یہ تبصرہ کچھ خوش عقیدگی یا وضع داری کی بنیاد پر نہ تھا اور نہ یہ موقعہ ان کے خیر مقدم و استقبال کا تھا اور نہ کسی خاص

6

عنوان کے تحت انھیں زحمتِ کلام دی گئی تھی، یہ ایک خالص نجی گفتگو تھی اور وہ بھی ایک غیر معروف طالب علم کے ساتھ جو ابھی تحصیل علم کی منزل بھی طے نہ کی ہو۔ جامعہ ازہر کے ان ممتاز علماء کرام کی اس گفتگو سے جہاں مجھے سکون و اطمینان ملا وہاں اپنے مدرسہ اور اپنے اساتذہ کرام کی عظمت و اہمیت سے دل سرشار ہوگیا۔ میں ہی کیا بہت سے لوگ ابھی تک اس حقیقت سے ناآشنا تھے کہ ہمارے اکابر نے ہندوپاک میں دینی مدارس کا جو سلسلہ جاری کیا ہے وہ دنیائے اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے۔ قرآن فہمی اور حدیث دانی کا جو معیار ان مدارس میں ملتا ہے وہ اہلِ عرب کیلئے بھی قابلِ رشک اور باعثِ افتخار ہے۔

شیخ عبد المنعم النمر کے اس اظہار خیال کے بعد ایک اور شہادت بھی سننے میں آئی، جدہ (سعودی عرب) کی جس مسجد میں امامتِ صلوٰۃ میرے سپرد ہے اس مسجد میں مقامی عالم شیخ احمد سالمی کا ہر روز بعد مغرب درسِ حدیث و تفسیر ہوا کرتا ہے۔ ایک دن اثنائے درس اُن کی زبان سے یہ کلمات نکل پڑے۔

قرآن حکیم مکۃ المکرمہ میں نازل ہوا، پڑھا گیا مصر میں اور سمجھا گیا ہندوستان میں

اگرچہ میں درس میں شریک نہ تھا قریب ہی بیٹھا اپنے تالیفی کام میں مشغول تھا شیخ احمد کے یہ کلمات میری توجہ کو کھینچ لئے، بعد فراغتِ درس میں نے شیخ احمدؒ سے دریافت کیا،

شیخ کیا یہ بات ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ نے بیان کیا؟

فرمایا ہاں عام طور پر ایسے ہی کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ ہم جب ہندوستان میں تھے تو یہی بات علی الاعلان

کہدیا کرتے تھے سعودی عرب آنے کے بعد اظہار کرنا تو درکنار خیال بھی نہیں آتا تھا لیکن یہاں اپنوں میں نہیں اہل عرب سے سننے کے بعد تو ہمارے علمار کرام اور مدارس دینیہ کی عظمت پھر تازہ ہوگئی۔

الغرض میں مبعوث الازہر شیخ عبدالمنعم النمِرؒ کی گفتگو نقل کر رہا تھا یہ واقعہ ۱۹۵۸ء کے قریب زمانے کا ہے۔ مصر کے یہ دونوں استاذ کبھی کبھی ہمارے اُستاذ شیخ الحدیث مولانا محمدؐ زکریا صاحبؒ سے ملاقات کیلئے سہارن پور بھی آیا کرتے تھے ایک ایسی ہی ملاقات میں میں نے موقعہ پاکر اپنی پہلی تالیف جو "قصص الحدیث" کے عنوان پر مرتب کی تھی شیخ عبدالمنعم کو دکھائی (جو غیر مطبوعہ تھی)

شیخ عبدالمنعم نے نہایت حیرت اور مسرت سے اس کا استقبال کیا اور چیدہ چیدہ اوراق پر نظر ڈالی پھر اپنے رفیق شیخ عبدالعال العقباوی کو دیا اور فرمایا دیکھو یہ لڑکا اپنی اس کم عمری میں کتنا اچھا کام انجام دیا ہے اور کیسا نفیس انتخاب ہے۔ شیخ عبدالعال نے بھی غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا اور دُعا دی۔ پھر شیخ عبدالمنعم النمر سے کہا کہ اس طالب علم کی ہمت افزائی کیلئے چند کلمات بھی لکھدو چنانچہ کتاب کے مسوّدہ پر بطور تقریظ اس طرح تحریر کیا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمدُ لله ربّ العٰلمين والصّلوٰة والسّلام علیٰ نبيه الكريم وآله وصحبه والتابعين۔ وبعد، فقد اطلعت علیٰ ماجمعهٗ اخونا عبد الرحمٰن اشرف الحيدرآبادی من مختلف الاحاديث ذات الاتجاه القصصی الوعظی وَاعجبت باتجاهه وبالمجهود الذی بذله فی جمع هذه الاحاديث

وتدوینها مما یدل علیٰ اتجاه حسن وباکورة طیبة أرجو
ان یثمر ثمرًا مبارکًا علی مر الأنام واللہ اسأل ان ینفع
به الاسلام والمسلمین ۔ آمین

عبد المنعم النمر

مبعوث الازھر والمؤتمر الاسلامی

فی الھند

۱۲/۲/۱۹۵۸ء

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ واقعہ ۱۹۵۸ء کے اوائل کا ہے اس واقعہ سے ٹھیک (۲۳) سال بعد ۱۹۸۱ء میں اسلامی ممالک کی سیر وسیاحت کے ضمن قاہرہ (مصر) جانے کا اتفاق ہوا (تفصیلات آئندہ صفحات میں مطالعہ کیجئے) شہر قاہرہ میں جامعہ ازہر کی پہلی زیارت رہی، مفتیٔ ازہر شیخ کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ کرام سے بھی ملاقات رہی اور ازہری تعلیم نظام پر بھی معلومات حاصل کئے۔ رازی، غزالی کی جائے نشست بھی عقیدت کی نگاہوں سے دیکھی، ایک استاذ سے مبعوث الازہر شیخ عبد المنعم النمر کا تذکرہ اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو معلوم ہوا کہ شیخ آجکل وزارتِ امور مذہبی کے وزیر ہیں اور بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں، ملاقات کیلئے قبل از وقت اجازت لینی ضروری ہے لیکن وہ اس وقت بیرون ملک دورے پر تھے۔ ملاقات کا امکان نہ تھا۔ اگر وہ شہر میں موجود ہوتے تو میں کسی بھی وقت اُن کے پاس چلا جاتا یہ میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ قدّر اللہ ما شاء

درس وتدریس کا اہتمام

ہمارے مدارسِ اسلامیہ کی خصوصیات میں درس و تدریس کا اہتمام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

درس کا آغاز ماہِ شوال سے ماہ شعبان (گیارہ ماہ) میں اختتام پذیر ہوتا ہے ان گیارہ مہینوں میں چھٹیوں یا تعطیلات کا کوئی نظام نہیں ملتا، البتہ عید الاضحیٰ چونکہ درمیان سال آجاتی ہے اس لئے ان دنوں تین چار یوم کی چھٹی ہوجاتی ہے اس کے علاوہ نہ موسم سرما کی چھٹیاں نہ گرما کی تعطیلات، دیگر چھٹیوں کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، طلبہ سال بھر ہمہ تن تعلیم میں مشغول رہتے ہیں، انھیں یہ احساس تک ہونے نہیں پاتا کہ باہر کی دُنیا میں کیا کیا حوادث، انقلابات اور غیر معمولی واقعات پیش آرہے ہیں، اوقات کی پابندی، تعلیم کا اہتمام ان مدارس کی امتیازی علامت رہی ہے۔

پہلی حکایت بیرونِ خانہ کی بات نہیں اندرونِ خانہ کی ایک حکایت میری چشم دید حکایت ہے ہمارے اساتذہ میں علم اصول فقہ کے استاذ مولانا اکبر علی صاحبؒ تھے (جو ۱۹۵۷ء کے بعد مظاہر علوم سہارنپور چھوڑ کر دارالعلوم کورنگی (کراچی) منتقل ہوگئے تھے) موصوف کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ پورا گھنٹہ درس میں مشغول رکھتے تھے کسی بھی درس میں نہ ابتدائی تاخیر کرتے اور نہ وقت سے پہلے اختتام کرتے، صبح کے چار گھنٹے اسی شان سے تکمیل پاتے پھر شام کے تین گھنٹے بھی اسی طرح گزرتے۔

ایک دن حسب معمول درسگاہ تشریف لائے اسی نہج پر صبح کا درس مکمل کیا وقت سے صرف آدھا گھنٹہ پہلے درس برخواست کیا اور غمزدہ آواز میں طلبہ سے معذرت چاہی فرمایا رات میری لڑکی کا انتقال ہوگیا آپ سب اس کے لئے دُعائے مغفرت کریں، غسل وکفن کا انتظام ہوچکا ہوگا۔ مجھے درس برخواست کرنے کی اجازت دیجئے۔ یہ کہہ کر اُٹھ گئے۔ اللہ اکبر کبیرًا بے ساختہ ہماری چیخیں نکل گئیں کہ ہم یہ کیا سُن رہے ہیں؛ استاذ محترم یہ

کہتے ہوئے سیدھے اپنے گھر پہنچے ہم بھی کتابیں رکھکر دوڑ پڑے دیکھا کہ جنازہ تیار رکھا ہے مدرسہ کے اساتذہ بھی آگئے ہیں اور محلّے کی لوگ بھی جمع ہیں تھوڑی دیر میں جنازہ روانہ ہوا سوگوار فضا میں قبرستان پہنچے اور تدفین عمل میں آئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

اس حادثے کے تقریباً (۳۵) سال بعد ۱۹۹۰ء جدّہ (سعودی عرب) میں حضرت استاذ مرحوم کے ایک صاحبزادے سے ملاقات ہوئی اثنائے گفتگو حضرت استاذ مرحوم کی صاحبزادی کا وہ واقعہ میں نے بیان کیا، موصوف نے مزید یہ کہا کہ ہماری یہ بڑی ہمشیرہ اٹھارہ بیس سالہ عمر کی تھیں والد صاحب مرحوم انھیں بیحد چاہتے تھے وہ عالمہ بھی تھیں، شادی کی تیاریاں مکمل ہوگئیں تھیں انھیں دنوں ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ میں ان دنوں آٹھ دس سال کا تھا مزید تفصیلات یاد نہیں۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّاحِمِیْنَ ٥

دوسری حکایت جیسے یہ میرا چشم دید واقعہ تھا ایسے ہی مظاہر علوم سہارنپور کے ناظمِ اعلیٰ استاذ محترم مولانا عبداللطیف صاحب رح کی وفات کا واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ اس وقت ناظمِ مدرسہ ہی نہ تھے استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے مظاہر علوم سہارنپور کا کوئی استاذ ایسا نہ تھا جو آپ کا شاگرد یا شاگرد کا شاگرد نہ ہو، اپنی طبعی عمر میں انتقال فرمایا، مدرسہ حسب معمول جاری تھا ممکن ہے اساتذہ حضرات کو اس کا علم ہو لیکن طلبہ اس حادثے سے لاعلم تھے۔ صبح کا پہلا تعلیمی دور ختم ہوا، اختتامِ درس کے بعد مدرسہ میں اعلان کیا گیا کہ حضرت ناظم صاحب کا رات انتقال ہوچکا ہے جنازہ تیار ہے جو طلبہ صلوٰۃ جنازہ میں شرکت کرنا چاہیں جلد از جلد حضرت ناظم صاحب کے گھر پہنچیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ٥ طلبہ دوڑ پڑے جنازہ تیار تھا

آناً فاناً قبرستان روانہ ہوا۔ آدھے پون گھنٹے میں علم وفضل کا یہ آفتاب و مہتاب سپردِ خاک کردیا گیا۔ طَيَّبَ اللّٰهُ ثَرَاهُ وَاَسْكَنَهُ فَسِيحَ جَنَانِهِ۔

شام میں حسبِ معمول مدرسہ کی سرگرمیاں جاری ہوگئیں۔ درس وتدریس کا یہ اہتمام نادر نہ سہی عجائبِ عالم میں یقیناً شمار ہوگا۔ ہمارے مدارس کا یہ مزاج کوئی اتفاقی یا مؤقتی مزاج نہ تھا اور نہ یہ کسی خاص مدرسہ کی خصوصیت رہی ہے بلکہ ایک عام روایت تھی جو ان مدارس میں جاری وساری رہی ہے کہ درس وتدریس میں کوئی خلل بھی برداشت نہیں کیا جانا چاہئے۔

یہ مدارس حوادثِ زمانہ سے متأثر ہوکر اپنا مرکزی کردار ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، تعلیم وتبلیغ کا نظام برابر جاری رہتا یہی وجہ ہے کہ جس نے بھی ان مدارس سے کامل وابستگی قائم رکھی وہ محروم نہ ہوا علوم ومعارف کے ابواب تک جا پہنچا۔

بہرحال میرے دورِ طالبعلمی سے یہ دو واقعات نے جہاں علم کی منزلت کو اجاگر کیا وہاں مقصد کے حصول کیلئے راہ نما اصول بھی فراہم کئے ہیں۔

تعلیم کا آخری سال

ہمارے نصابِ تعلیم کا آخری سال "دورۂ حدیث" کہلاتا ہے جو عام طور پر نصاب کا نواں سال ہوا کرتا ہے اس سے پہلے آٹھ سال میں دیگر علوم وفنون کی کتابیں ختم ہوجاتی ہیں اس آخری سال میں صرف علمِ حدیث کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

ان کتابوں میں

بخاری[1] شریف، مسلم[2] شریف، ترمذی[3] شریف، ابوداؤد[4] شریف

نسائی[5] شریف، ابن[6] ماجہ شریف

ان کے علاوہ طحاوی[7] شریف، مؤطا امام[8] مالکؒ، مؤطا[9] امام محمدؒ

شمائل ترمذی، کتاب[۱] حدیث مسلسلات،
احادیث صحیحہ کا یہ وہ عظیم ذخیرہ ہے جس پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہو جاتی ہے۔

ان سطور کے قارئین کو یہ حقیقت حیرت و استعجاب میں ڈال دیگی کہ صرف ایک سال میں ان کتابوں کو اوّل سے آخر تک حرفاً حرفاً ختم کروا دیا جاتا ہے ایسے طور پر کہ ایک حدیث بھی متروک نہ ہو ہر کتاب میں ہزارہا ہزار احادیث ہوتی ہیں صرف ایک کتاب بخاری شریف میں ہی ہزارہا ہزار احادیث ہیں۔

ایک قابلِ فخر دوست

میرے ایک دوست قاری[۱] ولی اللہ الہ آبادی نے دورۂ حدیث کے آخری دن اپنی ایک بات کا اظہار کر کے اپنے سب دوستوں کو حیرت و رشک میں ڈال دیا۔
کہنے لگے آج میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ ذخیرۂ احادیث کی کوئی ایک حدیث ایسی نہیں جس کو میں نے پڑھا نہ ہو یا سنا نہ ہو۔
جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکرہ بالا کتابوں کی تمام احادیث پڑھی ہیں یا سُنی گئیں کوئی حدیث پڑھنے یا سننے سے رہ نہ گئی، اللہ اکبر درسگاہ حدیث کا یہ معمول ہے کہ طالب علم احادیث کی تلاوت کرتا ہے اور استاذ اسکی تفہیم و تشریح کرتے ہیں ابتدائے سال میں تو ہر طالب علم کی یہ کوشش رہتی کہ وہ بھی تلاوت کرے چنانچہ سب نہیں اکثر طلبہ کو حدیث تلاوت کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔
لیکن پہلی سہ ماہی کے بعد صرف دو چار طلبہ ہی یہ منصب حاصل کر لیتے ہیں اور پھر ختم سال تک تلاوتِ حدیث کی سعادت انھیں کے نصیب ہو جاتی، ان طلبہ

---

[۱] موجودہ امام و خطیب مسجد النور، نشان پارہ روڈ چار نل ڈونگری (بمبئی)

میں جہاں قاری ولی اللہ صاحب شامل ہیں۔ راقم الحروف بھی شامل تھا۔

بہر حال قاری ولی اللہ صاحب نے اپنی جس حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ ایسے ہی واقعہ ہے۔ سال بھر کے ایام کچھ مختصر وقت کے نہیں ہوتے، اس طویل عرصے میں حرج مرض سب ہی کو پیش آتے ہیں قاری صاحب کو بارہا دیکھا گیا کہ جب وہ بیمار ہوتے یا کسی عذر میں مبتلا ہوتے تو لحاف، چادر لپیٹ لپٹا کر درس گاہ کے ایک کونے میں بیٹھ جاتے اور احادیث کی تلاوت سماعت کرتے اسطرح عذر و بیماری میں بھی کوئی حدیث سننے سے متروک نہ ہو سکی۔

تقبّل اللہ منّا و منھم جمیع الخیرات والحسنات انہ سمیع مجیب

طالب علم کی نظر و فکر

جیسا کہ اوپر لکھا گیا نصاب تعلیم کا آخری سال "دورۂ حدیث" کہلاتا ہے ہماری اس جماعت میں چھیاسی (۸۶) طلبہ شریک تھے ان میں ہر عمر کے طلبہ تھے جماعت کے سب سے زیادہ عمر والے طالب علم مولوی ظفیر الدین صاحب تھے جن کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی۔ دوسرے سب سے کم عمر طالب علم مولوی محمد یونس صاحب تھے جن کی عمر پندرہ سولہ سال تھی یہ ضلع بجنور (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے سال کے آخری ایام میں ایک حدیث یہ بھی پڑھنے میں آئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ والے دن فجر کے وضو سے عشاء کی نماز ادا کی یعنی دن کی پانچوں نمازیں صرف ایک ہی وضو سے ادا فرمائی (الحدیث)

دوسرے دن بعد نماز عشاء مولوی محمد یونس صاحب نے ہم سے کہا الحمد للہ میں نے آج اس سنّت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زندہ کیا ہے میں نے بھی آج فجر کے وضو سے عشاء کی نماز ادا کی ہے، ہم سب حیران رہ گئے کہ اس چھوٹے طالبعلم کی نظر کہاں تک جا پہنچی اس واقعہ کے تقریباً چونتیس ۳۴ سال بعد ۱۹۹۰ء میں

مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے مہمان خانے میں موصوف سے اچانک ملاقات ہوگئی مختصر تعارف کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملے اور یادِ ماضی کا دیر تک تذکرہ رہا۔ بحمد اللہ اس وقت وہ کسی دینی مدرسہ کے شیخ الحدیث ہیں۔

ختمِ بخاری شریف

کتب حدیث میں بخاری شریف کو خصوصی حیثیت حاصل ہے ویسے بھی یہ کتاب محدثین کی زبان میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ" (قرآن حکیم کے بعد صحیح ترین کتاب) کہلاتی ہے مدارسِ دینی میں اس کتاب کے پڑھانے والے کو عموماً شیخ الحدیث کہا جاتا ہے جو علومِ حدیث میں ممتاز حیثیت کا حامل ہوتا ہے زمانۂ قدیم سے اس کا درس اسی شان سے جاری رہا ہے جس کو ہزار سال سے زائد عرصہ ہو رہا ہے۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور دار العلوم دیوبند میں بخاری شریف جس تحقیق و اہتمام سے پڑھائی جاتی ہے عالمِ اسلام میں اس کی مثال شاذ و نادر ہی ہوگی۔

گزشتہ اوراق میں آپ نے جامعۂ ازہر (مصر) کے اساتذہ کا تبصرہ پڑھ لیا ہے ہمارے درسِ بخاری کے استاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ تھے۔ جن کی حدیث دانی، حدیث فہمی اور خدمت فی الحدیث کے شہرۂ آفاق تذکرں نے ان کے اصلی نام کو وصفی نام "شیخ الحدیث" ہی کے وصف سے مشہور کر دیا ہے۔ ملت میں ایسے بہت کم افراد ہوئے ہیں جن کے اصلی نام پر وصفی نام غلبہ پا گیا ہو۔

حضرت شیخ الحدیث کا درس بخاری روزانہ شام میں مسلسل دو گھنٹے ہوا کرتا تھا اور یہ دو گھنٹے نہایت مشغول ترین ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ اوراق میں لکھا ہے۔ مدرسہ مظاہر علوم کے اساتذہ کی کتابی تقریریں نہایت جامع اور مختصر ہوا کرتی تھیں، حضرت شیخ الحدیث ان میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

بخاری شریف کی احادیث پر تقریر فرما کر اپنا آخری فیصلہ "چکّی کا پاٹ" کے عنوان سے دیدیا کرتے پھر آگے کا مضمون شروع فرماتے۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث کے اختلافی مضمون پر شیخ الحدیث کا اپنا ذاتی رجحان ایسا بھاری ہوا کرتا تھا کہ اسکو انھوں نے "چکّی کا پاٹ" قرار دے لیا تھا، وزن اتنا کہ سب اقوال پر بھاری ہوجائے مضبوط اتنا کہ ٹوٹنے نہ پائے۔

اللہ تعالیٰ انھیں اعلیٰ علیّین کے بلند درجات نصیب کرے، بڑے ہی نصیب والے تھے۔ بہرحال میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ زمانۂ قدیم سے دُرس بخاری شریف کا خاص اہتمام رہا ہے اور خاص طور پر اس کے اختتام والے دن مزید اہتمام کا دستور چلا آرہا ہے۔

محدّثین کرام کے یہاں یہ روایت "کَابِرًا عَنْ کَابِرٍ" چلی آرہی ہے کہ بخاری شریف کے اختتام پر دُعا قبول ہوتی ہے اور اس کا انھوں نے بارہا تجربہ کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدارس میں ختم بخاری شریف کے دن عامۃ الناس کا ہجوم ہوجاتا ہے سال کے آخری دنوں میں اہل شہر طلبہ سے مسلسل رابطہ قائم رکھتے ہیں تاکہ معلوم کریں کہ کس دن بخاری شریف کا اختتام ہوگا۔ اور پھر وہ دُعا میں شرکت کرسکیں۔

لیکن ہمارے شیخ الحدیث عامۃ الناس کو ایسا موقعہ بہت ہی کم دیا کرتے تھے حتّٰی کہ طلبہ کو بھی واضح طور پر یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ حضرت شیخ کس دن اختتام کرنے والے ہیں۔ بس طلبہ اپنے اپنے اندازوں پر اہل شہر کو اطلاع دیدیا کرتے تھے۔ یہ شیخ الحدیث کا اپنا مخصوص مزاج تھا وہ ہجوم اور شہرت سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ اور عملاً بھی اس کی صورتیں اختیار فرماتے تھے۔ مدرسہ

مظاہر علوم کا محلِ وقوع بھی مسلم اکثریت محلہ میں تھا معمولی سی اطلاع پر سینکڑوں مسلمان جمع ہو جایا کرتے۔

ہمارے ختم بخاری شریف کے دن بھی ایسے ہی ہوا ہم کو خود اندازہ نہ تھا کہ آج بخاری شریف کا اختتام ہوگا۔ شیخ الحدیث نے درس کے پہلے مرحلے میں تو عام رفتار ہی سے درس کا سلسلہ جاری رکھا لیکن جوں جوں وقت قریب ہوتا گیا رفتارِ درس بھی تیز تر ہونے لگی پھر تو آندھی وطوفان کی طرح ماحول بدلنے لگا اور شیخ کی برق رفتار تقریر نے سارے طلبہ کو اپنی گرفت میں لے لیا تب ہم نے سمجھا کہ حضرت شیخ درس کا اختتام کرنا چاہتے ہیں لیکن کس کی مجال تھی کہ درس سے اُٹھ کر باہر اطلاع دیدے۔ کتاب آخری صفحہ پر آگئی اور ہم کو یقین ہوگیا کہ آج بخاری شریف کا اختتام ہے پھر چند ہی منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ دارالحدیث انسانی سروں سے بھرا جارہا ہے دروازوں، کھڑکیوں، بالکونیوں، آزو بازو کے کمروں میں انسانوں کا سیلاب جمع ہوگیا، بخاری شریف کا درس آخری سطور پر آگیا ہمارے دل بجلیوں کی طرح مچلنے لگے۔ اللہ اللہ عجیب رُوح پرور ماحول ہوگیا دل اُڑنے لگے، خوشی ومسرتوں سے چہرے دمکنے لگے۔ بس دو چار احادیث باقی تھیں کہ امیر جماعتِ تبلیغ داعی الی اللہ مولانا محمد یوسفؒ اپنے چند رفقاء کے ساتھ دارالحدیث میں داخل ہوئے یہ ایک عجیب وغریب غیر متوقع تشریف آوری تھی جس نے دارالحدیث کے سارے طلبہ کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیا۔

ماحول نے پھر ایک کروٹ بدلی روحانیت کا سمندر ٹوٹ پڑا، پوری فضا رَوح وریحان سے معطر ہوگئی حضرت شیخ الحدیث نے ایک لمحہ کیلئے درس روکا اور رئیس التبلیغ سے فرمایا "پیارے بیٹھ جا" حضرت شیخ کا یہ مخصوص لہجہ تھا۔

جب وہ محبّت و پیار سے کسی کو خطاب کرتے تو "پیارے" کا لفظ استعمال کرتے،
مولانا محمد یوسف رحؒ اور اُن کے رفقاء شیخ الحدیث کے بازو میں بیٹھ گئے۔ بس
دو چار منٹ بعد بخاری شریف کی آخری حدیث۔

كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ
ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ
اللهِ الْعَظِيْمِ۔

کی تلاوت ختم ہوئی (اور یہ سعادت آپ کے اس خادم کے نصیب رہی)
بخاری شریف کا اختتام عمل میں آیا، حضرت شیخ نے امیر تبلیغ سے فرمایا
"پیارے دُعا کر"

بس اُس لمحہ دُعا کے لئے ہاتھ اٹھ گئے، دُعا شروع ہوگئی پندرہ بیس منٹ ماثور و منقول دُعاؤں کا سلسلہ رہا پھر اچانک اُردو میں دُعا شروع ہوئی اس وقت ہم نے دیکھا کہ دارالحدیث اور اس کے اطراف واکناف انسانی ہجوم سے پُر ہوگئے اور لوگ ایک دوسرے پر گرے جا رہے ہیں چند ہی لمحات کے بعد امیر تبلیغ کی دُعا نے ماحول کو آہ و بُکا کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ کچھ دیر نہ لگی کہ آنسوؤں کا سیلاب بہہ پڑا، خوف و خشیت آہ و بکا سے فضا گونج اٹھی۔ لوگوں کی بے قراری و بے چینی اس حد تک آگئی کہ زمین پر سر ٹیکنے لگے رُو رُو کر بے دَم ہو گئے۔ امیر تبلیغ کی دُعا سیل رواں کی طرح جاری تھی۔ دُعا کا ہر ہر لفظ برق و بخار بن کر دلوں کو پارہ پارہ کرنے لگا، آہ و زاری نے پوری فضا کو غمناک کر دیا، نیچے شاہراہ کے چلنے والے بلا لحاظ مذہب و ملّت کھڑے ہو گئے۔ اندرونِ مدرسہ اور بیرونِ مدرسہ انسانی سروں کا سمندر بن گیا۔ اخلاص و خشیت کا عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔

غیر مسلموں کی بہت بڑی تعداد دارالحدیث کے ارد گرد جمع ہو گئی اور ان لوگوں نے بھی بے اختیار دُعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْئٍ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی میں ایک واقعہ ایسا بھی ملتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ عام مجمع میں سورۃ النجم کی تلاوت فرمائی اور جب آیت سجدہ پر پہنچے تو آپ اور صحابہ کرام نے سجدہ کیا، مشرکین جو آس پاس کھڑے تھے وہ بھی سجدہ میں گر پڑے
(مسلم، ترمذی)

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ اس وقت غاشیہ الٰہیہ (ایک غیبی وقہری تصرف) نے سب کو سربسجود کر دیا اور ہر ایک خواہی نخواہی سجدہ کرنے کیلئے بیقرار ہو گیا۔
(موضح القرآن)

امیر تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی دُعا میں بھی کچھ ایسا ہی منظر نظر آیا۔ طلبۂ دارالحدیث کے علاوہ عامۃ المسلمین بلکہ غیر مسلم حضرات بھی سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ پون گھنٹہ ختم ہونے آ گیا۔ مؤذن نے عصر کی اذان پڑھ دی شیخ الحدیث نے فرمایا۔ "بس پیارے بس"

حضرت امیر تبلیغ نے اپنے ہاتھ گرا دیئے، دارالحدیث گنج شہیداں کا منظر پیش کر رہا تھا کوئی چت پڑا ہوا ہے کوئی اوندھا، کوئی ٹیڑھا، کوئی ترچھا اور سینکڑوں افراد پر سکتہ چھایا ہوا ایسا معلوم ہوا کہ برق و باراں کا ایک طوفانی جھکڑ تھا جو یکدم موقوف ہو گیا۔ غمناک و سونی سونی فضا میں حضرت شیخ الحدیث اور امیر تبلیغ سلام کر کے رخصت ہو گئے اللہ تعالیٰ ان سب کو اعلیٰ علیین کے بلند درجات نصیب کرے اور جنت الفردوس کے روح و ریحان سے معطر کرے آمین۔ عجیب و غریب شخصیات تھیں۔

ختم بخاری شریف کے تذکرے پر ہمارے تحصیل علم کا ابتدائی اور انتہائی دور ختم ہوا سات سالہ دَور تعلیمی کے یہ چیدہ چیدہ واقعات تھے جو اختصار کے ساتھ نقل کر دئے گئے ہیں البتہ ایک چھوٹا سا تذکرہ اور رہ گیا جو ہمارے دورِ تعلیمی کا ہی ایک حصّہ ہے اور جس کو دورِ تعلیمی کا تکملہ یا خاتمہ کہا جاسکتا ہے۔

سفرِ لاہور (پاکستان)

دَورانِ تعلیم یہ بات سُننے میں آیا کرتی تھی کہ شہر لاہور میں مولانا احمد علی صاحبؒ جن کو عام طور پر شیخ التفسیر کہا جاتا تھا قرآن پاک کی تفسیر کا سہ ماہی درس دیا کرتے ہیں اور اس درس میں شرکت کیلئے صرف انھیں طلبہ کو داخلہ ملتا ہے جو باضابطہ کسی مستند مدرسہ کے فارغ التحصیل ہوں۔ ہند و پاک میں ان کے اس درس کی شہرت تھی جب کبھی اس کا تذکرہ سننے میں آتا میری طبیعت مچل جاتی تھی۔ اور تقاضہ تازہ ہو جایا کرتا تھا کہ کس طرح اس درس کی تکمیل کر لی جائے لیکن اسباب میلوں نظر نہیں آتے تھے، جونہی ہماری تعلیمی فراغت ۱۹۵۸ء میں ہوئی تقاضے نے عملی صورت اختیار کر لی، خط و کتابت کے ذریعہ داخلہ کی اجازت حاصل کر لی گئی،

پاسپورٹ وغیرہ کا انتظام شہر کے اہل خیر نے کر دیا، شُدہ شُدہ یہ بات مدرسہ میں عام ہو گئی ضلع اعظم گڑھ (یو،پی) کے ایک ہم سبق نے بھی ارادہ کر لیا میری ہمت اور مضبوط ہو گئی۔ میں اس وقت تک حضرت شیخ التفسیر کے دَرسی مَالہٗ و مَا علَیہ سے واقف نہ تھا۔ مظاہر علوم کے بعض اساتذہ نے مشورہ دیا کہ اب تمھیں مزید تحصیل علم کی ضرورت نہیں ہے اپنے وطن جاؤ اور اپنی عملی زندگی کا آغاز کرو، علم کا بھرپور حِصّہ مل چکا ہے۔ لیکن میری عِلم جو طبیعت اس مشورے سے مطمئن نہ ہو سکی اور میں سفر کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ

اوراق میں لکھا ہے مدرسہ مظاہر علوم میں میرے سرپرست ونگراں مولانا سید ظہور الحسن صاحب ناظم کتب خانہ امداد الغرباء تھے اور میرے ابتدائی دو تین سال حضرت موصوف کی زیرنگرانی کتب خانے میں ہی گزرے ہیں۔ بہرحال حضرت موصوف کو جب اس کا علم ہوا تو میرا ارادہ اُن پر بہت شاق گزرا پہلے تو نرم انداز میں اس ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا پھر جب یہ محسوس کرلیا کہ میں اپنے ارادے میں مصمم ہوں تو حضرت شیخ التفسیر کے تفسیری اغلاط پر متنبہ کیا اور ارشاد فرمایا کہ اکثر علماء دیوبند خاص طور پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح نے ان کی اس تفسیر سے شدید اختلاف کیا ہے لہذا تم اس میں اپنا وقت ضائع مت کرو، لیکن میں پھر بھی مطمئن نہ ہوا۔ عربی کا مقولہ ہے۔ اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ فِیْمَا مُنِعَ حضرت اُستاذ کی اس خیرخواہی نے مزید طلب وجستجو میں اضافہ کردیا۔ ابتک تو صرف تحصیل علم کا تقاضہ تھا استاذ مرحوم کی اس آگاہی کے بعد شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب رح سے ملاقات کا نیا تقاضہ پیدا ہوگیا۔ اس طرح دو آتشہ تقاضے نے سفر کی منزل اور قریب کردی، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

جب سفر کا جملہ انتظام پورا ہوگیا تو استاذ محترم مولانا سید ظہور الحسن صاحب رح سے آخری ملاقات کی حضرت موصوف رح کی یہ عالی ظرفی تھی کہ وداعی ملاقات پر دُعائیں دی اور ایک چھوٹا سا رسالہ بھی عنایت کیا اور فرمایا کہ اسکو اپنے مطالعہ میں رکھو اس میں ان تفسیری اغلاط کی وضاحت ہے،

اس رسالہ کا نام "اَلتَّقْصِیْرُ فِی التَّفْسِیْرِ" تھا یہ وہی رسالہ تھا جسمیں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب رح نے شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی تفسیر پر اعتراضات کئے ہیں اور جس میں شیخ التفسیر کے جوابات بھی نقل کئے گئے ہیں پھر ان جوابات پر حکیم الامت رح نے جواب الجواب بھی لکھا ہے۔

جب یہ رسالہ ہاتھ آیا تو ارادے میں نئی تحریک پیدا ہوئی کہ اب تو اس درس کی تکمیل کرنی ہی ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ کے سامانِ حرب و ضرب کا ذخیرہ موجود ہے اب کس بات کا اندیشہ؟ دل مطمئن ہو گیا کہ حکیم الامت ساتھ ہیں۔ سہارنپور سے امرتسر پہنچا، امرتسر سے ایک خصوصی چھوٹی سی ٹرین نے مسافروں کو لاہور پہنچا دیا، ارضِ پاکستان پر قدم رکھتے ہی دارکفر و شرک سے دُوری محسوس ہوئی۔ شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب کے مدرسۂ انجمن خدام الدین پہنچا، انجمن کے منتظم شیخ التفسیر کے صاحبزادے مولانا عبیداللہ صاحب نے نہایت اکرام کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ انجمن کی نفیس و پاکیزہ عمارت میں ہم دونوں طالب علم کو ایک کمرہ دیا جس میں رہائش کی جملہ چیزیں موجود تھیں۔ نمازِ ظہر کے بعد حضرت شیخ التفسیر سے ملاقات کروائی گئی پہلی ہی نظر میں موصوف کی شخصیت نے متاثر کر دیا۔ عالمانہ شکل و صورت، تقویٰ طہارت کے آثار نمایاں، نحیف و ناتواں بدن لیکن عزم و ہمت سے بھرپور، چال ڈھال میں قدامت، سلف صالحین کا نمونہ، موٹا دھوٹا لباس ہمارے مختصر تعارف کے بعد ارشاد فرمایا آج آپ آرام کریں کل صبح درس میں آجانا۔ بس ہمارا داخلہ ہو گیا۔

لاہور کی تفسیری درسگاہ

دارالتفسیر کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی مسجد کے اندر ہی انتظام تھا صبح آٹھ بجے سے بلا وقفہ بارہ بجے تک مسلسل چار گھنٹے شیخ التفسیر درس دیا کرتے تھے طلبہ کی تعداد بھی ستّو سے اوپر تھی غیر منقسم پاکستان کے طلبہ کے علاوہ سرحدی علاقوں کے طلبہ زیادہ تھے اور یہ سب طلبہ فارغ التحصیل علماء تھے، ہندوستان کے صرف ہم دو شریک درس تھے۔ ہمیں صفِ اوّل میں شیخ التفسیر کے بالمقابل جگہ دی گئی۔

ابتدائی ہفتہ تفسیر قرآن کی مبادیات میں گزرا جو علوم تفسیر سے متعلق تھے پھر شیخ التفسیر کا اپنا مخصوص درس شروع ہوا۔ آغازِ درس سے پہلے خصوصیت سے ایک اہم نکتے پر متنبہ کیا، فرمایا ہمارا یہ درس تفسیر قرآن سے متعلق نہیں ہے بلکہ تاویلِ قرآن سے تعلق رکھتا ہے گویا پورا نصاب تاویلِ قرآن کا ہے، تفسیر اور تاویل کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ مفہوم اور مرادِ قرآنی کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ جیساکہ عام مفسرین کرام بیان کرتے ہیں، اور تاویل ایسے مضمون کا نام ہے جو قرآنی آیات سے اخذ کیا گیا ہو اور جو قرآن کے منشاء و مراد سے ٹکراتا نہ ہو۔ یعنی کسی آیت سے اس کے حقیقی معنیٰ و مراد سے ہٹ کر کوئی ایسی مفید بات لی جائے جس کے لئے وہ آیت نازل نہ ہوئی ہو تاہم وہ آیت اس مفید بات کے مخالف بھی نہ ہو۔ ایسی مفید بات کو تاویل قرآن کہا جاتا ہے۔ تاویل قرآن کی یہ تعریف تفسیر خازن کے مفسر نے ایسے ہی بیان کیا ہے۔

بہرحال ہمارا یہ سہ ماہی درس "تاویل قرآن" سے متعلق ہے۔

حضرت شیخ التفسیر نے قرآنی سورتوں کی چند مختلف آیات اور بعض چھوٹی چھوٹی سورتوں کا انتخاب کیا ہے جن کی وہ تاویل بیان کرتے ہیں ایسے تمام مضامین کو قرآن حکیم کے حاشیہ پر طبع کروا دیا گیا ہے جس کو انجمن خدام الدین لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ قرآن سارے طلبہ میں تقسیم کر دئے جاتے ہیں اسی کے مطابق ہر روز صبح آٹھ تا بارہ ساعتِ دن درس قرآن دیا کرتے، نمازِ ظہر کے بعد سے عصر تک تالیفی و تصنیفی کام میں مشغول رہتے۔ عصر کے بعد سے مغرب تک عام مجلس ہوتی جس میں مقامی لوگ شرکت کرتے پھر نماز مغرب کے بعد مریدوں اور معتقدوں کے ساتھ حلقہء ذکر کی محفل ہوتی جس میں ذکر بالجہر کا سلسلہ عشاء کی اذان تک جاری رہتا۔ ذکر کی یہ مجلس مسجد کے ایک وسیع و

کشادہ ہال میں روشنی بند کر کے منعقد ہوا کرتی تھی کثیر تعداد میں لوگ جمع ہوجایا کرتے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد تناول طعام فرماتے پھر مقامی خواتین کیلئے درس تفسیر دینے مسجد آجاتے جہاں پردے کا خصوصی انتظام ہوا کرتا تھا یہ درس بھی وہی تھا جو صبح علماء کرام کو دیا جاتا تھا اس کا سلسلہ بھی رات ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہتا اس درس میں خواتین کا ہجوم ہوا کرتا تھا، درس کے بعد ۲ ½ ڈھائی گھنٹے استراحت فرماتے، ساڑھے تین بجے تہجد کے لئے کھڑے ہوجاتے جس کا سلسلہ اذانِ فجر تک رہتا بعد نماز فجر اشراق تک مسجد میں مشغولِ ذکر رہتے پھر ناشتہ سے فارغ ہوکر درسِ تفسیر کے لئے مسجد آجاتے، یہ ایک ایسا منظم اور مجاہدانہ کارنامہ ہے جس کا تحمل جوان سال مردوں کے لئے بھی مشکل تھا۔ حضرت شیخ التفسیر کی عمر اس وقت ۸۲ بیاسی سال سے متجاوز ہوچکی تھی میری آنکھوں نے شاید و باید ہی کسی اور عالم کو دیکھا ہو جو اس پیرانہ سالی میں ہمہ تن ہمہ وقت مشغول و مصروف رہا ہو دَورانِ درس کی ایک چھوٹی بات کہتا چلوں، شیخ التفسیر درس کے وقت جس ہیئت سے تخت پر تشریف فرما ہوتے مسلسل چار گھنٹے اسی ہیئت پر قائم رہتے اس میں ذراسی بھی تبدیلی نہیں فرماتے لیکن ہم جوان سال شاگردوں کا اس عرصے میں یہ حال ہوتا تھا کہ ہر آدھے پون گھنٹے بعد اپنی بیٹھک کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوجاتے،

شیخ التفسیر کی اس نشست کو ہم لوگ "کراماتی نشست" کہا کرتے تھے۔

بات چھوٹی ہے لیکن عملاً بھاری اور ناقابلِ برداشت۔

بہرحال میں درسِ تفسیر کا (جس کا حقیقی نام درسِ تاویل تھا) تذکرہ کررہا تھا، شیخ التفسیر نے قرآن حکیم کی بعض آیات کا خصوصی مفہوم مرتب کیا تھا جو یقیناً

حضرت موصوف ہی کی اختراع تھی البتہ میرے ایک سوال پر فرمایا تھا کہ یہ خصوصی درس علامہ عبید اللہ سندھیؒ کا نتیجۂ فکر ہے۔ علامہ سندھیؒ حضرت شیخ التفسیر کے خسر تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے خصوصی تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے خلاف مشہور زمانہ "ریشمی رومال" سیاسی تحریک میں حضرت شیخ الہند کے خصوصی نمائندہ رہے ہیں اور چند سال شیخ الہند کے ساتھ جزیرہ مالٹا میں نظر بند بھی۔

بہرحال شیخ التفسیر کے درس میں ابتدائی آٹھ دس دن خاموشی سے سماعت کرتا رہا اور حضرت کی تفہیم و تقریر کو سمجھنے کی کوشش اور جب حضرت کا درس اپنے نقطۂ عروج پر آیا تو وقتاً فوقتاً درمیانِ درس اعتراضات شروع کردیئے شیخ التفسیر اس کا جواب دیتے جاتے۔ میں اس جواب پر پھر اعتراض کرتا، اب یہ سلسلہ روز مرہ کا معمول بن گیا، دراصل یہ اعتراضات وہی تھے جس کو حکیم الامتؒ نے کتابی شکل دی تھی انہی اعتراضات کو میں بروقت دہرادیا کرتا۔ حضرت شیخ التفسیر اس کا وہی جواب دیتے جس کو حکیم الامتؒ نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے اور پھر اس پر دوسرا اعتراض کیا ہے۔ میرے اس طرز پر ایک ماہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ عام طلبہ نے بے چینی اور ناگواری محسوس کی لیکن کسی کی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ مجھے ٹوکے یا منع کرے یہ اس لئے بھی کہ حضرت شیخ التفسیر میرے اعتراضات کا خندہ پیشانی سے جواب دیا کرتے تھے۔ اس طرح سلسلہ چلتا رہا، طلبہ کو تو کیا معلوم ہوتا شیخ التفسیر کو بھی اندازہ نہ ہوگا کہ میں حکیم الامتؒ کا نقال ہوں اور اُن کی کتاب اپنے ساتھ رکھتا ہوں،

بہرحال جب کبھی سوال و جواب طوالت اختیار کرلیتا تو اس موقعہ پر شیخ التفسیر اپنا آخری جواب دیکر خاموش کردیا کرتے کہ۔

جناب یہ تاویل قرآن ہے میں نے تفسیر کا دعویٰ کب کیا ہے
اور تاویل میں آپ کو اختیار ہے قبول کریں یا نہ کریں۔
یہ میرا اپنا اجتہاد و استنباط ہے۔

اس مقام پر بحث نہایت نازک مرحلہ پر آجاتی جب میں اس پر حکیم الامت کا آخری قاہرانہ جواب نقل کر دیتا، سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا حضرت شیخ التفسیر کا وہ تاویلی ذخیرہ فی الحال تو موجود نہیں تاہم اپنی یادداشت کے تحت اس کے دو ایک نمونے آیندہ اوراق میں پیش کروں گا غرض میں یہ عرض کر رہا تھا کہ درس میں میرے سوال و جواب کا سلسلہ دراز ہونے لگا اور یہ روز روز کا معمول بن گیا، ہر روز کم از کم دو سوال تو کر ہی دیتا، اس غیر متوقع صورتِ حال نے شیخ التفسیر کو تو نہیں ساتھیوں کو پریشان کر دیا۔ دو ماہ کا عرصہ گزر گیا درس کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا ایک دن درس گاہ سے حسبِ معمول اپنے کمرے آیا کھانے سے فراغت کے بعد استراحت کے لئے لیٹ گیا۔ میرے ہم سبق دوست بھی ساتھ تھے اچانک چار پانچ سرحدی طلبہ دراز قد، غضبناک حالت میں گھس آئے دو کے ہاتھوں میں لمبا چاقو تھا میری جانب بڑھے۔ میرے ہم سبق تو بے تحاشہ بھاگ نکلے، چاروں نے میرا گھیرا کر لیا۔ میرے ہوش و حواس اڑنے لگے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔

خبیث کا بچہ ہمارے اُستاذ کو پریشان کرنے آیا؟۔
اُو خبیث توبہ کر استاذ کو ستائے گا نہیں؟
درس میں خاموش بیٹھے گا؟
سوالات نہیں کرے گا؟
میں نے بلا توقف توبہ توبہ کہدیا اور پھر رُو پڑا۔

قاتلوں کو غالباً رحم آگیا تاکید کرتے ہوئے واپس ہوگئے کہ اُستاذ سے اگر ہماری شکایت کی تو پھر تیری خیر نہیں؟
بہرحال ایک قیامت تھی جو گزر گئی، عصر کے وقت تک ہوش و حواس غائب تھے۔ عصر کی نماز کے لئے مسجد آیا، انجمن کے منتظم صاحب نے میری بدحواسی محسوس کی اور خیریت دریافت فرمائی لیکن میں پابند ہو چکا تھا کہ اُستاذ سے شکایت نہ کروں گا۔ موصوف کے اصرار پر واقعہ تو میں نے بیان کر دیا لیکن طلبہ (قاتلوں) کی شناخت سے انکار کر دیا جس کا انھیں شدید اصرار تھا۔ قاتلانہ حملہ (واللہ اعلم) غالباً دھمکی کے طور پر ہوگا۔ لیکن میری ساری دلچسپی، ذوق و شوق اور تکمیلِ درس کا جذبہ بالکل سرد پڑ گیا، دل اُداس اُداس رہنے لگا، روزانہ درس میں تو شرکت کر لیتا لیکن بے چون و چرا ہفتہ عشرہ بعد وطن واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت شیخ التفسیر سے اجازت چاہی، حضرت موصوف کو اس ناگہانی صورتِ حال کی اطلاع ہو چکی تھی فرمایا۔

صاحبزادے چند دن اور صبر کر لو تکمیلِ درس کیلئے دو تین ہفتے باقی رہ گئے ہیں اس کے بعد تفسیر کی اعلیٰ سند ملے گی جس میں علامہ سندھیؒ کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ کی بھی سند شامل ہے۔

لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا دوسرے دن اپنے مادرِ علمی مظاہر علوم (سہارنپور) پہنچا۔ اساتذہ کرام خاص طور پر مولانا سید ظہور الحسن صاحب نے میری دلچسپ کہانی سنی اور بہت محظوظ ہوئے فرمایا۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔
جو چیرا تو ایک قطرۂ خوں نہ نکلا

الحمد للہ سفر خیر سے گزرا، ہم اپنے وطن واپس لوٹے،

آخر میں ہم حضرت شیخ التفسیر کی تاویلِ قرآن کے دو چار نمونے جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے نقل کر رہے ہیں تاکہ قارئین شیخ التفسیر کی تاویلِ قرآنی کا تعارف حاصل کریں۔ یہ بات ان سطور کے لکھنے وقت کم و بیش چالیس سال پہلے کی ہے ہمارے یہاں حضرت شیخ التفسیر کا وہ تاویلی ذخیرہ[1] موجود نہیں جس کو مِن وعن نقل کر دیا جاتا تاہم اپنی یادداشت کے تحت لکھا جا رہا ہے ممکن ہے الفاظ میں کمی بیشی ہو جائے، اس پر ہم ناظرینِ کرام سے معذرت خواہ ہیں۔

تاویلِ قرآن کے چند نمونے

(۱) وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (بقرہ آیت ۲۳۲)

ترجمہ ومطلب:۔ جب شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دیدیا تو عورت کو اختیار ہے کہ عدّت گزرنے کے بعد وہ کسی سے بھی اپنا نکاح کرلے، عورت اپنے نکاح کرنے میں خود مختار ہوگی۔ پہلے شوہر کو یا خاندان والوں کو روکنے یا منع کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر عورت اپنے پہلے شوہر ہی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے کسی کو روکنے کا حق نہیں ہو گا۔
(یہ تو قرآنی مفہوم اور تفسیر تھی)

اب شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحبؒ اس آیت کی تاویل اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جس طرح طلاق دینے کے بعد شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی مطلقہ بیوی کو دوسرے مرد سے نکاح کرنے سے باز رکھے اسی طرح اسلامی ریاست کے

[1] شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی تاویلات کا یہ ذخیرہ ان کے مترجم قرآن عزیز محشّی مطبوعہ انجمن خدام الدین شیرانوالہ گیٹ لاہور ملاحظہ فرمائیں۔

مستعفی حاکم کیلئے جائز نہیں کہ وہ نئے حاکم کے انتخاب میں روڑے اٹکائے۔
مطلب یہ کہ جب پہلا حاکم حکومت سے علیحدہ ہوگیا تو اس کو اپنی بقیہ زندگی خاموش گزار دینی چاہیئے اور سیاست میں حصّہ نہ لینا چاہیئے، قوم جس کو چاہے اپنا حاکم تجویز کرے یا کوئی دوسرا حاکم بن جائے۔

(۲) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ
الآیۃ (بقرہ آیت ۲۲۹)

ترجمہ ومطلب:۔ بیوی کو ایک یا دو طلاق دینے کے بعد اندرونِ عدّت شوہر کو پھر رجوع کر لینے کا اختیار ہے لیکن اس کے بعد اگر تیسری طلاق بھی دیدی تو اب رجوع کرنے کا اختیار نہیں رہے گا۔ ازدواجی سلسلہ ختم ہوگیا۔

شیخ التفسیر اس آیت کی تاویل اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔
رعایا سے تعلقات کی کشیدگی کے باعث اگر حاکم تین دفعہ مستعفی ہو تو پھر اُسے دوبارہ منتخب کرنا درست نہ ہوگا۔ ورنہ یہ عظیم عہدہ بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔ گویا اس کو ہمیشہ کیلئے اس نعمت سے محروم رہنا ہوگا۔ جیساکہ تین طلاق کے بعد شوہر اپنی بیوی سے محروم ہوجاتا ہے۔

(۳) وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ
الآیۃ (بقرہ آیت ۲۲۲)

ترجمہ ومطلب:۔ حالتِ حیض کے بارے میں صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا تھا کہ ایسی صورت میں بیویوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیئے؟ انھیں جواب دیا گیا کہ حالتِ حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہنا چاہیئے اور قربت سے پرہیز کرنا چاہیئے اور جب وہ پاک ہوجائیں تو اِن سے قربت کی جاسکتی ہے۔

شیخ التفسیر اس آیت کی تاویل اس طرح فرماتے ہیں:۔

اگرچہ شرعی طور پر شوہر کو اپنی بیوی پر ہر طرح کا اقتدار و تسلط حاصل ہے اور وہ بیوی کے ہر معاملہ میں دخل انداز ہو سکتا ہے لیکن بعض حالتیں ایسی بھی ہیں کہ شریعت نے عورت کو ناپاک قرار دیکر اس سے دُور رہنے کا حکم دیا ہے۔ (یعنی حالتِ حیض و نفاس میں)

بالکل اسی طرح حاکم کو اپنی رعایا پر پُورا پُورا اقتدار حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی حکومت کے مشرک رعایا کی بعض ایسی ناپاک حالتیں ہیں جن میں حاکم کو مداخلت کرنے کا حق نہیں ہو گا۔

مثال کے طور پر جس وقت مشرکین اپنے مندرون اور گرجاگھروں میں بت پرستی کر رہے ہوں تو ایسے وقت حاکم کو دخل اندازی کرنے کا حق نہیں ہو گا۔

(۴) لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ - الآية

(بقرہ آیت ۲۳۶، ۲۳۷)

ترجمہ و مطلب:۔ اگر کسی نے نکاح کرنے کے بعد وداعی یا رُخصتی سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دیدیا تو طلاق واقع ہو جائے گی، بیوی کو ضروری نان و نفقہ دیکر عزّت و اکرام کے ساتھ رخصت کر دینا چاہئے۔ اس بارے میں میاں بیوی عفو و درگزر اور فراخدلی سے کام لیں اور اپنی اپنی حیثیت کا مظاہرہ کریں۔

شیخ التفسیر اس آیت کی اس طرح تاویل بیان کرتے ہیں:۔

جس طرح نکاح کے بعد وداعی سے پہلے (خلوت سے پہلے) بیوی کو طلاق دینا جائز ہے اس طرح حاکم منتخب ہو جانے کے بعد کام شروع کرنے سے پہلے (یعنی امورِ سلطنت کی ادائیگی سے پہلے) حاکم کو استعفاء دینا جائز ہو گا۔

ایسے وقت حاکم اور رعایا دونوں ایک دوسرے کا پاس و لحاظ رکھیں، مثلاً جاتے وقت حاکم نافذ شدہ احکامات کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرے، اسی طرح رعایا حاکم کو رخصت کرتے وقت نہایت عزّت و احترام اور خلوص کا مظاہرہ کریں۔

⑤ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ الآیۃ
(بقرہ آیت ۲۳۳)

ترجمہ ومطلب:- میاں بیوی اپنے نوزائیدہ بچّے کو دُودھ پلائی کیلئے کسی عورت کی خدمات حاصل کرنا چاہیں تو انھیں اس کی اجازت ہے۔ البتہ دستور کے موافق دُودھ پلائی کا پُورا پورا حق دینا چاہیئے۔

شیخ التفسیر اس آیت کی اس طرح تاویل بیان کرتے ہیں۔

جس طرح دُودھ پلائی کیلئے کسی عورت کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک سے اسلامی سلطنت کیلئے ماہرینِ فن کی خدمات لی جاسکتی ہیں اور انھیں اس کا معقول معاوضہ بھی دیا جانا چاہیئے۔

⑥ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ (الآیۃ) (بقرۃ آیت ۱۲۹)

ترجمہ ومطلب:-

ایک سے زائد بیویوں میں ممکن ہے کہ شوہر کو کسی ایک بیوی کی جانب خصوصی محبت واُنس ہو لیکن شوہر کو اپنی تمام بیویوں میں عدل وانصاف کا تقاضہ پُورا کرنا ضروری ہے ایسے طور پر کہ کسی بیوی کا حق فوت نہ ہونے پائے اور ظاہری برتاؤ میں بھی فرق نہ آئے۔

شیخ التفسیر اس آیت کی یہ تاویل فرماتے ہیں:-

جس طرح دو چار بیویوں والے شوہر کو عدل وانصاف میں مساوات کرنی ضروری

ہے اسی طرح مسلمان حاکم کے ماتحت مختلف قومیں دارالسلام میں آباد ہوں تو حاکم کو اگرچہ طبعی طور پر مسلمانوں سے زیادہ تعلق قلبی اور اُنس ہوگا لیکن اُس پر ضروری ہوگا کہ دوسری قوموں کو بھی قانون سے پُورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقعہ دے، تاکہ غیر مُسلم رعایا کے قلوب میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اِن پر ظلم و تشدد ہو رہا ہے۔

ملحوظہ :-

شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی تاویلاتِ قرآنی کے یہ چند نمونے بلا تبصرہ نقل کر دیئے گئے ہیں۔ البتہ کسی صاحب کو نقد و تبصرہ پڑھنے کی خواہش ہو تو براہِ کرم حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا رسالہ "اَلتَّقْصِیْرُ فِی التَّفْسِیْرِ" مطالعہ فرمائیں۔

مولانا مودودی صاحب سے مُلاقات

بات اُنہی ایام ۱۹۵۸ء کی ہے جب ہم درسِ تفسیر میں شرکت کیلئے شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب کے یہاں لاہور (پاکستان) پہنچے تھے شہر لاہور جماعتِ اسلامی کا مرکزی مقام تھا، بانیٔ جماعت سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تحریک اُن دنوں اپنے نقطۂ عُروج پر تھی۔

ہندو پاک کے بیشمار علماء کو جہاں جماعت اور امیر جماعت سے اختلاف تھا وہاں اس وقت کی موجودہ حکومت جس کی صدارت جنرل ایوب خان کر رہے تھے سیاسی سطح پر بھی اختلاف تھا۔ جماعت پر کڑی نگرانی تھی اور اس کی نقل و حرکت پر بھی پابندی۔ اس طرح جماعت اسلامی دینی و سیاسی طور پر دونوں طبقوں میں مشتبہ اور قابلِ نقد و تبصرہ ہو چکی تھی، پاکستان میں شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب ان علماء میں سرِفہرست تھے جنھوں نے مودودی صاحب سے سخت اختلاف کیا ہے۔

میں اپنے دورِ تعلیمی میں اس نزاع سے واقف ضرور تھا لیکن براہِ راست اس جماعت کی تعلیمات ونظریات سے واقف نہ تھا کبھی کبھار مودودی صاحب کی تردید میں کوئی رسالہ یا مضمون مل جاتا تو پڑھ لیا کرتا تھا۔ موصوف میرے وطن حیدرآباد دکن ضلع اورنگ آباد کے متوطن ہیں۔ ان کی تحریک کا آغاز بھی اسی شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ وطن میں تو موصوف سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ اُن دِنوں میرا دینی شعور بالکل ابتدائی تھا جب میں درسِ تفسیر کیلئے لاہور آیا تو قلب میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ مودودی صاحب سے ملاقات کرنی چاہیئے

لیکن میں جس ماحول میں تھا وہاں یہ بات ممکن نہ تھی یہاں کا چھوٹا بڑا جماعتِ اسلامی کا مخالف تھا۔ لیکن میں موقع کی تلاش میں رہا ایک دن معلوم ہوا کہ شہر کے فلاں ہال میں سید مودودی صاحب کا خطاب ہونے والا ہے، عصر کے بعد کا وقت تھا میں کچھ تاخیر سے پہنچا پورا ہال بھرا ہوا تھا جیساکہ میں نے کہا ہے یہ بات ۱۹۵۸ء کی ہے۔ مودودی صاحب کو صحت مند، تندرست، پھرتیلے انداز میں سامنے سے گزرتے دیکھا یہ پہلی ملاقات نہیں پہلی نظر تھی موصوف تیزی سے اسٹیج پر پہنچے اور درسِ قرآن کا آغاز کیا۔ تقریر کا موضوع تو یاد نہیں کیا تھا؟ البتہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ تھا اور یہ آیت آج بھی ذہن نشین ہے۔

وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ - الآیۃ (الشعراء آیت ۳۳)

(پھر اس نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا۔ وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا)

اس آیت کی تفسیر میں معجزات کی عمدہ تشریح کی اور ثابت کیا کہ معجزات

مستقل حقیقت ہوا کرتے ہیں محض خواب وخیال یا فریبِ نظر نہیں جیسا کہ جادوگروں کے کرتب ہوا کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کے خطاب کی یہ عقلی واستدلالی قوت تھی جو مجمع کو زیروزبر کررہی تھی سارا مجمع ہمہ تن گوش سماعت کررہا تھا۔ آیاتِ الٰہی کا بیان جس کا دوسرا نام معجزات ہے اور جو اللہ عظیم کی طاقت وقدرت کا عظیم نمونہ ہوا کرتا ہے سب کے دل ودماغ کو متأثر کررہا تھا جیسے جیسے معجزات کی حقیقت سامنے آنے لگی قلوب پر ایک باعظمت ہیبت طاری ہونے لگی۔ عظمتِ الٰہی سے دل لرزنے لگے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ کوئی بڑا زلزلہ ٹوٹ پڑنے والا ہے کہ عین اسی وقت قبلہ نے اپنا روئے سخن قدیم مفسّرین کی طرف پھیر دیا کہنے لگے۔ یدِ موسیٰ کا یہ معجزہ جو فرعونی دربار کو منوّر کررہا تھا اور جس سے انسانی آنکھیں خیرہ ہورہی تھیں۔ یہاں ہمارے بعض قدیم مفسّرین کی سادگی اور بھولاپن ملاحظہ فرمائیے انھوں نے یہودی روایات سے متأثر ہوکر بَیۡضَآءَ کے معنیٰ سفیدی کے سمجھے ہیں اور اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ بغل سے نکالتے ہی اچھا خاصا ہاتھ برص کے مریض کی طرح سفید ہوگیا اور پھر جب دوبارہ اُسے بغل میں رکھا تو وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

اس وقت پورے باوقار مجمع سے ایک زبردست قہقہہ ٹوٹ پڑا۔
(غالبًا یہ وہی زلزلہ تھا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے)

دو ایک منٹ تو یہی استہزائی کیفیت رہی پھر تقریر کا سلسلہ آگے بڑھا، مودودی صاحب کے اس تمسخر یہ انداز سے میرے دل ودماغ مجروح ہوگئے۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ آخر وہ بھولے بھالے قدیم نادان مفسّرین کون ہیں جنھوں نے یدِ موسیٰ کے الٰہی معجزے کو برص کی بیماری سمجھا اور

اس کی یہی تفسیر بیان کردی پھر ان کے لائق شاگردوں نے نقل در نقل کرتے ہمارے ہاں کی تفسیروں میں رائج کردیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط
بات آئی گئی جلسہ برخاست ہوا۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی و مسرت دمک رہی تھی۔ لیکن میں ابھی تک اپنی سوچ و فکر سے آزاد نہ ہوسکا اُسی حالت میں اپنے ٹھکانے آیا۔ چند گھنٹے تو یہی حالت رہی پھر میرے زاویۂ فکر نے ایک نئی کروٹ لی شدت سے احساس ہوا کہ اب تو موصوف سے بہرصورت ملاقات کرنی چاہیئے، موقع کی تلاش میں رہا آخر وہ موقع مل ہی گیا۔ حضرت شیخ التفسیر ایک دن کیلئے کہیں باہر چلے گئے تھے۔ میں نے وقت کو غنیمت جانا۔ پوچھتے پاچھتے اچھرہ (مرکز جماعت اسلامی) پہنچا ظہر کا وقت تھا قریب ہی مسجد تھی داخل ہوا خیال آیا کہ مولانا نماز کیلئے مسجد ہی تشریف لائیں گے۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا نماز کے بعد مرکز پر آیا اور یہی مولانا کی قیام گاہ بھی تھی ایک جواں سال نے وجہ آمد دریافت کی میں نے اپنا مختصر تعارف کروایا اور کہا کہ مولانا مودودی صاحب سے صرف ملاقات کی خواہش ہے۔ میری اختصار پسندی سے غالباً وہ متاثر ہوئے سیدھے مولانا مودودی صاحب کے یہاں گئے اور یہ پیام لائے کہ مولانا اس وقت تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں صرف مصافحہ ہی کرنا ہو تو تشریف لائیے ورنہ عصر کے بعد تفصیلی ملاقات ہوسکتی ہے؟

میں نے تفصیلی ملاقات کو ترجیح دی۔ اس پر عصر تک میرے استراحت کا انتظام کردیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جواں سال میاں طفیل محمد صاحب تھے جو بعد میں امیر جماعت نامزد ہوئے۔ بہرحال عصر تک میں استراحت خانے میں رہا۔ عصر کی اذان ہوئی میں تو مسجد آگیا۔ نماز سے فراغت کے بعد واپس

ہوا تو دیکھا کہ صحن کے سبزہ زار پر کرسیاں جمادی گئی ہیں باہر سے لوگوں کی آمد شروع ہوئی خاصا مجمع ہوگیا۔ مولانا کا انتظار ہو رہا تھا میری متلاشی آنکھیں ہر سُو دوڑ رہی تھیں، مولانا اپنے حجرے سے نکلتے نظر آئے۔ سفید پاکیزہ لباس، باریک دو پلی ٹوپی، کُرتا قدرے اُونچا، ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، سَر پر دراز بال، (زُلف) ڈاڑھی حدِ جواز میں دہن مبارک میں سگریٹ۔

شوقِ زیارت تو بہرحال تھا ہی ہیئتِ کذائی پر تعجب ضرور ہوا۔ مولانا تشریف لائے سب نے کھڑے ہوکر استقبال کیا پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ میاں طفیل محمد صاحب نے میرا تعارف کروایا۔ مولانا نے بڑی شفقت و عنایت سے مصافحہ کیا اور اپنے قریب جگہ دی، خیر خیریت کے بعد میرے تعلیمی حالات پُوچھے پھر دیوبند، سہارن پور کے نصاب تعلیم کی تفصیل دریافت کی میں نے ہر علم و فن کی کتابیں شمار کروائی، علم نحو، علم صرف، علم ادب، علم منطق، علم فلسفہ، علم فقہ، علم اصول فقہ، علم تفسیر، علم اصول تفسیر، علم حدیث، علم اصول حدیث وغیرہ ہمارے نصاب تعلیم میں علم منطق وفلسفہ اور علم ادب کی کتابیں بہ نسبت دیگر علوم کچھ زیادہ ہیں۔ البتہ علم تفسیر میں بنیادی طور پر صرف ایک کتاب تفسیرِ جلالین پڑھائی جاتی ہے۔

مودُودی صاحب نے جب یہ تفصیل سُنی تو طنز بہ انداز میں حاضرین سے کہا دیکھئے یہ ہمارے مدارسِ اسلامی کا نصابِ تعلیم ہے جس میں ہر علم پر چار چار، چھ چھ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن تفسیر قرآن پر صرف ایک ہی کتاب جلالین پڑھائی جاتی ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اِس کتاب کے تفسیری کلمات قرآنی کلمات کے مساوی ہیں (یعنی مختصر ترین تفسیر) اس تبصرے پر ایک ہلکا سا قہقہہ ہوا، میں کچھ جھینپ سا گیا پھر فوری

بول پڑا، مولانا حقیقت تو یہی ہے کہ تفسیر قرآن پر صرف ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی ہے لیکن اس کی تشریح میں قدیم تفسیروں کی ساری تحقیقات آجاتی ہیں اور یہ کتاب ہر روز کامل دو گھنٹے بلا ناغہ سال بھر تک پڑھائی جاتی ہے ہم نے قدیم کتب تفاسیر کے نام اور اُن کا تعارف اسی درس میں پایا ہے۔

تفسیر کبیر، تفسیر طبری، تفسیر کشّاف، تفسیر قرطبی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر رُوح المعانی وغیرہ اس پر مودودی صاحب خاموش ہو گئے۔

پھر رُوئے سخن دوسری جانب چلا۔ حیدرآباد دکن کے بعض احباب کے بارے میں دریافت کیا کہ فلاں صاحب کیسے ہیں؟ فلاں صاحب کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ہر ایک کے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کی ویسے بھی میں جماعت اسلامی سے وابستہ نہ تھا۔ البتہ محمد یونس صاحب کے بارے میں واقف تھا۔ خیریت کی اطلاع دی، مودُودی صاحبؒ نے کہا یہ صَاحبؒ ہمارے قریبی رفیق تھے اب عرصۂ دراز سے ان کی کوئی خبر نہیں۔

اسی مجلس میں ایک صَاحبؒ نے موجودہ حکومت کے صَدر جنرل ایوب خاں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ روئے سخن سیاست کی طرف چل پڑا، بہت دیر تک اس کا تذکرہ رہا۔ اخیر تبصرہ یہ تھا کہ جنرل صَاحبؒ ذاتی طور پر اچھے انسان ہیں اسلام اور مسلمانوں سے انھیں محبت ہے لیکن ان کے اطراف کا حاشیہ بے دین خُدا بیزار انسانوں کا ہے۔ جنرل صاحبؒ انہی لوگوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

اس منزل پر میں نے چھوٹی سی مداخلت کر دی اگرچہ یہ میرا میدان نہ تھا لیکن میں نے ہمّت کر ہی ڈالی، عرض کیا۔ مولانا آپ کی اور آپ کی جماعت کی جدّ و جہد

جہاں عام مسلمانوں کی طرف معروف عمل ہے تاکہ اقامتِ دین قائم ہو جائے اس طویل و عریض جدو جہد کو اگر جنرل صاحب اور ان رفقاء کی جانب کر دیجائے تو اقامتِ دین کا مقصد بہت آسان ہو جائے گا۔ کیا آپ نے ایسی کوئی کوشش کی ہے؟ اس پر مولانا کے دہن مبارک سے بے ساختہ قہقہہ نکلا اور مجمع میں بھی ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی کہنے لگے ساری مشکل تو یہی ہے کہ کسی کو جنرل صاحب کے قریب ہونے کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا بات آئی گئی اور ختم ہو گئی۔

پھر میں نے بغیر کسی تاخیر مودودی صاحب سے اپنا یہ سوال کر ہی دیا۔
مولانا! دو تین سوالات دریافت کرنے ہیں اگرچہ ان کے جوابات آپ کے رسائل و مسائل میں موجود ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ براہِ راست آپ سے ان کا جواب سنوں اجازت ہو تو عرض کروں؟ نہایت فراخدلی سے کہا فرمائیے۔

سوال ۱:۔ ہند و پاک میں کئی ایک دینی جماعتیں کام کر رہی ہیں اُن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ ظاہر ہے سب جماعتیں اسلام کے نام پر اسلام ہی کی خدمت کر رہی ہیں۔ لیکن جو دین سارے ادیان پر غلبہ کیلئے آیا ہے اُس جانب کم ہی توجہ دی جا رہی ہے۔

جماعتِ اسلامی کی تاسیس اسی بنیادی نقطہ پر رکھی گئی ہے۔ اقامتِ دین ہی اسلام کا مقصد و منشاء ہے۔

سوال ۲:۔ مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) میں تقلید شخصی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اور جناب کس امام کے مقلد ہیں؟

جواب :۔ تقلید سے تو کسی کو بھی مفر نہیں لیکن موجودہ مروّجہ تقلید کا میں قائل نہیں ہوں۔ جو بات کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کے قریب پاتا ہوں اس کو اختیار کرتا ہوں اور یہی بات دوسروں کے لئے بھی پسند کرتا ہوں۔

سوال ۳ :۔ میں نے اجازت لے کر پھر سوال کیا۔ مولانا آپ تو اہل علم ہیں۔ کتاب و سنّت کا آپ کو علم ہے لیکن عام مسلمانوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے وہ کس کی پیروی کریں ؟

جواب :۔ اپنے اُن علمار کی پیروی کریں جن پر انھیں اعتماد ہے۔

سوال ۴ :۔ آپ کے بنیادی نظریات میں ایک نظریہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ و رسول کے علاوہ کوئی شخصیت بھی تنقید سے بالاتر نہیں۔ کیا اصحاب رسول بھی تنقید کا نشانہ بن سکتے ہیں خاص طور پر خلفار راشدین ؟

جواب :۔ بات وہی ہے جو آپ نے نقل کی ہے، معصومیت تو صرف اللہ و رسول ہی کی حیثیت ہے اس میں کسی کو کیا اختلاف ہوسکتا ہے۔ صحابہ کرام کے اختلافات مشاجرات، لغزشات تو ایک مسلّمہ حقیقت ہیں ایسی صورت میں نقد و تبصرہ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ بات نہایت واضح اور غیر نزاعی ہے، لیکن میرے اس نظریئے پر علمار دیوبند کا سارا طبقہ ٹوٹ پڑا اور اس مقدّس جہاد میں حصّہ لینے کے لئے ہر عالم نے اپنی سعادت مندی سمجھی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب میں یہ نظریہ بیان کرتا ہوں تو مجھ پر بے دینی، گستاخی، بلکہ کفر کے فتوے دیئے جاتے ہیں لیکن یہی نظریہ جب امام شافعیؒ اور اُن جیسے دوسرے ائمہ بیان کرتے ہیں تو انھیں قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے اور اُن پر کوئی فتویٰ لاگو نہیں ہوتا ؟

اس موقعہ پر مودودی صاحب نے میری حیرت اور استعجاب کو محسوس کیا اور ایک صاحب سے کہا ذرا کتاب "نورالانوار" لایئے ؛ جب کتاب لائی گئی تو کہا مولوی صاحب آپ نے یہ کتاب ضرور پڑھی ہوگی ؟

میں نے کہا ہاں یہ تو ہمارے نصابِ تعلیم کی بنیادی کتاب ہے۔

اس میں مبحث بافعال النبی صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ ۲۲۱ نکال کر کہا دیکھئے تنقید سے بالاتر والی بات آپ کے ائمہ کرام کہہ رہے ہیں اور جب میں کہتا ہوں تو کیا جرم کیا؟ پھر یہ علماء کیوں شور مچا رہے ہیں ؟

چند سکنڈ کیلئے میں لاجواب سا ہوگیا اور میرا ذہن اس جانب منتقل ہوا کہ عجیب بات ہے دورانِ تعلیم ہمیں یہ بات کبھی بھی محسوس نہ ہوئی اور نہ اس پر ہمارے اساتذہ نے تنبیہ کی ؛ بات اپنی جگہ ہے۔ لیکن اللہ نے رہنمائی کی بحث کی اس نازک موڑ سے اچانک صرفِ نظر کیا جہاں تک مجھے یاد ہے کہنے لگا۔

مولینا! اس نظریئے کے بارے میں ہم نے امام شافعیؒ کو کب بخشا ہے جو آپ کو بخشیں گے ؟ پھر کیا تھا مجمع ہنس پڑا، کہنے لگے طالب علم اپنی ہار کبھی نہیں مانتا۔

میں خاموش ہوگیا اس کے بعد روئے سخن مقامی علماء کی جانب چل پڑا۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ میرا زمانۂ طالب علمی تھا۔ ایسی عمر میں عموماً برجستہ جواب نکل جاتا ہے ہمارے نصابِ تعلیم میں علمِ منطق وفلسفہ کا جو خصوصی اہتمام ہے غالباً اس کی یہی حکمت ہوگی۔

مولانا مودودی میرے اس جواب کا وزن محسوس کریں یا نہ کریں بہرحال حق بات تھی جو بے ساختہ زبان سے نکل پڑی۔

میرے اساتذۂ کرام نے جب یہ کہانی سنی تو بہت محظوظ ہوئے اور دعائیں دیں علم فقہ کے میرے خصوصی اُستاذ مفتی مظفر حسین صاحبؒ (ناظم مظاہر علوم سہارنپور) نے جماعتِ اسلامی کے نظریۂ تنقید پر ایک عالمانہ و پُر معنی تبصرہ فرمایا جو نہ صرف اہل علم کیلئے راہ نما اصول کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ہر عقل سلیم کیلئے نورِ ہدایت ہے، فرمایا ! تنقید و تبصرہ علومِ اسلامی میں زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے خاص طور پر محدثین کرام میں یہ علم مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کرلیا ہے۔ اس کے ذریعہ حق و باطل صحیح و غیر صحیح، ضعف و قوت کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ ٹھیک اس کے بالمقابل تحقیر و تذلیل ہے۔

تحقیر اور تنقید اگرچہ دو مستقل حقیقت ہیں لیکن دونوں صورۃً ہم شکل اور ایک جیسے ہیں دونوں کے حدود بھی ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں، اگر تنقید کرنے والا اِن حدود کا پاس ولحاظ نہ رکھے تو وہی تنقید تحقیر کے حُدود میں آجاتی ہے۔ چونکہ اہلِ علم اِن حدود کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں اس لئے اُن کی تنقید میں ادب و شائستگی تہذیب و شرافت نمایاں رہتی ہے۔ انتہیٰ۔

بہرحال تنقید والی بات ختم ہوئی جیسا کہ میں نے کہا ہے مودودی صاحب کا روئے سخن مقامی علمار کی جانب چل پڑا تھا۔ اِن دنوں جامع مسجد نیلا گنبد (لاہور) میں شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کا خطبۂ جمعہ سے پہلے وعظ ہوا کرتا تھا شہر میں اس کی غیر معمولی شہرت تھی۔ مولانا کے وعظ کی یہ خصوصیت تھی کہ ہر جملہ ایک مستقل دلیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ وعظ میں دلائل و براہین کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ سننے والے کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوتا، ڈاکٹرس، انجینرس، وکلار، اور حکومت کے سر برآوردہ حضرات کثیر تعداد میں جمع ہوجاتے تھے۔ میری آنکھوں نے پہلی مرتبہ یہ منظر دیکھا ہے دُور دُور تک

موٹر گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتی تھیں۔

الغرض مودودی صاحب کی اس مجلس میں ایک صاحب نے مولانا محمد ادریس صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیا کہنے لگے گزشتہ جمعہ کو مولانا محمد ادریس صاحب نے اپنے وعظ میں یہ فتویٰ دے ہی دیا کہ جو لوگ تراویح کی بیس رکعت نہیں پڑھتے وہ لوگ شفاعتِ رسول ؐ سے محروم ہوں گے۔

اُس پر مودُودی صاحب نے ایک چبھتا ہوا جملہ کس دیا سب لوگ ہنس پڑے مولانا محمد ادریس صاحب کی شخصیت سے مودُودی صاحب ناواقف یا کم واقف نہ تھے۔ مولانا کی شخصیت اس وقت ہندوپاک کے مشاہیر علماء میں ممتاز اور مسلّم تھی علومِ قرآنیہ میں جو تبحرِ علمی حاصل تھا وہ بہت کم علماء کو نصیب رہا ہے مولانا قدیم آسمانی کتابیں تورات، زبور، انجیل کے بھی عالم تھے علمِ حدیث میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے علاوہ ازیں کئی ایک علمی وتحقیقی کتابوں کے مصنف بھی، تقسیمِ ہند کے بعد لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں استاذ الاساتذہ کی حیثیت سے جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد میں درس وتدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

بہرحال شفاعتِ رسول ؐ والی بات پر مودُودی صاحب کے چبھتے ہوئے جملے سے میں متأثر ہوا اور مداخلت کرتے ہوئے کہہ دیا۔

مولانا! شفاعتِ رسول والی بات ایسی نہیں ہے جو آپ سے نقل کیجا رہی ہے میں خود اس وعظ میں شریک تھا، مولانا محمد ادریس صاحب نے ایسی بات قطعاً نہیں کہی ہے وہ یہ بیان کر رہے تھے کہ ایمان باللہ کے بعد اتباعِ رسول ہی نجات وشفاعت کا ذریعہ ہیں اسی ضمن میں تراویح کا بھی ذکر آگیا تھا وبس۔

میری اس وضاحت پر مودودی صاحب نے فرمایا دیکھئے یہ صاحب اس وعظ میں شریک تھے اور بات ختم ہوگئی۔ مغرب کا وقت ہوگیا اسی سبزہ زار پر نمازِ مغرب ادا کی گئی اور میں سلام و مصافحہ کرکے رخصت ہوگیا۔

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ

شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس صاحبؒ (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) اکابر علماء میں شمار ہوتے ہیں، تقسیم ہند سے پہلے ہند کی بین الاقوامی درس گاہ دارالعلوم (دیوبند) کے شیخ التفسیر رہے ہیں، موصوف شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور محدث کبیر مولانا انور شاہ کشمیری کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے، کمالِ علم وفضل سے سرفراز تھے موصوف کے علمی کارناموں کا تذکرہ مظاہر علوم (سہارنپور) میں سنا کرتا تھا۔ ملاقات کی دلی خواہش تھی۔ سفر لاہور میں یہ خواہش بھی پوری ہوگئی ایک دن موصوف کے گھر گیا مختصر تعارف کے بعد مولانا کے بہت قریب ہوگیا۔ مولانا کے ساتھ پہلی ہی مجلس میں کامل تین گھنٹے گزارے ان دنوں ہندوستان میں مسلم کُش فسادات کا دور دورہ تھا ہر طرف مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا جارہا تھا ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہو رہے تھے مسلمانوں کے قتلِ عام سے پاکستان کے مسلمان نہایت بے چین و بے قرار تھے۔ مولانا محمد ادریس صاحب اُن حضرات میں شامل تھے جو مسلمانوں کے اس اندھے قتل پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ ملاقات کی اس ساری مجلس میں یہی تذکرہ چلتا رہا مولانا نہایت جذباتی انداز میں اس قتل عام کا ذمہ دار حکومتِ ہند کو قرار دیتے رہے۔ اور مسلمان فاتحین کے سابقہ تذکرے کرتے رہے کہ انھوں نے مفتوحہ ممالک میں اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیسا کیسا حُسنِ سلوک کیا ہے، مسلمان فاتحین کا یہ عجیب وغریب تاریخی تذکرہ تھا اور ایک نادر عنوان بھی جو عام طور پر سُنا نہ گیا۔

میں تو خالی ذہنی ہیں مولانا کی ملاقات کے لئے آیا تھا اے کاش کہ اس تذکرے کو محفوظ کر لیتا تو ایک بے مثال تاریخی دستاویز بن جاتی جو آنے والے جابر و ظالم حکمرانوں کیلئے درس عبرت ثابت ہوتی۔

مولانا نے اس موقعہ پر مسلسل تین گھنٹوں تک اپنی تقریر جاری رکھی جوش و بیقراری کا یہ عالم تھا کہ بیٹھے بیٹھے کھڑے ہو جاتے اور کبھی بے دم ہو کر لیٹ جاتے مولانا کا تکیۂ کلام "مولوی صاحب" تھا ہر پانچ سات منٹ بعد مولوی صاحب مولوی صاحب کہکر خطاب فرماتے ایک موقعہ پر بے خود ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے مولوی صاحب مجھکو صرف تین دن کی حکومت دیدی جائے تو میں ہندوستان کے ان سارے کافروں کو مظلوم مسلمانوں کے خون بہا میں تہہ تیغ کر دوں گا۔ پھر ذرا سنبھل کر فرمایا۔ مولوی صاحب میں یہ کوئی جذباتی یا نفسانی تقاضے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے ہاں اُس پر شرعی دلیل موجود ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضؓ کو جب یہ اطلاع ملی کہ مُلکِ یمن میں بارہ یا پندرہ آدمیوں نے مل کر ایک مسلمان کا خون کیا ہے اور قاتل کا پتہ نہیں کہ کون شخص تھا؟ اُس پر سیدنا عمر فاروق رضؓ نے قصاص میں اُن سب کے قتل کا حکم جاری کیا۔ بعض صحابہؓ نے اس فیصلے پر اعتراض کیا کہ ایک شخص کے قتل پر بارہ انسانوں کا قتل کیونکر درُست ہے؟

سیدنا عمر فاروق رضؓ نے فرمایا۔ اگر شہر صنعآء (یمن) کے تمام لوگ ایک مسلمان کے قتل پر جمع ہو جاتے تو میں اُن سب کے قتل کا حکم جاری کر دیتا۔

مولوی صاحب اس وقت ہندوستان کے سارے ہندو واجب القتل ہیں واجب القتل ہیں۔ بہر حال مولانا سے اجازت لے کر اپنے ٹھکانے آیا۔ لیکن جب تک لاہور میں قیام رہا ہر جمعہ مولانا کا وعظ سننے جامع مسجد نیلا گنبد جایا

کرتا تھا۔ اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ حَسَنَاتِہٖ وَارْفَعْ دَرَجَاتِہٖ۔

مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ

یہ بزرگ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اجلّہ خلفاء میں شمار ہوتے ہیں جامع مسجد نیلا گنبد (لاہور) کے مختصر رقبے میں جامعہ اشرفیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی تھی جو بعد میں پاکستان کی عظیم دینی درسگاہ ثابت ہوئی۔ موجودہ دور ۱۹۹۲ء میں فیروز پور روڈ (لاہور) وسیع و عریض احاطہ میں اس کی اپنی شاندار عمارت ہے۔ مولانا محمد حسن صاحب کا تذکرہ طالب علمی دور میں اکثر سنا کرتا تھا خصوصیت سے یہ بات کہ موصوف کے دائیں پیر کے کسی مہلک مرض میں ڈاکٹروں نے ان کے پورے پیر کو کاٹ دیا تھا۔

جب آپریشن کا وقت آیا تو ڈاکٹروں نے انھیں حسب معمول بیہوش کرنا چاہا لیکن مولانا اس تجویز پر راضی نہ ہوئے اس کے بعد اپنی تسبیح ہاتھ میں لے لی اور ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے اسی حالت میں اپنا کام پورا کرلیا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

جیسا کہ میں نے گزشتہ اوراق میں بارہا لکھا ہے کہ بزرگوں کی زیارت اور اُن کی خدمت میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مفتی محمد حسن صاحب کے اس غائبانہ تعارف کے بعد ۱۹۵۸ء میں لاہور کے اس علمی سفر نے یہ موقعہ بھی فراہم کر دیا۔

مولانا کے ہاں ہر روز بعد نماز عصر عمومی مجلس ہوا کرتی تھی، قیام لاہور کے دوران ہر روز اس مجلس میں شرکت کرتا تھا مجلس بڑی پُر وقار ہوا کرتی تھی۔ مولانا بہت کم بولتے تھے بلکہ سکوتِ کامل کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایک صاحب مولانا تھانویؒ کے ملفوظات یا وعظ پڑھ دیا کرتے تھے اور مجلس اسی پر برخواست ہو جاتی۔

یہ تو بعد ہی میں معلوم ہوا کہ بعض بزرگوں کی مجلس قال نہیں حال ہوا کرتی ہے مفتی محمد حسن صاحبؒ کی یہ مجلس بھی کچھ اسی قسم کی تھی، مولانا پر ہر وقت ایک حال سا طاری رہا کرتا تھا اور چہرے پر رعب وجلال۔

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ مَضْجَعَهٗ وَبَرِّدْ مَرْقَدَهٗ

مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ

زمانۂ طالب علمی میں جن بزرگوں کی زیارت نصیب رہی ہے اُن میں شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ بھی ہیں موصوف، شیخ الہند مولانا محمد الحسن صاحب اسیرِ مالٹا کے خصوصی شاگرد اور خادمِ سفر وحضر، جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث رہے ہیں۔

مولانا کو اگر دیکھنے کا موقعہ نہ ملتا تو شاید سلف صالحین کے عادات و اطوار کا مشاہدہ نہ ہوتا، صورت شکل، رفتار وگفتار، لباس وسادگی میں اسلاف کا نمونہ تھے مولانا کے درسِ بخاری شریف میں کئی ایک بار شرکت کی سعادت بھی نصیب رہی ہے اس کے علاوہ مولانا کے دسترخوان پر تناولِ طعام کا بھی شرف حاصل ہوا ہے۔ مولانا کا یہ وسیع وعریض دسترخوان تھا جو ہر معروف وغیر معروف مہمان کیلئے عام تھا۔ ساٹھ ستّر مہمان ہر وقت شریکِ دسترخوان رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حیدرآباد دکن کے ایک نواب صاحب زیارت کے لئے تشریف لائے قدیم حیدرآبادی رسم ورواج کے تحت جُھک جُھک کر ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنا، بات بات پر ہاتھ جوڑ کر جی حضور، جی حضور کہنا، ادب واحترام کے ساتھ دو زانو بیٹھے رہنا، نگاہیں نیچی، پست آواز، مولانا مدنیؒ کی مجلس میں گویا اپنے آپ کو قید وبند کی شکل میں کر لیا تھا، ماشاء اللہ بھاری بھر کم بدن بھی تھے۔

اثنا ئے مجلس مولانا مدنیؒ کے ہر ارشاد پر جُھک جُھک کر بجا ہے حضور، بجا ہے حضور کہتے، مولانا مدنیؒ ان کی خود گرفتاری پر فرماتے نواب صاحب بے تکلف بیٹھ جائیے۔ تو نواب صاحب جی حضور کہکر ادب واحترام میں اور اضافہ ہی کر دیتے۔ کھانے کا وقت آیا نواب صاحب اُسی ادب واحترام کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ گئے، دسترخوان پر مولانا مدنیؒ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ خود تو برائے نام تناول کرتے مہمانوں کو دسترخوان کی اشیاء پیش کرتے جاتے حتیٰ کہ دسترخوان کا آخری مہمان بھی اس عطا وکرم سے محروم نہ ہوتا تھا، مولانا مدنیؒ جب بھی نواب صاحب کو روٹی عنایت کرتے، نواب صاحب نہایت ادب احترام سے بلا تاخیر لے لیتے اور اپنے ہاتھ میں رکھ لیتے پھر تبرکاً ایک آدھ لقمہ چکھتے، جب ہاتھ میں دو چار روٹیاں جمع ہوگئیں تو مولانا مدنیؒ نے فرمایا نواب صاحب تناول کیجئے؟ نواب صاحب نے جی حضور کہہ کر ایک لقمہ لے لیا وبس۔ فراغتِ طعام کے بعد مولانا مدنیؒ نے فرمایا نواب صاحب اب آرام کیجئے؟ بس کہنا ہی تھا کہ اُسی جگہ فوراً لیٹ گئے۔ حاضرین کو نواب صاحب کی یہ نقل وحرکت ایک عجوبہ محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں قدیم حیدرآبادی تہذیب وتمدن سے محظوظ ہو رہا تھا۔

ایسے ہی مولانا مدنیؒ کی ایک اور مجلس میں شریک تھا عصر کے بعد کا وقت تھا حاضرین کی چائے وبسکٹ سے تواضع کی جا رہی تھی اس وقت باہر کے مہمان کچھ زائد ہی تھے ان میں سیاسی لیڈر بھی تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مدنیؒ نے آخر وقت تک سیاسی جماعتوں میں کانگریس کا ساتھ دیا ہے اس وقت پاکستان کی مسلم مملکت کو قائم ہوتے۔ دس بارہ سال بھی پورے نہ ہوئے تھے۔

مولانا کی اس مجلس میں کانگریس کی بے وفائی، وعدہ خلافی اور بے رُخی پر بعض جمعیتی علمار تبصرہ کر رہے تھے مولانا مدنیؒ خاموش سماعت فرما رہے تھے۔ اس موقعہ پر اچانک ایک چونکا دینے والا انکشاف میرے کانوں نے سُنا اور آنکھوں نے مشاہدہ کیا۔

مولانا مدنیؒ فرمانے لگے کانگریس سے ہم نے عرش مانگا تھا لیکن ہمیں فرش دیا گیا۔

پھر رُوئے سخن پھیر کر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ مولانا تھانویؒ (مولانا اشرف علی صاحب) کی قبر کو انوارات سے بھر دے اُن کی آنکھیں چالیس سال پہلے آج کا منظر دیکھ رہی تھیں [1]

ممکن ہے مولانا مدنیؒ کے الفاظ کی نقل میں کچھ تسامح ہو لیکن جہاں تک مفہوم و مقصود کا تعلق ہے انشاء اللہ ایسے ہی تھا جس کو میں نے نقل کر دیا ہے۔ اللّٰھمّ اغفرلہٗ وارحمہٗ

جب میں نے اپنے بعض کانگریسی دوست علمار سے حضرت مدنیؒ کا یہ تبصرہ بیان کیا ہے تو ان میں سے بعض نے فوری تردید کر دی اور بعض نے شک و شبہات کی نظروں سے دیکھا۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا

لیکن میں نے یہ ضرورت نہ سمجھی کہ انھیں اطمینان دلا دوں۔

البتہ ان سطور کے قاری حضرات سے وہی عرض کروں گا جس کی ایک

---

[1] مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ روزِ اوّل ہی سے کانگریس کے مخالف تھے اور اسکے لیڈر کو طاغوت کہا کرتے تھے

حکایت اللہ تعالیٰ کی کتاب نے ہم سے بیان کی ہے

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى الآیۃ (النجم آیت ۱۲)

اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

مولانا مدنیؒ کا سنِ وفات ۱۹۵۸ء ہے یہی سال ہماری تعلیمی فراغت کا تھا شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ درسِ بخاری دے رہے تھے ایک صاحب نے دیوبند سے آکر شیخ الحدیث کو اطلاع دی کہ حضرت مدنیؒ کا انتقال ہوگیا ہے۔ شیخ الحدیث نے درس بند کیا اور طلبہ سے فرمایا۔ پیارو! حضرت مدنیؒ کا انتقال ہوگیا ہے۔ آؤ سب مل کر دُعا کریں، دُعا کے بعد شیخ الحدیث دیوبند کیلئے روانہ ہوگئے طلبہ بھی تیزی سے اسٹیشن پہنچے۔ اسپیشل ٹرین تیار کھڑی تھی، راقم السطور بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیوبند پہنچا۔

دیوبند میدانِ حشر کا منظر پیش کر رہا تھا ہر جانب سے سینکڑوں قافلے چلے آرہے تھے۔ دارالحدیث اور دارالتفسیر میں ہزاروں لوگ قرآن خوانی میں مشغول تھے تدفین رات دیر گئے ہوئی اس وقت تک اکیس ۲۱ ہزار قرآن شریف کے ختم ہو چکے تھے یہ سلسلہ تین یوم تک جاری رہا بعد میں معلوم ہوا کہ چالیس ۴۰ ہزار سے زائد ختم قرآن کی سعادت شیخ مدنیؒ کو نصیب رہی ہے۔ اَللّٰھُمَّ تقبلہٗ وارحمہٗ واکرم نزلہٗ ووسع مدخلہٗ

خادم الکتاب والسنۃ

عبد الرحمٰن غفرلہٗ

جدہ، سعودی عرب۔ ۲۸ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

حضرت مولانا محمد عبد الرحمٰن صاحب مظاہری

استاذ حدیث و تفسیر، ناظم (اول) مجلس علمیہ حیدرآباد

خلیفہ مجاز حضرت محی السنۃ مولانا الشاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم کی

تصنیفات

۱: "سیرت انبیاء کرام" (ہدایت کے چراغ) دو جلدوں میں، انبیاء و رسل کی دعوت و تبلیغ اور قرآنی واقعات پر مشتمل ایک تفصیلی محققانہ کتاب۔ صفحات ۱۴۰۰۔

۲: "قرآنی تعلیمات" بلند ترین اخلاقِ اسلامی پر مشتمل ۹۹ آیاتِ قرآنی کی تفسیر اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتاب "مسائل السلوک" کی عام فہم توضیح و تشریح۔ صفحات ۷۵۰۔

۳: "مفرامین رسولؐ" صحابہ کرامؓ کے سوالات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس جوابات اور انکی تشریح صفحات ۵۱۲

۴: "یومٌ عظیمٌ" حوادثِ قیامت کی قرآنی تشریح۔ صفحات ۳۱۱۔

۵: "کاروانِ حیات" حصہ اول دوم۔ مصنف کے تحصیل علم اور دعوت و تبلیغ کی صبر آزما "آپ بیتی" صفحات ۳۶۲

۶: "فتاویٰ الرسول الاکرمؐ" (عربی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاویٰ شریف۔ صفحات ۴۰۸۔

۷: "منتخب دعائیں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع دعاؤں کا مجموعہ مع تشریحات۔ صفحات ۲۰۰۔

۸: "سراجاً منیراً" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی و خاندانی سیرت۔ صفحات ۱۰۰۔

۹: "آخری سفر" سکرات سے تدفین تک، جملہ ہدایات قرآنی و حدیث و آثار صحابہ کی روشنی میں صفحات ۱۰۰۔

۱۰: "آیۃ الکرسی" قرآنی آیت، آیۃ الکرسی کا مکمل تعارف و ترجمہ (کتابچہ)

۱۱: "دعاؤں کی چہل حدیث" احادیث کی چالیس جامع دعاؤں کا مجموعہ۔ (کتابچہ)

۱۲: "التذکرہ" اکیس ۲۱ جلیل القدر تابعین کا تذکرہ۔ (زیر طباعت)

ناشر:-

ربانی بک ڈپو

کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی ۶

فون:- ۳۲۱۰۱۱۸ - ۳۲۱۷۸۴۰

کتابیں ملنے کے دیگر پتے:-

مکتبہ اشرفیہ۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی۔ ۲

ہندوستان پیپر ایمپوریم چار کمان پتھر گٹی۔ حیدرآباد (اے پی)

مکتبہ احیاءِ سنت ۷/۵۹/۵/۱ جامع مسجد ٹین پوش لال ٹیکری۔ حیدرآباد۔ اے پی

مدرسہ اشرف العلوم، اکبر باغ حیدرآباد۔ (اے، پی)

سرتاج ٹیلرس، تلک روڈ عابد شاپ حیدرآباد (اے، پی)

باسمہٖ تعالیٰ

کاروانِ حیات

حصّہ دوم

طلبہ علوم دین اور دعوت و تبلیغ کا کام کرنیوالوں کیلئے

ایک ایمان افروز تذکرہ

تالیف:-

مولانا محمد عبد الرحمٰن صاحب

استاذ حدیث و تفسیر و ناظم (اوّل) مجلسِ علمیہ حیدرآباد

خلیفہ مجاز حضرت محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب مدظلہ العالی

ناشر:-

ربانی بک ڈپو کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی

۱:۔ نامِ کتاب :۔ ـــــ کاروانِ حیات جلد دوم

۲:۔ مؤلّف :۔ ـــــ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب حیدرآبادی

۳:۔ باہتمام :۔ ـــــ ربّانی برادران

۴:۔ طباعت :۔ ـــــ ربّانی آفسیٹ پریس

۵:۔ سن طباعت :۔ ـــــ جولائی ۱۹۹۹ء

۶:۔ تعداد :۔ ـــــ ایک ہزار ایک سو۔

۷:۔ قیمت :۔ ـــــ

ناشر :۔

ربانی بک ڈپو کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی

فون نمبر:۔ ۳۲۱۰۱۱۸ — ۳۲۱۷۸۴۰ ۔

فہرست مضامین کاروانِ حیات جلد دوم

کاروانِ حیات
دعوت و تبلیغ

علمی فراغت کے بعد

جیسا کہ لکھا گیا ہماری علمی فراغت ۱۹۵۷ء کے اواخر کی تھی اس سن عیسوی کو تاریخ ہند میں ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ اس سن عیسوی سے ٹھیک سو سال پہلے ۱۸۵۷ء میں ہمارے اچھی مدارس علمیہ کے علماء نے اقلیم ہند پر غیر مجاز انگریزوں کے ناجائز اقتدار کے خلاف تحریک آزادئ ہند کا آغاز کیا تھا جو تقریباً سو سالہ جدوجہد کے بعد غیر ملکی انگریز حکام کی بے دخلی کی شکل میں نتیجہ خیز ہوئی اور برصغیر ہند پر دو مملکتوں (بھارت و پاکستان) کا قیام عمل میں آیا۔ ہماری تحصیل علمی کا آخری سال بھی منجانب اللہ ۱۹۵۷ء قرار پایا۔

گذشتہ اوراق میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ قصبۂ گنگوہ (ضلع سہارنپور یوپی) کے مردِ قلندر مولانا عبدالرشید (عرف ننھے میاں) سے ملاقات پر موصوف نے یہ الہامی قسم کی پیش گوئی کی تھی کہ شہر حیدرآباد (دکن) میں آپ سے شرک و بدعت کے خلاف خوب کام ہوگا اور توحید و سنت کی عام اشاعت ہوگی۔

مردِ قلندر کی قلندرانہ بات آہی گئی ۱۹۵۷ء میں علمی فراغت کے بعد اپنے وطن حیدرآباد آیا۔ یہاں دو قسم کے تقاضے سامنے تھے۔ دینی و علمی سرگرمی کی تلاش

دوسرے حصول معاش کے اسباب۔ علوم دین کے طلبہ کو ہر دور میں یہی دو تقاضے پیش آتے ہیں۔

حوادثِ زمانہ کہیئے یا شامتِ اعمال، معلوم نہیں کس صدی ہجری سے مسلمانوں میں علوم نبوت کے ان وارثوں کی بے قدری رائج ہوگئی۔ انہیں جہاں اپنے حاصل کردہ علوم کی نشر واشاعت کے باضابطہ مواقع نہیں وہاں حصول معاش کا بھی کوئی مستقل انتظام نہیں ملتا۔ فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ

تقریباً ایسی ہی کچھ صورت حال سے میں بھی دوچار ہوا اپنے وطن آیا دُور دُور تک ایسا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا جہاں اپنی علمی و دینی جد وجہد کا آغاز کرسکوں، شہر میں لے دے کر ایک علمی مدرسہ تھا لیکن وہ بھی نظری و فکری طور پر بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ بقول مولانا ارشاد احمد صاحبؒ مبلغ دارالعلوم (دیوبند) بریلویت اور شئی ہے رضاخانیت اور شئی! معلوم نہیں کس شیطان نے دونوں کو ایک کردیا۔ بہرحال (اتفاق زمانہ کہنا تو خود ایک کافرانہ اصطلاح ہے) ان دنوں اس مدرسہ کی زمام انتظامی کشادہ ذہن و فکر رکھنے والے مسلمانوں کے ہاتھ تھی۔ نواب مقصود جنگ بہادر اس کے صدر انتظامیہ تھے لیکن موصوف نے اپنی پیرانہ سالی اور ضعف و کمزوری کے باعث مدرسہ کی صدارت جناب مجاہد علی صاحب عباسی (سیکرٹری فنانس حکومت آندھرا پردیش) کے حوالہ کردی تھی۔ انہی دنوں مدرسہ کے لئے میں نے اپنی علمی خدمات پیش کیں ـــ لیکن وہ تعطل کا شکار ہوگئیں۔

دینی خدمات کا دوسرا میدان شہر کی مساجد کا تھا جہاں امامت و خطابت کے ذریعہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی خدمات انجام دی

جا سکتی تھیں لیکن جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے اُس وقت شہر کی بیشتر مساجد اہل بدعت کے زیرِ انتظام تھیں۔ ان مساجد میں کسی صحیح العقیدہ، توحید و سنت کی دعوت دینے والے عالم دین کے استقبال کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی، ایسے ہمت شکن ماحول میں چھ آٹھ ماہ یوں ہی گذر گئے۔ مرشدِ اوّل حضرت میر امام الدین صاحبؒ نے بیرون شہر جانے کا مشورہ دیا بلکہ موصوف نے دو ایک مقام پر امامت و خطابت کا بھی انتظام فرما دیا تھا لیکن اب یاد نہیں کن وجوہ کی بناء پر عمل آوری نہ ہو سکی۔

آخر کار شہر بمبئی سے میرے ایک بھائی صاحب نے جہاں وہ ملازمت کرتے تھے مجھکو اپنے ہاں طلب کر لیا، تھوڑی بہت کوشش کے بعد اپنی کمپنی میں ملازمت کا انتظام کر دیا۔ کام تو چھوٹا موٹا ہی تھا لیکن ناجنس ماحول میں دل گھٹتا رہا وہی حقیقتِ گم شدہ کی تلاش تھی۔ غالباً دو ڈھائی سال اسی ماحول میں گذر گئے، بزرگوں نے سچ کہا ہے ہر شر میں کچھ نہ کچھ خیر پوشیدہ ہوا کرتا ہے میرے یہ دو سال ضائع نہ گئے، اس دوران حفظ قرآن کا سلسلہ شروع کر چکا تھا۔ بحمد اللہ ڈیڑھ سالہ مدت میں حفظ قرآن کی سعادت سے بہرہ ور ہو گیا۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ۔

حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد بمبئی میں مزید قیام کی گنجائش نظر نہ آئی دل بار بار ملامت کرتا رہا کہ ؎

تو کس منزل کا راہ رو تھا اور کس منزل پر آگیا

پھر سفر کا ارادہ قوی ہو گیا کمپنی کی اجازت کے بغیر اپنے وطن حیدرآباد واپس آگیا، پھر یہاں وہی سابقہ تنگیٔ معاش کا مسئلہ پیش آیا لیکن اس دفعہ قلب مطمئن تھا۔ معاشی زندگی کا تجربہ پا چکا تھا علمی و دینی خدمات کی انجام دہی کا

ارادہ پختہ ہوگیا۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔

انہی دنوں شہر حیدرآباد سے قریب قصبہ بھونگیر کے ایک اہل خیر مستاجر الحاج عبدالقیوم صاحبؒ کو کسی ذریعہ میرا تعارف ملا وہ تشریف لائے اور پہلی ہی ملاقات میں باصرار اپنے ساتھ بھونگیر لے آئے۔

اہل قصبہ نے پرجوش استقبال کیا اور مقامی مسجد کی امامت وخطابت اور چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت کی خدمات سپرد ہوگئیں سلسلہ شروع ہوگیا، خارجی اوقات میں تعلیم بالغان اپنے طور پر شروع کیا۔ چند ہی ہفتوں میں دینی وتبلیغی ہلچل ظاہر ہونے لگی اور اہل قصبہ کے عمر رسیدہ بزرگوں نے یہ شہادت دی کہ پچاس سال قبل کا ماحول لوٹ آرہا ہے جہاں قصبے کے ایک صاحب نسبت بزرگ حضرت شاہ جلیل قادریؒ نے اپنی ایمانی خدمات سے قصبہ کو معمور کر رکھا تھا۔ لیکن اہل قصبہ کو بہت جلد یہ کہنا پڑا ؎

وہ چراغ اپنا بجھا گئے، وہ دکان اپنی اٹھا گئے

میں قصبۂ بھونگیر چھوڑ کر حیدرآباد واپس آگیا۔

مدرسہ نظامیہ (حیدرآباد) قصبہ بھونگیر کا قیام تو خواہی نخواہی اختیار کرلیا تھا لیکن قلبی طور پر مطمئن نہ تھا میں کسی ایسی خدمت کا متلاشی تھا جہاں اپنے حاصل کردہ علم کو دوسروں تک پہنچا سکوں، ظاہر ہے یہ تمنا کسی علمی ودینی مدرسہ کے بغیر ممکن نہ تھی، انہی دنوں یہ دعا بھی کرتا رہا الٰہی کم ازکم پندرہ سال درس وتدریس کا موقع فرمادیجئے تاکہ پڑھا ہوا سبق دوسروں کو پڑھادوں (اس دعا کی قبولیت کا واقعہ آئندہ صفحات میں آرہا ہے)

قیام بھونگیر کے زمانے میں وقتاً فوقتاً شہر حیدرآباد آیا جایا کرتا تھا ایسے ہی ایک موقع پر مقامی اخبارات میں مدرسہ نظامیہ (حیدرآباد) کی مجلس انتظامی کا اعلان شائع ہوا۔

"مدرسہ کے لئے ایک معلم دینیات کی ضرورت ہے ماہانہ مشاہرہ ساٹھ (۶۰) روپے ہوگا، مدارس دینیہ کے فارغین رجوع ہوں"

میرا قلب غالباً اسی اعلان کا انتظار کر رہا تھا میں نے اپنی خدمات پیش کردیں، دوستوں نے نہایت تعجب کا اظہار کیا کہ قصبہ بھونگیر کے مدرسہ میں ماہانہ ڈھائی سو (۲۵۰) روپے دیئے جارہے ہیں اس کو نظرانداز کردینا کچھ مناسب بات نہ ہوگی لیکن بہرحال میں نے یہ اقدام کرہی لیا۔

مدرسہ نظامیہ میں میری تقرری کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔ میں نے اپنے بعض اساتذہ کرام اور بزرگوں کو بارہا سنایا ہے یہاں اس کے تذکرے سے جہاں علوم دین کے طلبہ کو علمی خدمات انجام دینے کی رغبت ہوگی وہاں دینی و علمی میدانوں میں جرأت و بے باکی کا حوصلہ بھی پیدا ہوگا۔

انٹرویو

واقعہ کی تفصیل سے پہلے ایک چھوٹا سا لطیفہ بھی سن لیجئے۔ جب میں نے اپنی ملازمت کے لئے درخواست پیش کی تو صدر مجلس انتظامی جناب محامد علی صاحب عباسی نے اپنی دانست میں یہ چونکادینے والا انکشاف فرمایا:۔

"مولوی صاحب! آپ کو بھی انٹرویو دینا پڑے گا، ہمارے اعلان پر آٹھ دس علمائے جو سب کے سب فاضل نظامیہ ہیں آزادانہ انٹرویو دینے سے انکار کردیا ہے جس کی وجہ سے تقرر کا التواء کردیا گیا،،

"کیا آپ اس صورت حال کے لئے تیار ہیں؟"

میں نے اُسی وقت ہاں تو کر لی لیکن دل وساوس و تشویشات سے بھر گیا، زندگی میں پہلی مرتبہ لفظ "انٹرویو" سنا معنی و مفہوم سے بالکل ناآشنا تھا کہ انٹرویو کیا ہوتا ہے؟ ہاں تو بہرحال کرنی تھی وہ بے خوف و حجاب کر ہی دی تاریخ انٹرویو لے کر سیدھے اپنے ایک دوست جناب مقبول احمد صاحب (سیکرٹری نظام چیریٹی ٹرسٹ حیدرآباد) کے ہاں پہنچا اور قصہ سنایا۔ موصوف بے ساختہ ہنس پڑے کہنے لگے مولوی صاحب انٹرویو کوئی جرمانہ یا سزا نہیں ہوتا آپ خواہ مخواہ تشویش میں پڑ گئے، انٹرویو دراصل امتحان کی ایک قسم ہے۔ آپ کے ذاتی تعارف اور قابلیت کے بارے میں دو چار سوالات کئے جائیں گے آپ ان کا جواب دیدیجئے بس انٹرویو ہو چکا میں نے کہا بس اتنی بات یہ بھی کوئی امتحان ہوا؟

(بعد میں سابقہ انٹرویو کی یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ امیدوار حضرات سے کہا گیا تھا کہ درس گاہ میں طلبہ کے سامنے کسی علمی مضمون پر برجستہ تقریر سنی جائے گی لیکن سب امیدواروں نے برجستہ تقریر کی شرط قبول نہ کی بلکہ دیئے گئے عنوان پر پندرہ منٹ کی مہلت طلب کی جس کو انٹرویو لینے والی جماعت نے قبول نہ کیا تھا)

بہرحال ہم اپنی تاریخ انٹرویو پر صدر مجلس انتظامی کے ہاں پہنچے موصوف نے سابقہ انٹرویو کی کہانی سنائی اور وہی برجستہ تقریر والی بات دُہرائی، میں نے برجستہ تقریر کی، اس شرط کو قبول کر لیا بس میرا انٹرویو ہو گیا، دوسرے لمحہ میرے ہاتھ میں منظوری کا کاغذ تھا۔ فرمایا یہ کاغذ شیخ الجامعہ صاحب کے حوالے کر دیا جائے آپ کا تقرر کر لیا گیا ہے۔

میں نے صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور شاداں و فرحاں اپنے گھر آیا۔

دوسرے دن جامعہ نظامیہ پہنچا مفتی رحیم الدین صاحب شیخ الجامعہ تھے کاغذ حوالہ کیا دیکھکر فرمایا:

"صاحبزادے مبارک ہو بالا بالا چلے آئے"

بہرحال مختصر گفتگو کے بعد "مولوی جماعت اوّل" میں بیٹھنے کا حکم دیا میں نے تعمیل کی ابھی میں جماعت میں طلبہ کا تعارف حاصل کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجلس انتظامی کے ارکان جن کی تعداد دس بارہ سے کم نہ تھی شیخ الجامعہ کے ہمراہ درس گاہ میں داخل ہوگئے۔ ان میں ڈاکٹرز، انجینئرز اور مقامی حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار حضرات بھی تھے، دو چار نام آج بھی خوب یاد ہیں۔ (۱) نواب رکن الدین صاحب (سابق چیف اکاؤنٹنٹ حکومت آندھرا پردیش) (۲) جناب محمد یونس سلیم صاحب (سابق گورنر صوبہ بہار و اڑیسہ) (۳) جناب مجاہد علی صاحب عباسی (سابق سیکرٹری فنانس) (۴) ڈاکٹر عبدالمنان صاحب وغیرہ۔ میں احتراماً کھڑا ہونے لگا تو کہا گیا تشریف رکھئے، پھر صاحب از خود بیٹھ گئے غالباً جناب یونس سلیم صاحب نے فرمایا۔ مولانا درس شروع کیجئے ہم صرف استفادہ کی غرض سے آئے ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ میں نہ اس کے لئے تیار تھا اور نہ مجھے قبل ازیں ایسی کوئی اطلاع تھی، تقرر کا پہلا دن نہیں پہلا گھنٹہ تھا۔ طلبہ کے آگے حدیث شریف کی کتاب "مؤطا امام محمدؒ" رکھی تھی، طلبہ بھی اس غیر متوقع صورت حال سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے وقت کی نزاکت محسوس کی ایک طالب علم سے کتاب لے لی اور دوسرے سے کہا بسم اللہ شروع کیجئے۔ طالب علم نے اپنی کتاب کھولی اور کتاب کا پہلا صفحہ بَابُ وُقُوْتِ الصَّلٰوۃ (نماز کے اوقات کا بیان) کی عبارت پڑھنی شروع کی۔ پانچ منٹ تک وہ متعلقہ احادیث پڑھتا رہا۔ اس

وقت اللہ نے میری دستگیری فرمائی۔ میں نے اس مختصر وقت میں کتاب کا حاشیہ دیکھ لیا۔ اِدھر حدیث کی تلاوت ختم ہوئی اُدھر میرا مطالعہ بھی تکمیل پایا۔ بس کیا تھا میں نے متعلقہ عنوان پر تقریر شروع کر دی، تقریر نہ صرف علمی تھی بلکہ نہایت عام فہم اور دلچسپ بھی، اپنی تقریر کا آغاز اسطرح کیا:۔

عزیز طلبہ! امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کی یہ کتاب "موطا محمدؒ" علم حدیث سے تعلق رکھتی ہے لیکن کتاب کی مضامینی ترتیب علم فقہ کے مطابق ہے۔ دراصل امام محمدؒ علم فقہ کو حدیث نبوی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے حدیث کی کتاب کو علم فقہ کی ترتیب پر مرتب کیا ہے۔ عبادات میں چونکہ پہلا رکن نماز ہے اور نماز وقت آنے پر فرض ہوتی ہے اس لئے امام محمدؒ نے اوقاتِ صلوٰۃ کا مضمون پہلے بیان کیا ہے۔

عزیز طلبہ! یہاں ایک شبہ کو حل کر لینا ضروری ہے وہ یہ کہ عام طور پر ہر کتاب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کی جاتی ہے لیکن امام محمدؒ نے اپنی اس کتاب کو بغیر بسم اللہ شروع کیا ہے جبکہ عام مسلمان بھی ایسی غفلت نہیں کرتا روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی بسم اللہ پڑھ لی جاتی ہے امام محمد جیسے عالی مقام محدث و فقیہ سے ایسی بڑی فرو گذاشت کیوں کر ہوئی؟ حقیقت یہ ہے کہ کتاب پڑھنے والے کو یہ شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن یہ نہایت سطحی قسم کا شبہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث نبوی میں ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کی جو ہدایات ہیں ان کا تعلق لکھنے سے نہیں ہے کہ ہر کام سے پہلے بسم اللہ لکھی جائے پھر کام شروع کیا جائے۔ مقصود صرف اتنا ہے کہ ہر کام سے پہلے اللہ کا نام لیا جائے۔ یقیناً امام محمدؒ نے لکھنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لی ہو گی؟ آپ نے

پر شبہ کیوں کیا کہ امام محمدؒ نے کتاب لکھنے سے پہلے بسم اللہ بھی نہیں پڑھی؟ جبکہ ایک عام مسلمان سے بھی ہم ایسا تصور نہیں کرتے، یہ آپ کی بدگمانی ہے۔ لہٰذا یہ شبہ بے بنیاد ہے۔

عزیز طلبہ! اب آپ کتاب کے مضمون کی طرف آیئے۔ یہاں امام محمد نے اپنے مضمون کا عنوان "بَابُ وُقُوْتِ الصَّلٰوۃ" لکھا ہے جبکہ عام طور پر محدثین حضرات اپنی کتاب میں بَابُ اَوْقَاتِ الصَّلٰوۃ لکھا کرتے ہیں امام محمد نے عام محدثین کے طرز سے ہٹ کر عنوان قائم کیا ہے اگرچہ "وُقُوْت اور اَوْقَات" دونوں جمع کے صیغے ہیں جن کا واحد "وُقت" ہے۔ اس لحاظ سے اَوْقَاتِ الصَّلٰوۃ کے بجائے وُقُوْتِ الصَّلٰوۃ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اوقاتِ صلوٰۃ پانچ ہیں اور جمع کا اطلاق کم از کم تین عدد سے زائد پر کیا جاتا ہے جو یہاں صحیح ہے البتہ ایک معنوی اشکال ضرور پیدا ہوتا ہے جس کو حل کر لینا ضروری ہے۔ اشکال یہ ہے کہ اگرچہ لفظ وقوت اور اوقات دونوں جمع کے صیغے ہیں لیکن معنوی طور پر وقوت جمع کثرت کے لئے آتا ہے اور اوقات جمع قلت کے لئے، اور آپ جانتے ہیں کہ جمع کثرت کا اطلاق کم از کم نو عدد یا اس سے زائد پر کیا جاتا ہے۔ عربی لغت کی اس معنوی نزاکت کے پیش نظر امام محمدؒ کے اس منفرد عنوان پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے اوقات تو صرف پانچ ہیں لہٰذا عنوان میں اوقات کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ لفظ وقوت کا استعمال جب صحیح ہوتا جبکہ نماز کے اوقات نو یا اس سے زائد ہوتے حالانکہ ایسا نہیں ہے تو پھر امام محمدؒ نے ایسی معنوی غلطی کیوں کی جبکہ وہ عربی لغت کے مسلّم امام بھی ہیں؟

بعض شارحین نے اس کا یہ جواب دیا کہ امام محمدؒ سے اس بارے میں

سہو ہوگیا، بشری تقاضے بہرحال ہر ایک پر پیش آئے ہیں۔ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام بھولے اُن کی ذریت بھی بھولنے لگی۔

نَسِیَ آدَمُ فَنَسِیَ ذُرِّیَّتُہٗ ۔ (الحدیث)

عزیز طلبہ! شارحین کا یہ جواب کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا کیونکہ ایک جانب تو امام محمدؒ کی شخصیت اور اُن کی جلالتِ علمی کا اعتراف ہے دوسری جانب اُن پر غفلت و بے علمی کا الزام بھی لگایا جا رہا ہے۔ یہ دو ایسے متضاد صفات ہیں جو عقلی طور پر قابلِ نقد و تبصرہ بن سکتے ہیں۔ البتہ صرف الفاظ پر غور کیا جائے تو اعتراض کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ لیکن یہ اہم نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ الفاظ کے ساتھ شخصیت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس صورت میں اعتراضات کے امکانات کم سے کم تر ہو جاتے ہیں۔

اس پس منظر میں ہم غور کریں تو امام محمدؒ کا عنوان "بَابُ وُقُوْتِ الصَّلوٰۃ" نہایت پُر معنی اور برمحل معلوم ہوتا ہے، شاید و باید ہی کسی اور مؤلف کی نظر وہاں پہنچی ہو اس کی مختصر تقریر غور سے سماعت فرمائیے:۔

امام محمدؒ کے اس خصوصی عنوان اختیار کرنے کے جواز پر دو دلیل ہیں (۱)، دلیل عقلی اور (۲) دلیل نقلی۔ اسلامی مسائل میں عام طور پر انہی دو دلائل سے کام لیا جاتا ہے۔

دلیل عقلی کا خلاصہ یہ ہے کہ نمازیں تو یقیناً پانچ ہی ہیں لہٰذا ان کے پانچ ہی اوقات ہوں گے لیکن پانچ اوقات کے بعد اوقات کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، دوسرے دن پھر اوقات پیدا ہو جاتے ہیں اس طرح تیسرے دن بھی، لہٰذا اوقات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو اب نمازوں کے صرف پانچ اوقات نہیں ہوئے بلکہ سینکڑوں ہو گئے۔ اس لحاظ سے "اوقات الصلوٰۃ" کے

کے بجائے "وُقُوتُ الصلوٰۃ" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

امام محمدؒ نے اس باریک نزاکت کو ملحوظ رکھکر "بَابُ وُقُوتِ الصَّلٰوۃ" لکھا ہے۔

دلیل نقلی۔ دلیل عقلی کے علاوہ دلیل نقلی بھی ہے جو ایک وجدانی حیثیت بھی رکھتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتداءً نمازیں پچاس فرض ہوئی تھیں جس کا تذکرہ احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ یہ نمازیں کم ہوتے ہوتے صرف پانچ رہ گئیں لیکن آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بشارت دی گئی کہ ادا تو صرف پانچ ہوں گی لیکن نامۂ اعمال میں پچاس ہی لکھی جائیں گی۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (الآیۃ)

اس گہری حقیقت کے بعد پچاس نمازوں کے پچاس اوقات ہی ٹھہرے لہٰذا اوقات صلوٰۃ میں جمع کثرت کا لفظ "وُقُوتُ الصَّلٰوۃ" اختیار کیا گیا جسکا اطلاق نو عدد سے زائد پر کیا جاتا ہے۔ الغرض امام محمدؒ نے اپنے عنوان میں جو ندرت رکھی وہ کسی سہو یا غفلت یا بے علمی کا نتیجہ نہیں حقیقت وصداقت پر مبنی ہے۔ اس تقریر کے بعد میں نے اوقات صلوٰۃ کی تفصیل بیان کی اس سلسلے میں ائمہ اربعہ کے مسلک بیان کئے جو جزئی اختلاف پر مبنی تھے۔

درس چونکہ طوالت اختیار کر رہا تھا اراکین حضرات اس مرحلہ پر یہ کہتے ہوئے اٹھے مولانا جزاکم اللہ، جزاکم اللہ بہت عمدہ تفہیم ہے ایسے ہی جاری رکھیئے۔

ماشاءاللہ سُبحان اللہ۔

بس ہمارا درس ختم ہوا جان بخشی گئی، غالبًا یہی ہمارا انٹرویو تھا، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه، جامعہ نظامیہ میں تقرر کے بعد یہ ہمارا پہلا درس تھا۔ اللہ کا کرم دیکھئے روز اوّل ہی حدیث شریف کا درس نصیب کیا، پھر آخر وقت تک حدیث ہی کی

خدمت میں مشغول رکھا۔

اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ
اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ
فَلَكَ الْحَمْدُ یَا رَبِّیْ

اراکین حضرات کے چلے جانے کے بعد شیخ الجامعہ مفتی رحیم الدین صاحب نے یاد فرمایا اور مبارکباد دی اور فرمایا سارے ارکان بڑی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ صاحبزادے آپ نے تقریر و تفہیم کا یہ طرز کہاں سیکھا؟

میں نے عرض کی حضرت علمی فراغت کے بعد یہ میرا پہلا ہی تو درس تھا، باقی اپنے اساتذہ کرام کو ایسے ہی درس دیتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ نے میری ایک علمی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

صاحبزادے آپ نے اوقاتِ صلوٰۃ کے بارے میں ائمہ اربعہ کے جو مسلک بیان کئے ہیں اُن میں امام مالکؒ کا وہ مسلک نہیں جو آپ نے بیان کیا ہے وہ تو امام شافعیؒ کا مسلک تھا۔

میں نے عرض کی حضرت غیر متوقع طور پر برجستہ درس کی صورت پیش آگئی میرے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آج درس دینا ہوگا ورنہ کچھ تو تیاری کر لیتا پھر میں نے مزاحاً کہا یا حضرت! اراکین حضرات کو خود اپنے گھر (حنفی مسلک) کی بھی خبر نہ ہوگی بیرونِ خانہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شیخ الجامعہ اس لطیف طنز پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

بہر حال جامعہ نظامیہ میں بحیثیت "استاد دینیات" ہمارا تقرر ہوگیا۔ یکم جون ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔

ایک تلخ حقیقت جن ایام میں ہمارا تقرر ہوا اُن دنوں مدرسہ نظامیہ کی

معاشی حالت نہایت خستہ پستہ تھی، اساتذہ کی تنخواہیں برائے نام تھیں عامۃ المسلمین کے صدقات، زکوٰۃ اور چرم ہائے قربانی کی فروخت سے مدرسہ کے اخراجات پورے کئے جارہے تھے۔

دور آصف جاہی میں مدرسہ نظامیہ کو شاہانہ سرپرستی حاصل تھی، بادشاہِ وقت ہی اس کے سرپرستِ اعلیٰ تھے اُن دنوں جامعہ نظامیہ کو ریاست کی اہم جامعات میں شمار کیا جاتا تھا ـــ اساتذہ کے بڑے بڑے مناصب قائم ہوئے اور بڑی بڑی تنخواہوں پر علماء کو درس و تدریس کے لئے مقرر کیا گیا تھا، لیکن بہت جلد یہ سارا اہتمام خواب و خیال بن گیا جب کہ ۱۹۴۸ء میں انڈین یونین کا حیدرآباد پر حملہ ہوا اور یہ دوسو سالہ آصف جاہی سلطنت ہندوستان میں ضم ہوگئی۔ مدرسہ نظامیہ چونکہ دینی و اسلامی ادارہ تھا، حکومتِ ہند نے وہ ساری مراعات ختم کردیں جو دورِ آصف جاہی میں مدرسہ کو مہیا تھیں اسطرح مدرسہ نظامیہ یتیم و لیسیر بن کر رہ گیا۔

دور آصف جاہی کا یہ المیہ ہے کہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں مدرسہ کے لئے مستقل آمدنی کا ایسا کوئی انتظام نہیں کیا جو کسی بھی ہنگامی حالات میں سہارا بنتا، اس طرح پولیس ایکشن کے بعد مدرسہ نظامیہ معاشی طور پر انحطاط پذیر ہونے لگا، چونکہ مدرسہ کی مجلس انتظامی چند مخلص سربرآوردہ حضرات کے ہاتھوں میں تھی انہوں نے اپنے شخصی اثر درسوخ سے سرکاری منجمد شدہ سرمایہ حاصل کرلیا اور عام مسلمانوں کے مالی تعاون سے مدرسہ کی کارکردگی کو جاری و باقی رکھا۔

میں نے چونکہ علمی خدمات کی انجام دہی کے لئے مدرسہ نظامیہ کا انتخاب کیا تھا اس دور کی معاشی پستی سے متاثر نہیں ہوا دہی برائے نام تنخواہ پر اکتفا کرتا رہا یقیناً یہ دور معاشی طور پر بڑا صبر آزما تھا لیکن خدمت کی اعلیٰ مقصدی میں

ع ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

دل مطمئن تھا، تدریسی سلسلہ پورے اہتمام و توجہ سے جاری رہا تحدیث بالنعمہ کے طور پر لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

"الحمدللہ! درس و تدریس میں خیانت علمی کے ارتکاب سے ہر وقت پرہیز کیا ہے، جو پڑھا لکھا تھا وہ سب کا سب دُہرا دیا۔ سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔"

مزید تفصیلات آگے آرہی ہیں:۔

خطابت جامع مسجد ملّے پلّی

مدرسہ نظامیہ میں تقرر کے بعد جامع مسجد ملّے پلّی (حیدرآباد) کی جمعہ والی خطابت ملی جس سے عوامی دعوت و تبلیغ کی راہیں فراہم ہوئیں۔ جمعہ کا ہر خطبہ دوسرے جمعہ کے لئے پیام دعوت ثابت ہونے لگا چار چھ ماہ کے اندر اندر مصلیوں کی تعداد سہ چند ہو گئی پھر بہت جلد مسجد کی توسیع بھی عمل میں آئی۔

مسجد کے قُرب و جوار میں بڑے بڑے کالج و مدارس تھے جن میں مسلم طلبہ کی اکثریت زیر تعلیم تھی اس لئے قدرتًا نوجوان طلبہ کی اکثریت نماز جمعہ ادا کرنے آیا کرتی تھی میں نے اس زرخیز صورت حال سے فائدہ اٹھایا نوجوان طلبہ میں دینی و علمی شعور پیدا کرنے کی مہم شروع کر دی اور یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ دورِ آصف جاہی کے دوسو سالہ اقتدار میں خاندانی اور روایتی قسم کے مشائخ نے آبار پرستی، قبر پرستی پر اس درجہ توجہ دی تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت رسومات و بدعات کو دین و ایمان کی شکل سمجھنے لگی تھی، اس غیر اسلامی نظر و فکر پر گاہے ماہے علماء حق کی آوازیں بلند ہوا کرتی تھیں لیکن مستقل طور پر اجتماعی جدوجہد کا کوئی سلسلہ نہ تھا، جامع مسجد ملے پلی کی خطابت میں شرک و بدعات کے خلاف پہلی بار اجتماعی جہاد

کا آغاز کیا گیا جس کے بعد اہل علم حضرات کے لئے "مجلس علمیہ" اور عامۃ الناس کے لئے "مجلس اشاعت اسلام" کی شکل میں دو تحریکیں وجود میں آئیں۔ پہلی تحریک علماء کرام کے لئے مخصوص کی گئی تھی ،اور دوسری تحریک سے عام مسلمانوں میں توحید و سنت کی اشاعت عام ہوئی اور شرک و بدعات کی دیواریں ڈھیر ہونے لگیں جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بہرحال جمعہ کے اس خطاب میں کالج و مدارس کے طلبہ کی ذہن سازی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ یہ اُس وقت کے مرض کی صحیح تشخیص تھی۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اور اسکی عملی صورت گری یہ اختیار کی گئی کہ ہر جمعہ ایک اسلامی مسئلہ کی دعوت دی جاتی تھی کہ آئندہ جمعہ تک اس پر غور و خوض کیا جائے ،کیا اس سے بہتر کوئی اور صورت ہوسکتی ہے یا اس کے متبادل کوئی اور صورت بھی ممکن ہے؟ طلبہ کے لئے جن کا ذہن و فکر تحقیق و جستجو چاہتا ہے اسطرح کے عنوان بڑی کشش کا باعث ثابت ہوتے اسطرح ہفتہ بھر طلبہ میں دینی تذکرے رہا کرتے اس کے علاوہ غور و فکر اور اہل علم حضرات سے رجوع ہونے کی راہیں فراہم ہونے لگیں، شہر کے روایتی مشائخ نے صدیوں سے جن مروّجہ رسومات و بدعات کو دین و ایمان کی شکل دے دی تھی ۔طلبہ کے اس غور و فکر نے ان کے تانے بانے بکھیرنے شروع کر دیئے۔ حق و باطل، سنت و بدعت، توحید و شرک کے باہمی تضاد سے نوجوان آگاہ ہونے لگے اور ان میں تحقیق و تنقید کا جوہر نمایاں ہوا۔ اب وہ خشک کو سبز اور سبز کو خشک تسلیم کرنے پر ہرگز تیار نہ تھے اس بارے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

معراج شریف یا شبِ معراج | رجب کا مہینہ تھا، شہر میں روایتی طور پر

شب معراج کا عام چرچا تھا جلسہ ہائے شب معراج کے اعلانات اور دھوم دھام کا آغاز ہو چکا تھا یاد داشت بخیر یہی جمعہ کا دن تھا آنے والی رات شب معراج کے استقبال کے لئے منتظر تھی، مساجد کو رنگ و روغن، پھول پتیوں اور روشنیوں سے سجایا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے جمعہ کے خطبے کو معراج النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عنوان سے شروع کیا اور معراج شریف کی وہ ساری تفصیلات جو احادیث صحیحہ میں ملتی ہیں بیان کیں۔ اس جمعہ میں ویسے بھی مجمع زائد ہو گیا تھا کیونکہ پچھلے جمعہ میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ آنے والے جمعہ میں معراج النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر خصوصی خطاب ہوگا۔ حاضرین کی اسقدر کثرت تھی کہ پہلی بار مسجد سے باہر شاہراہِ عام پر بھی صفیں قائم ہو گئیں، بہرحال میں نے معراج النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تفصیل بیان کر کے اس کے قطعی ثبوت پر چار مشہور دلائل بھی پیش کئے، مجمع کا سکوت اور وقار شہادت دے رہا تھا کہ معراج النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک حقیقی واقعہ ہے جس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اختتام تقریر سے پانچ منٹ پہلے میں نے مجمع سے ایک چونکا دینے والا سوال کیا، حضرات! آپ نے معراج کی تفصیل سن لی میں اس وقت آپ کی خصوصی توجہ چاہتا ہوں اور آپ سے ایک جواب چاہتا ہوں۔

فرمائیے کیا آج شب معراج ہے؟

سوال چونکہ معمولی قسم کا تھا اس پر خصوصی توجہ نہ دی گئی پھر میں نے قدرے بلند آواز سے دُہرایا۔

کیا آج شب معراج ہے؟

اس پر ایک صاحب نے کہا تاریخ تو یہی ہے کہ آنے والی رات

شب معراج ہے۔
میں نے سوالیہ انداز میں پھر بات دُہرائی۔
کیا آج شب معراج ہے؟
ایک معمر بزرگ نے فرمایا مولانا شاید آپ کی مراد تاریخ کے اختلاف[1] سے متعلق ہے۔ لیکن اہل علم کی اکثریت نے تو رجب کی ستائیسویں شب ہی کو شب معراج کہا ہے
میں نے کہا حضرات اہل علم کی تحقیق سے ہمیں بھی انکار نہیں ہے لیکن ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا آج کی رات شب معراج ہے؟
اس وقت مجمع پر ایک تجسس اور حیرانی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور کچھ دیر نہ تھی کہ یہ سکوت کسی طوفان کا پیش خیمہ بنتا چنانچہ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

---

[1] معراج شریف کس ماہ اور کس تاریخ کو ہوئی؟ روایات صحیحہ سے دن اور تاریخ کا تعین کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے پہلے پیش آیا تھا جبکہ سنہ و تاریخ کا رواج نہ تھا البتہ علم تاریخ کے علماء نے اس بارے میں پانچ قول لکھے ہیں: ربیع الاول، ربیع الثانی، رجب، رمضان، شوال۔ پھر دن کے بارے میں مختلف اقوال ہیں بہرحال مورخ ابن قتیبہ دینوری (المتوفی ۲۶۷ھ) اور علامہ ابن عبدالبر (المتوفی ۴۶۳ھ) اور امام رافعیؒ اور امام نوویؒ اور محدث عبدالغنی مقدسیؒ نے رجب ہی کے مہینے کو ترجیح دی ہے اور آخر الذکر نے ۲۷ رجب کی بھی تصریح کی ہے۔ سن ہجری کے بارے میں بھی اختلاف ہے البتہ یہ بات تو قطعی ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت مدینہ سے پہلے پیش آیا۔ بعض اہل علم نے ہجرت سے دو سال پہلے اور بعض نے ایک سال پہلے نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرات! آپ خصوصی توجہ فرمائیں،
یہاں دو چیزیں جُدا جُدا ہیں ایک معراج شریف، دوسری معراج کی رات میرا سوال معراج شریف کے بارے میں نہیں ہے وہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے، سوال صرف یہ ہے کہ کیا آج کی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہونے والی ہے؟ بس بات ختم ہوگئی۔ مجمع پر سکون واطمینان کا فیضان لوٹ آیا۔
پچھلی صفوں سے آوازیں آئیں، ایسا تو نہیں ایسا تو نہیں۔ میں نے اپنی بات ختم کرلی اور معذرت طلب کی کہ مجھکو صرف یہی کہنا تھا اس کے بعد خطبہ اور نماز کی تیاری شروع ہوگئی۔
پانچ منٹ کا یہ خطاب زلزلہ یا طوفان ثابت ہوا —— نمازِ جمعہ کے بعد پورا مجمع یکجا ہوگیا ویسے بھی ہر جمعہ کو نماز کے بعد ایک گھنٹہ عام مجلس ہوا کرتی تھی جس میں خطاب جمعہ کی مزید تفصیل کے علاوہ مختلف مسائل اور سوالات کے جوابات دیئے جاتے تھے لیکن آج کی اس مجلس میں معراج شریف اور شب معراج کا عنوان ہی زیربحث رہا کہ معراج ایک تھی اور شب بھی ایک ہی وہی اوّل وہی آخر۔ اس معجزے پر چودہ سو سال گذر چکے ہیں۔ یہ معجزہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہر سال تو کجا دوسری بار بھی پیش نہیں آیا حالانکہ اس معجزے کے بعد آپؐ تقریبًا دس بارہ سال تک حیات رہے ہیں، تو پھر مسلمانوں میں ہر سال ۲۷ر رجب کو معراج کا عقیدہ معلوم نہیں کس غلط فہمی کے نتیجے میں رائج ہوگیا اور عام مسلمان شب معراج کو شب قدر یا شب برات کی طرح منانے لگے ہیں۔ ہماری اس وضاحت پر عمر رسیدہ بزرگوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ہماری زندگی میں پہلی مرتبہ یہ حقیقت سامنے آئی ورنہ ہم بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے۔

اس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا، ایک صاحب نہایت جذباتی انداز میں کہنے لگے :۔

مولانا! تو پھر ہر سال شب قدر بھی نہ منائی جائے ؟

دوسرے صاحب نے اس پر مزید یہ حاشیہ جڑ دیا کہ ۲۷ رجب ہی کو تاریخ سے اڑا دیجئے ؟

ایک تیسرے نے اس پر یہ مہر ثبت کر دی بہتر ہے معراج ہی کا انکار کر دیجئے

بس قصہ تمام ہوا۔ ہم نے سب کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ضبط و تحمل سے اعتراضات سنے اور آزادی سے ہر ایک کو کہنے سننے کا موقع دیا۔ ابھی ہم جواب ہی دینا چاہتے تھے کہ ایک صاحب دخل اندازی کرتے ہوئے کہنے لگے مولانا ان حضرات نے غالباً آپ کی وضاحت سنی نہیں یا پھر سمجھنے کی کوشش نہیں کی' بات واضح ہے آپ نے مسئلہ کا حق ادا کر دیا۔ فجزاکم اللہ خیراً میں نے سب حضرات سے پھر گذارش کی کہ وہ مجھے مزید کہنے کا موقع دیں۔ جب مجمع خاموش ہوا تو میں سوال کرنے والے حضرات سے یوں مخاطب ہوا :۔

جناب آپ سے صرف یہی پوچھنا چاہتا ہوں یہ فرمائیے کہ آنے والی رات کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہو گی ؟

اس پر وہ صاحب منہ تکنے لگے۔ مجمع میں ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں نہیں نہیں نہیں، معراج شریف تو چودہ سو سال پہلے ہو چکی ہے۔ اب قیامت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

بات ختم ہوئی، پھر میں نے اس شبہ کو دور کرنا چاہا کہ پھر شب قدر، شب برأت بھی ہر سال منانا نہ چاہیئے۔ حضرات آپ کو شب قدر یا شب برأت کی آمد پر شبہ ہو رہا ہے۔

غور سے سنیئے شب براءت اور شب قدر ہر سال منائی جاتی ہے کیونکہ یہ دو راتیں ہر سال آتی ہیں جب بھی رمضان المبارک کی ستائیسویں شب ہوگی (قول مشہور کے مطابق) شب قدر آئے گی۔ اس طرح جب ہر ماہ شعبان کی پندرہویں شب ہوگی شب براءت آئے گی، یہ ایسے ہی ہے جیسے ہر عید پر شب عید آتی ہے (عید الفطر و عید الاضحی) اور ہر جمعہ پر شب جمعہ آتی ہے۔ چودہ سو سال سے ہر سال شب قدر، شب براءت، شب عید، شب جمعہ مسلسل آرہی ہیں اور قیامت تک آتی رہیں گی، اس لئے ان راتوں میں عبادت کرنے اور دعا و ذکر و تلاوت کرنے کی احادیث شریفہ میں ترغیب آئی ہے۔ اور ان مبارک راتوں کو غفلت و لہو و لعب میں گزار دینا خیر سے محرومی قرار دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت سے آج تک ہر دور میں ان راتوں کی بیداری اور عبادت گزاری کا معمول چلا آرہا ہے بخلاف شب معراج کے کہ اسکو نہ صحابہ کرام نے منایا نہ تابعین عظام نے منایا اور نہ ائمہ کرام و محدثین و مفسرین حضرات نے، شب معراج منانے کی کچھ بھی اصل ہوتی تو یہ حضرات ضرور مناتے بہرحال شب معراج صرف ایک مرتبہ آئی اور پھر قیامت تک اس کا سلسلہ بند ہوگیا۔ لہٰذا اس رات کا ہر سال منانا نہ شرعی طور پر درست ہے اور نہ عقلی اور استدلالی طور پر[1]۔

---

[1] دراصل غور و فکر کے زاویے بدل نہیں گئے بلکہ بدلوا دیئے گئے ہیں اسکی ذمہ داری ان روایتی و خاندانی مشائخ پر عائد ہوتی ہے جن کی ساری دلچسپی محفل آرائی اور مجلس نمائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ہمارے ملک کے بعض شہروں میں شیعہ حضرات ہر ماہ محرم کی دسویں تاریخ کو یوم ماتم (رونا پیٹنا) مناتے ہیں (باقی صفحہ آئندہ پر)

بہرحال جمعہ کی یہ مجلس برخاست ہوئی پھر کیا تھا، شہر میں آناً فاناً یہ تذکرہ چل پڑا اور بات دور دور تک پھیل گئی۔ جن لوگوں کے قلوب میں صلاحیت اور حق طلبی تھی وہ تو اس پیام کے داعی بن کر سامنے آگئے اور جن کے قلوب پراگندہ اور شرک و بدعت آلود تھے انہوں نے ہماری اس وضاحت کو "انکارِ معراج" کا عنوان دیا۔ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا۔

صدائے بازگشت لیکن ہمارا یہ خطبہ اس وقت نازک صورت اختیار کر گیا جب اس کی صدائے بازگشت جامعہ نظامیہ میں پہنچی جہاں ہم "استاذِ دینیات" کی حیثیت سے مدرس تھے۔ اُن دنوں مفتی رحیم الدین صاحب شیخ الجامعہ تھے۔ اس واقعہ کے دو ہفتے بعد موصوف نے مجھکو طلب فرمایا اور خالی الذہن سے پوچھا:۔

معراج شریف کے بارے میں علماء دیوبند کا کیا مسلک ہے؟

میں نے کہا وہی جو آپ حضرات کا مسلک ہے۔

پھر فرمایا، کیا علماء دیوبند میں معراج جسمانی یا روحانی کا کوئی اختلاف ہے؟

میں نے کہا نہیں بالکل نہیں تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ معراج جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوئی ہے اور اس موضوع پر اُن کی مستقل کتابیں بھی ہیں۔

پھر دریافت کیا، کیا آپ کا عقیدہ اس کے خلاف ہے؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور ماتم بھی ایسا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت بھی اُن کے کسی یار وفادار نے منایا نہ ہو اور اس عمل کو شیعہ ——— "یوم شہادت" کہتے ہیں۔ گویا ہر سال ۱۰ محرم کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوا کرتی ہے اور غم میں یہ لوگ نڈھال ہو جاتے ہیں کچھ ایسا ہی معاملہ مسلمانوں نے خوشی و مسرت میں شبِ معراج کا بنا لیا ہے۔

میں نے کہا نعوذ باللہ منہ، ایک مسلّمہ حقیقت کا انکار کر کے میں اپنا ایمان کیوں خراب کرلوں ؟

پھر فرمایا : کیا آپ نے پچھلے دنوں معراج پر کوئی تقریر کی ہے ؟

میں نے کہا جی ہاں دو ہفتے پہلے جمعہ کا خطبہ اسی عنوان پر تھا۔

فرمایا شاید آپ نے اُس خطبے میں معراج شریف کی اہمیت گھٹا دی ہے ؟

میں نے کہا ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے معراج شریف کے ثبوت پر چار محکم دلیلیں پیش کی تھیں اور یہ ثابت کیا تھا کہ معراج شریف جسم اور روح کے ساتھ ہوئی ہے البتہ معراج شریف اور شبِ معراج کا فرق ظاہر کیا تھا کہ شبِ قدر کی طرح شبِ معراج ہر سال نہیں آتی، معراج صرف ایک رات پیش آئی پھر قیامت تک اس کا کوئی امکان نہیں رہا۔

مفتی صاحبؒ نے میری اس وضاحت کو قبول فرمایا لیکن یہ بھی فرمایا صاحبزادے موجودہ دور میں ایسی باتیں مناسب نہیں ہیں عام طور پر اس سے انتشار ہو جاتا ہے۔ جو سلسلہ چل رہا ہے اُس کو روکنا نہ چاہیئے۔ اس بہانے سے عام مسلمانوں کو کچھ عبادت کرنے کا موقع مل جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے جی ہاں کہکر خاموشی اختیار کرلی[۱] اور بات ختم ہوگئی۔

ع رسیدہ بود بلائے وَلے بخیر گزشت

---

[۱] بعد میں معلوم ہوا کہ شہر کے ایک نامی گرامی عالم جن کو اُن کے معتقدین "ابو حنیفۂ ثانی" فقیہ زمانہ وغیرہ وغیرہ جیسے القاب سے یاد کرتے تھے ہمارے اُس جمعہ والے خطبے میں موجود تھے، وہ کسی دعوت میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے قریب ہی جامع مسجد تھی نماز کے لئے آ گئے، موصوف نے جامعہ نظامیہ میں مذکورہ بات پہنچائی۔
اللہ اُن کی مغفرت فرمائے۔

پکّی آگ

ان ہی ایام سنہ ۶۴-۱۹۶۳ء کی بات ہے جبکہ جمعہ کے خطبات میں کالج کے طلبہ کی ذہن سازی کی مہم جاری تھی۔ نوجوان طلبہ کی روز افزوں کثرت نے جامع مسجد (ملے پلی) کو علمی مرکز کی حیثیت دی تھی۔ اس کے علاوہ شہر کا تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقہ بھی دور دراز محلوں سے نماز جمعہ کے لئے آنے لگا تھا اس طرح ہر جمعہ کا پیام شہر کے ہر محلے میں جا پہنچا، یہ ایک ایسی خاموش تبلیغ تھی جو از خود پھلتی پھولتی رہی۔ حج کا زمانہ تھا، مسلسل تین جمعوں کا خطاب حج کے موضوع پر رہا۔

شہر کے ایک نامی گرامی شاعر شاذ تمکنت جو ان دنوں نظام کالج کے لیکچرار تھے ہر جمعہ اپنے شاگردوں کی جماعت لے کر جمعہ سننے تشریف لاتے تھے اور نماز کے بعد فوری واپس بھی ہو جاتے تھے لیکن حج کے آخری خطبہ کو سنکر نماز کے بعد ٹھہر گئے اور عوامی مجلس میں شرکت کی۔ مجلس کے اختتام پر بعض طلبہ نے اطلاع دی کہ شاذ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میری اُس وقت تک موصوف سے ملاقات نہیں ہوئی تھی میں نے شاذ صاحب سے عرض کی کہ جناب نے انتظار کی اتنی زحمت کیوں فرمائی ملاقات فرمالیتے۔

خیر خیریت کے بعد شاذ صاحب نے فرمایا:

مولانا صرف ایک بات عرض کرنے کھڑا رہا آپ تین جمعہ سے حج پر بیان فرما رہے ہیں ہماری بے قراری تو اس حد تک آچکی ہے کہ آج ہی مکۃ المکرمہ پرواز کر جائیں۔ کیا آپ بھی ایسی بے قراری سے دو چار ہیں ؟

سوال عجیب قسم کا تھا ع "اگر گویم زبان سوزد"

بہر حال میں نے شوخیٔ ناز میں کہہ ہی دیا:

شاذ صاحب! جو آگ دوسروں کو تپا دے اس کی اپنی تپش کیسی ہوگی ؟

وہ کچی آگ ہے جس میں دھواں ہو ۔ وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو
پھر مجلس برخاست ہوگئی ۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۔

نزالا خواب

گذشتہ صفحات میں اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں کثرت سے خواب آیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ اسی زمانے سے اولوالعزم انبیاء کرام کی منامی زیارات کے علاوہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے بارہا مشرف ہوتا رہا ہوں۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حضرت جبریل امین کی زیارت بھی دو مرتبہ ہو چکی تھی ۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مقدس جماعت کی زیارت بھی نصیب رہی۔ نامی گرامی اولیاء اللہ کی زیارات بھی وقتاً فوقتاً ہوئی ہیں اور اس حقیقت کا بھی اظہار انشاء اللہ خیر ہی ہوگا کہ اللہ رب العزت کی منامی زیارت سے بھی دو مرتبہ عزت پائی ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔

ان ساری زیارات کو تاریخ وار قلمبند کرتا رہا۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۔ (الآیہ)

امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں اہل علم کی یہ عام روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو سو مرتبہ خواب میں دیکھا ہے ۔ بہرحال اچھے خواب کمالات نبوت کا حصہ[1] ہوتے ہیں اور دنیا میں بشارت و خوشخبری بھی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بھی اس فضل عظیم سے نوازا گیا ہے ۔

---

[1] بعض نادانوں نے نبوت کے حصے سے مراد نبوت سمجھی ہے ۔ احادیث میں اچھے خواب کو کمالاتِ نبوت کا حصہ کہا گیا ہے نبوت یا رسالت نہیں کہا گیا۔

(خواب کیا ہیں ؟ اُن کی کیا حقیقت ہے ؟ شریعت اسلامی میں اُن کا کیا مقام ہے وغیرہ وغیرہ اس کی مکمل تفصیل ہماری کتاب " ہدایت کے چراغ جلد اول صفحہ ۳۵ پر مطالعہ کیجئے جو اس مسئلہ کی قرآنی وضاحت ہے۔)

خطابت جمعہ کے ابتدائی ایام میں ایک رات خواب آیا، خواب اسقدر طویل تھا کہ پوری رات گذر گئی۔ میں کسی گم شدہ حقیقت کی تلاش میں اپنے آپ کو ایک لق دق جنگل میں حیران و سرگردان پھرتا نظر آیا۔ دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان نہ تھا۔ کچھ دیر بعد دور کی پہاڑی پر ایک گنبد نما عمارت نظر آئی آناً فاناً وہاں تک پہنچ گیا۔ گنبد کا راستہ خمیدہ اور پیچ تاب قسم کا تھا۔ تنگ راستوں کو قطع کر کے اوپر پہنچا۔ دیکھا کہ گنبد کے اندر ایک اونچی قبر تخت نما ہے گنبد میں اور کوئی نہ تھا تنہائی کی وجہ سے وحشت ہونے لگی۔ اُلٹے پیر واپس ہونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ صاحب قبر اسی طرح اُٹھ بیٹھے گویا تخت کے اوپر آرام کر رہے تھے خوف ودہشت طاری ہونے لگی پشت پھیری ہی تھی کہ آواز دی اور ہاتھ کے اشارے سے طلب فرمایا، اشارہ کیا تھا گویا مقناطیسی کشش تھی جو مجھ کو خواہی ونخواہی ان کی طرف کھینچ رہی ہے اور بے ارادہ وبے اختیار کھینچا جا رہا ہوں، نہایت عاجزی سے کہنا شروع کیا۔

حضرت مجھے معاف فرمادیں، حضرت مجھے معاف فرمادیں

لیکن حضرت کا دستی اشارہ برابر کھینچ رہا ہے یہاں تک کہ میں حضرت کے قریب ہوگیا تو فرمایا تشریف رکھیئے میں نے پھر وہی معذرت کے کلمات کہے۔ فرمایا گھبرایئے نہیں قریب آجایئے۔ دیکھا کہ حضرت کی صورت وشکل نہایت پُر وقار ہے گھنی ڈاڑھی آنکھیں عنابی، جسم بھاری بھرکم، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ اپنے مقابل بٹھا کر اپنا ہاتھ میری جانب دراز کیا، پھر پوری قوت سے اپنی

ہی جانب اپنا ہاتھ اس طرح کھینچنے لگے گویا کسی وزنی چیز کو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا جاتا ہے۔

اس عمل پر میرا جسم ٹوٹنے لگا اور میں وہی کلمات دُہرا رہا ہوں حضرت مجھے معاف فرمادیں۔ لیکن حضرت نے تسلی دیتے ہوئے پھر وہی عمل کیا اس کے بعد حضرت کا یہ عمل مسلسل ہونے لگا، ہر بار ایسا معلوم ہوتا کہ جسم کے رگ رگ کو کھینچا جارہا ہے لیکن کوئی چیز باہر نکلتے نظر نہ آئی۔ حضرت کی اس جدوجہد سے میں بے دم اور رنڈھال ہوگیا اور وہی معذرت کے کلمات دُہرا رہا ہوں لیکن حضرت میری معذرت پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ میں نے دیکھا کہ اس کشاکشی سے حضرت پسینے میں شرابور ہوگئے ہیں اور پیشانی سے پسینہ ایسا بہہ رہا تھا گویا چشمۂ آب ہے۔

اس کے بعد اپنا ہاتھ روک لیا اور دھیمی آواز میں زیرِلب کچھ کلمات کہے جن کا مفہوم یہ تھا کہ داغنے کی ضرورت ہے۔ میں یہ سنکر بے اختیار رو پڑا اور وہی معذرت کے کلمات کہے حضرت نے پھر تسلی دی اور اپنے قریب کرلیا نیچے ایک انگھیٹی آگ کے بڑے بڑے انگاروں سے لبالب تھی لوہے کی ایک سلاخ کو اس میں ڈبو دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد نکالا تو وہ بھی آگ کی طرح سرخ تھی۔ پھر میری پشت کو اپنی جانب کرلیا، اس وقت میرے ہوش وحواس گم ہوگئے اور میں کمان کی طرح جھک گیا۔ حضرت نے میری پشت پر گرم گرم سلاخ سے داغنا شروع کیا۔ اس پر وہ سلاخ ٹھنڈی ہوجاتی پھر اسکو گرم کرتے اور داغتے جاتے لیکن ہر بار وہ ٹھنڈی ہوجاتی اللہ ہی کو معلوم کتنی بار گرم کیا اور داغتے گئے۔ آخر مرتبہ لمبی سانس لی اور یہ فرماتے ہوئے سلاخ پھینک دی الحمدللہ صفائی ہوگئی۔

گنبد کے ایک گوشے میں حکیم محمد حسین صاحب استاذ حدیث جامعہ نظامیہ کھڑے نظر آئے موصوف کے ادب واحترام کا یہ حال تھا گویا حالتِ رکوع میں

جارہے ہیں۔ حضرت نے ان کی جانب مخاطب ہوکر فرمایا حکیم صاحب آپ نے دیکھا آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہو گیا ہے۔ حکیم صاحب دست بستہ جی حضور بجا ہے جی حضور بجا ہے فرمانے لگے۔

اس کے بعد حضرت نے مجھ کو اپنے اور قریب کر لیا اور مبارکباد دی، میں حیران تھا کہ مبارکباد کس بات کی دی جارہی ہے۔ اب میں بے دم ہو چکا تھا حضرت نے اپنے کسی خادم کو اشارہ کیا اُس نے فوری ایک "خوانِ نعمت" لاکر رکھ دیا اوپر سے کپڑا ہٹایا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بڑا پیالہ (جیسے دکنی زبان میں بادیہ کہتے ہیں) پرندوں کا تازہ تازہ پکا گوشت اور خوش رنگ شوربے سے لبالب ہے اور نہایت خستہ سات عدد نان بھی ہیں، حضرت نے اُن تمام روٹیوں کو شوربے میں ڈال دیا پھر فرمایا تناول کیجئے۔ میں نے عرض کی حضرت مجھے معاف فرمادیں میں بہت تھک گیا ہوں گھر جاکر کھا لوں گا اجازت دیجئے۔ فرمایا گھر بھی خوان آجائے گا فی الحال یہ تو کھالیں،

حضرت کے اصرار پر میں نے کھانا شروع کیا واللہ طعام ایسا ہلکا اور خفیف قسم کا تھا کہ پورا پیالہ صاف ہوگیا اور مجھے کچھ گرانی تک محسوس نہ ہوئی اس کے بعد حضرت نے فرمایا اچھا اب اجازت ہے، میں واپس ہوا۔ راستے میں جا بجا لوگ ملنے لگے بجائے سلام کے مبارک مبارک کہتے اور میں اس پر توجہ نہ کرتا آخر گنبد سے زمین پر اُتر آیا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ راستے میں ہر گزرنے والا مبارک، مبارک کہکر گزرتا۔ کچھ دیہاتی عورتیں بھی ملیں جو اپنے سروں پر پانی کے گھڑے لئے جا رہی تھیں انہوں نے بھی مجھکو مبارک، مبارک کہا اس کے بعد کچھ اجنبی لوگ سامنے آئے اور مبارک مبارک کہکر یہ اطلاع دی کہ دیچے واڑہ (آندھرا پردیش کا ایک صنعتی ضلع) کی طرف لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں

میں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اس طرح جب میں اپنے گھر پہنچا دروازے پر والد مرحوم انتظار کر رہے تھے انہوں نے دیکھتے ہی مبارک مبارک کہا۔ میں نے عرض کی بابا میں بہت تھکا ہوا ہوں، شام تک آرام کرنا چاہتا ہوں کوئی ملاقات کے لئے آئے تو براہ کرم مجھے بیدار نہ کیجئے۔ یہ کہکر میں اپنے تخت پر سو گیا شام تک والد صاحب آنے والے حضرات کو رخصت کرتے رہے، مغرب یا عشاء کے بعد بیدار ہوا خواب ہی میں نماز کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک صاحب وہی خوانِ نعمت لے کر حاضر ہوئے اور کہنے لگے حضرت نے رات کا کھانا بھیجا ہے دیکھا تو وہی تازہ تازہ گوشت والا شوربا اور پانچ عدد نان ہیں۔ بھوک خوب لگ رہی تھی ساری روٹیاں شوربے میں ڈبو کر کھانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں پیالہ صاف ہو گیا خواب ہی میں تین دن تک ایسے ہی خوانِ نعمت آتے رہے۔

جب ہمارا خواب اس مرحلہ پر آیا تو اس کے اختتام کی یہ صورت ہوئی کہ ہمارے ایک چچا مرحوم ہر روز صبح اہل محلہ کو نماز فجر کے لئے آواز دیا کرتے تھے اپنے معمول کے مطابق انہوں نے مجھکو بھی آواز دی اکثر تو میں بیدار ہوتے ہی "جی ہاں میں اُٹھ گیا" یا ایسا ہی کوئی کلمہ کہتا تھا لیکن اس خواب والی رات ان کی آواز پر میں بیدار ہوا اور جواب میں بجائے جی ہاں کے بلند آواز میں حسین شاہ ولی کہدیا۔

مرحوم نے اس کو محسوس کیا لیکن آگے بڑھ گئے، میں بیدار ہو چکا تھا، مجھکو خود تعجب ہوا کہ میں نے آج کیا حرکت کی ہے بس یہاں ہمارا خواب اختتام پذیر ہوا نماز فجر کے بعد میں نے اپنی والدہ مرحومہ سے دریافت کیا اماں جی یہ حُسین شاہ ولی کون ہیں؟ بچپن میں والدہ مرحومہ سے سنا کرتا تھا کہ وہ کسی مہینہ کا نام حُسین شاہ ولی اللہ لیا کرتی تھیں، قدیم دکنی زبان میں سال کے بارہ مہینوں کے

ناموں میں ماہ جمادی الاولیٰ کا نام "شاہ مدارؒ" اور ماہ جمادی الثانی کا نام "حسین شاہ ولی" ماہ ذوالقعدہ کا نام "بندہ نوازؒ" اور ربیع الثانی کا نام "دستگیر" اس طرح کچھ اور مہینے بھی بزرگوں کے نام پر تھے۔ بہرحال والدہ مرحومہ حسین شاہ ولی کو اس سے زیادہ نہ جانتی تھیں البتہ یہ ضرور پوچھا آج تم نے چچا مرحوم کے جواب میں یہ نام کیوں لیا؟ پھر میں نے پورا خواب سنایا۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ خواب جامع مسجد (ملے پلی) کی خطابت کے اوائل میں پیش آیا، اُن دنوں حکومت کے محکمہ صنعت و حرفت کے ڈائریکٹر جناب محمد حسین صاحب تھے، یہ صاحب پابندی سے میرے درس و خطابت میں آیا کرتے تھے، موصوف کے نام کی مشابہت پر یہ خواب انہیں سنایا تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور کہنے لگے مولانا یہ بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں[1] ان کا مزار شہر سے باہر محلہ ٹولی چوکی میں ہے آج کل میرا آفس بھی اس کے قریب ہے چلیے آپ کو زیارت کرادوں۔

موصوف چاہتے تھے کہ وہ بھی ساتھ رہیں ویسے بھی میں تنہا زیارت کرنے سے خوف کر رہا تھا۔ موصوف کے ساتھ گیا۔ عمارت اور گنبد اس طرح تھے جیسا کہ خواب میں دیکھا تھا اور راستے بھی کچھ ویسے ہی پیچ دار تھے، زیارت کرکے واپس ہوا۔ کوئی خاص بات پیش نہیں آئی ع بسلامت روی و باز آئی

---

[1] حضرت حسین شاہ ولیؒ دسویں صدی ہجری کے اولیاء اللہ میں شمار ہوتے ہیں نسبی و ارادتی سلسلے میں دکن کے مشہور و معروف بزرگ خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اپنے شیخ و مرشد کی ایماء پر شہر حیدرآباد کا انتخاب کیا اور یہاں تاحیات تبلیغی کام جاری رکھا تھا۔

خواب کیا تھا ایک مستقل داستان تھی

اگر کوئی اس کو بیداری کا واقعہ کہے تو قبول کرنے کے لئے کوئی تیار نہ ہوگا لیکن عالم خواب کے جغرافیائی حدود عقل وفہم سے کچھ بالاتر ہوا کرتے ہیں جو امور عالمِ بیداری میں ناممکن اور محال قسم کے سمجھے جاتے ہیں وہ اس عالم کے لیل ونہار ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں اکثر تو مجاز وتمثیل کی شکل میں پیش آتی ہیں اور بعض اوقات حقیقت اور واقعہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ اور یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انبیا ورسل کے خواب حقیقت ہی حقیقت ہوا کرتے ہیں۔ انبیاء بنی اسرائیل میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو اسی عالم خواب کا بہت بڑا حصہ ملا تھا اور انہیں مستقل طور پر تعبیر خواب کا علم دیا گیا تھا۔ غالباً سیدنا یوسف علیہ السلام پہلے نبی ورسول ہیں جنکو علوم نبوت میں تعبیر خواب کا علم ملا۔ یہی وجہ ہے کہ علما تحقیق نے علم تعبیر کو علوم نبوت میں شمار کیا ہے۔ خواب اور تعبیر خواب اور اس کا تذکرہ قرآن حکیم کی سورۂ یوسف میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نماز فجر کے بعد اپنے اصحاب سے دریافت فرماتے کیا آج رات کسی نے خواب دیکھا ہے؟ اگر کوئی بیان کرتا تو آپ اس کی تعبیر بیان فرماتے، ورنہ اپنا خواب بیان فرماتے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور دیگر کتب حدیث میں اس کے کثرت سے تذکرے ملتے ہیں اور قرآن حکیم میں بھی آپؐ کے خواب کا تذکرہ موجود ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نبوت کا آغاز خوابوں کے بعد ہی سے ہوا اور دورِ صحابہ اور دورِ تابعین میں علم خواب کے بڑے بڑے علما بھی پیدا ہوئے ہیں۔

خواب کی حقیقت جہاں ایک واقعہ ہے وہاں اس کا انکار کرنا یا اس کا مذاق اڑانا جہل کی ایک قسم ہے جو اہل علم سے ممکن نہیں۔ تفصیل ہماری کتاب

ہدایت کے چراغ جلد اول صفحہ ۳۵۵ پر مطالعہ کیجئے جو اس مسئلے کی محتاط ترین وضاحت ہے۔

ہمارے مذکورہ خواب کی حقیقی تعبیر اللہ علیم وخبیر ہی کو معلوم ہے اور ہم نے اس کی تعبیر کو اس کے حوالے کیا ہے۔

فَلَا تُزَكُّوٓا اَنۡفُسَكُمۡ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (الآیۃ)

دعوت وتبلیغ کا نیا میدان

ہم نے اپنا یہ تفصیلی خواب اس لئے بیان کیا ہے کہ اس خواب کے بعد دعوت وتبلیغ کا نیا باب مفتوح ہوا جس کا تذکرہ "کاروانِ حیات" کے مقاصد میں شامل ہے، اس لئے خواب کو میں نے کچھ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس خواب کے مختصر عرصے بعد ضلع گنٹور (آندھرا پردیش۔ ہند) سے چند حضرات شہر حیدرآباد آئے انہیں تراویح میں قرآن شریف سننے کے لئے ایک حافظ قرآن کی ضرورت تھی۔ کسی نے میری نشاندہی کی وہ میرے گھر آئے اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ میں اس وقت تک غالبًا دو مرتبہ تراویح میں قرآن شریف سنا چکا تھا لیکن مجھے اپنے حفظ پر کامل اعتماد نہ تھا۔ تراویح کی ہر چار رکعت کے وقفے میں دو ایک منٹ آگے کا قرآن دیکھ لیا کرتا تھا اس طرح پورے اعتماد واطمینان سے قرآن پڑھنے کی توفیق ہو جاتی تھی۔ میں نے ان حضرات کی طلب قبول کر لی لیکن تین شرطیں بھی پیش کیں۔

اوّل یہ کہ روزانہ سوا پارہ پڑھنے کی پابندی نہ ہوگی جسقدر بھی ممکن ہوگا پڑھوں گا۔

دوئم یہ کہ ہر چار رکعت کے وقفے میں دو ایک منٹ قرآن دیکھوں گا۔

سوئم یہ کہ مسجد ہی کے کمرے میں قیام ہوگا کسی کے گھر طعام و قیام نہ ہوگا

ان حضرات نے خوش دلی سے یہ شرطیں منظور کرلیں۔

مذکورہ خواب کا ایک جزیہ بھی تھا، چند اجنبی لوگوں نے یہ بھی اطلاع دی کہ دیجے واڑہ کی جانب سے آپ کا انتظار کیا جارہا ہے۔ اس طرح خواب کے ایک جز کی تعبیر سامنے آگئی (ضلع گنٹور ضلع دیجے واڑہ سے متصل ہے)

بہرحال رمضان المبارک سے ایک دن پہلے گنٹور پہنچا، دوسرے دن سے تراویح کا سلسلہ شروع ہوگیا تراویح کے بعد ایک گھنٹہ وعظ و تقریر کا معمول تھا مسجد "مرکز تبلیغ" کے نام سے مشہور تھی اس وقت شہر کی کسی مسجد میں حافظ قرآن نہ تھا قدرتاً مصلیوں کی کثرت ہونے لگی۔ اکثر لوگ اپنے اپنے محلوں میں تراویح پڑھکر وعظ سننے آنے لگے، اسطرح ہفتہ عشرہ میں ہر رات جمعہ کا ماحول ہونے لگا۔ سارا رمضان تبلیغی چہل پہل رہی خاص طور پر جمعہ کے خطاب کا خصوصی انتظام ہوا کرتا تھا۔

انہی ایام میں مسجد کے اندر ایک صاحب کے قریب بیٹھا تھا، وہ صاحب قرآن کی تلاوت کر رہے تھے لیکن ادائی میں غیر معمولی فرق تھا۔ میں نے دو چار دفعہ متنبہ کیا پھر آگے وہی غلطی کرنے لگے، میری نظر اُن کے قرآن پر پڑی، سخت تعجب ہوا سارا قرآن صرف تلگو رسم الخط (آندھرا پردیش کی قدیم زبان) میں لکھا ہوا ہے عربی رسم الخط نام کو بھی نہیں، زندگی میں پہلی بار ایسا قرآن دیکھنے میں آیا، دیکھنا تو درکنار سننے میں بھی نہ آیا تھا۔

میں نے اُن صاحب سے پوچھا کیا یہاں عربی قرآن نہیں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا موجود ہیں مگر اُن علاقوں میں اکثر مسلمان عربی سے واقف نہیں ہیں اس لئے تلگو قرآن پڑھتے ہیں کیونکہ یہ ہماری مادری زبان ہے اور اس کا پڑھنا پڑھانا آسان ہے۔ بس پھر کیا تھا میری غور و فکر اس مسئلہ پر مرکوز ہوگئی ہر وقت فکر سوار

تھی کہ اس طرح غیر عربی میں لکھے گئے قرآن کے منافع اور مفاسد کیا کیا ہیں اور کیا کیا ہو سکتے ہیں؟ دو دن غور کرتا رہا مسئلہ نہایت نازک تھا اور اہم ترین بھی موجودہ وقت میں اہل علم سے مراجعت کا موقع نہ تھا۔ پھر دوسرے دن جمعہ تھا بسم اللہ کہکر جمعہ کا خطبہ اس عنوان پر دے دیا کہ اس طرح غیر عربی قرآن لکھے جانے کے کیا کیا فوائد ہیں اور اس کے کیا کیا نقصانات اور اندیشے ہیں؟ پھر روز اول سے قرآن کی حفاظت کا کیا کیا انتظام کیا گیا ہے اور اس کی صحیح و اصلی شکل کو کس طرح باقی رکھا گیا ہے اور اس میں زیر و زبر کے فرق کو بھی برداشت نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت سے آج تک ہر دور میں قرآن حکیم کی اصلی شکل و صورت کو جان سے زیادہ عزیز اور ہر قسم کے اندیشوں سے محفوظ رکھنے کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے اگر اہل علم حضرات اللہ کی توفیق و ہدایت سے ایسی احتیاط و حفاظت اختیار نہ کرتے تو معلوم نہیں دوسری آسمانی کتابوں تورات، زبور، انجیل وغیرہ کی طرح قرآن حکیم بھی اپنی اصلی شکل و صورت کھو دیتا، معنی و مطلب کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ آج ایک مسلمان بچہ بھی پورے فخر و اعتماد کے ساتھ دنیا کے تمام انسانوں کو یہ پیغام دے سکتا ہے کہ اے لوگو! روئے زمین پر آج صرف ایک ہی آسمانی کتاب ایسی ہے جو اپنے نزول کے وقت سے آج تک اپنی اصلی شکل و صورت پر برقرار ہے آؤ اسکی اتباع کرو اور وہ قرآن حکیم ہے۔

اے گنٹور کے مسلمانو! تمہارے اس علاقے میں صرف تلگو رسم الخط قرآن کس نے لکھا ہے اور کس نے اسکو اجازت دی ہے اور کیا تم کو کسی عالم نے منع نہیں کیا؟ ہم قرآن حکیم میں اس قسم کی تبدیلی کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے اپنے تلگو قرآن جہاں کہیں بھی ہوں انہیں دریا برد کر دیا جائے یا کسی پاک جگہ

دفن کر دیا جائے۔ ایسی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا، خریدنا بیچنا اور اپنے گھروں اور مسجدوں میں رکھنا ہرگز ہرگز درست نہیں اللہ سے ڈرو اور اس کی کتاب کی حفاظت کرو۔ توبہ کرو، اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

جمعہ کا یہ ہنگامی خطبہ ختم ہوا مجمع پر ایک سیمابی کیفیت طاری تھی جونہی نماز ختم ہوئی ہمارا گھیراؤ کر لیا گیا اور سوالات، اعتراضات، شکوک وشبہات کا طوفان اُبل پڑا۔ اور ایسی بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں جن کا اس سے پہلے میں نے کبھی تصور تک نہ کیا ہوگا۔ میں نے مسجد کے ذمہ دار حضرات سے گزارش کی کہ اپنے اثر ورسوخ سے مجمع کو خاموش کریں پھر میں ہر ایک سوال کا جواب دے سکوں گا۔

چنانچہ ان حضرات کی مسلسل اپیل پر کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا تو میں نے سوالات کی جانب توجہ دی۔ سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ تلگو قرآن کے مرتب ومترجم انہی اطراف واکناف کے بہت بڑے عالم، مفسر قرآن اور فاضل دیوبند ہیں موصوف کا اسم گرامی مولانا عبدالغفور صاحب ہے۔ صوبۂ آندھرا پردیش کے اضلاع میں ان کی گراں قدر خدمات رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی کہ آندھرا کے غیر عربی داں مسلمان قرآن حکیم کی تلاوت کر سکیں چنانچہ عرصہ تیس چالیس سال سے تلگو قرآن ان شہروں میں پڑھے پڑھائے جا رہے ہیں۔ ہزاروں نہیں لاکھوں مسلمان ان کی اس خدمت سے مستفید ہو رہے ہیں اس طویل عرصے میں ہمارے شہر میں کئی نامی گرامی علماء تشریف لائے کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا وغیرہ وغیرہ۔

اعتراض حقیقتاً بے وزن تھا لیکن عوامی سطح پر بڑا وزنی اور اہمیت والا تھا۔ میں نے اس وقت اس میں عافیت سمجھی کہ مسئلہ کو طول نہ دیا جائے۔ اللہ

کی توفیق شامل تھی مجمع کی توجہ اپنی طرف کی اور اس طرح کہنا شروع کیا :-
حضرات ! میں آپ کے جذبات و احساسات کا احترام کرتا ہوں یقیناً آپ کے یہ جذبات اللہ کی کتاب اور اس کے دین سے وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں اور ایسا ہر مسلمان کو ہونا بھی چاہیئے لیکن جب آپ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس تلگو قرآن کے مؤلف و مرتب فاضل دیوبند ہیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس کا فتویٰ دارالعلوم دیوبند (یو پی) سے طلب کرلیا جائے وہاں سے جو بھی جواب آئے گا اُسی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ ابھی تو میں آپ کے شہر میں رمضان شریف کے آخر تک ہوں ۔ انشاء اللہ میں خود اس کا اعلان کر دوں گا۔ لہٰذا آپ حضرات صرف دو ہفتوں کا انتظار کریں اور اس عرصہ میں انتشار سے پرہیز کریں ۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری گذارش قبول کریں گے۔ فجزاکم اللہ الخیر۔

اس کے بعد شہر کے سربرآوردہ حضرات کی موجودگی میں سوال مرتب کیا ابھی سوال لکھا جا رہا تھا کہ ایک صاحب تلگو قرآن کا ایک نسخہ لائے جس کے سرورق پر دارالعلوم دیوبند کا ایک تعریفی خط موجود تھا جس میں مرتب کتاب مولانا عبدالغفور صاحب کی قرآنی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا اور ان کے اس کارنامے کو سراہا گیا تھا کہ انہوں نے غیر عربی داں مسلمانوں کی سہولت کے لئے تلاوت قرآنی کی سہولت پیدا کر دی ۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی کچھ دیر کے لئے پھر وہی ہیجانی ماحول لوٹ آیا اور گومگو کی کیفیت رہی میں اس مرحلے پر چند لمحات کے لئے کچھ کہنے سننے کی قوت کھو بیٹھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ چاروں خانے چت کرا دیا گیا ہوں کہ اچانک اللہ کی تائید و نصرت آئی میرا ذہن پھر تحفظ قرآن کی طرف منتقل ہوا

پھر حفاظت قرآن کی خاطر کسی بھی بات کو خاطر میں نہ لایا اور کہنے لگا :

"ٹھیک ہے ہمارے اس سوال کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کا یہ توصیفی خط بھی روانہ کردیا جائے، دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔"

بس پھر کیا تھا اس تجویز پر سارا مجمع چت تھا، سوال مرتب ہوا ایک صاحب جنرل پوسٹ آفس کے ذمہ دار نکلے، انہوں نے اُسی دن وجے واڑہ دہلی ایکسپریس ٹرین سے وہ خط روانہ کردیا۔ دوسرے دن دہلی پھر اُسی شام وہ خط دیوبند پہنچا۔

اللہ اللہ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

مجمع رخصت ہوا۔ شہر ہی نہیں اطراف واکناف میں اسکی صدائے بازگشت پھیلی ایک ہفتے تک ماحول گرم رہا ہر جگہ یہ تذکرہ رہا۔ غالباً رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو دو یوم باقی تھے نوید عید کی طرح جواب آگیا۔

جواب کیا تھا من چاہی مراد تھی ایسا معلوم ہوا کہ جمعہ کے میرے اس خطاب میں دارالعلوم دیوبند شریک تھا۔ میرے حرف حرف کی تائید کی گئی اور ایسے تمام تلگو قرآن کو مساجد و مدارس اور گھروں سے نکالدینے کا فتویٰ دیا گیا پھر ان سب کو دریا برد کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ ایسے تلگو قرآن کی خرید فروخت اور اس کی طباعت کو بھی ناجائز قرار دیا گیا۔

پھر آخر میں دارالعلوم دیوبند کے اس توصیفی خط کا پوسٹ مارٹم کیا گیا کہ ممکن ہے کسی مُوقتی ضرورت اور حکمت کے تحت مولانا عبدالغفور صاحبؒ کی تائید کی گئی ہو اور اُن کی اس عوامی خدمت کو سراہا گیا ہو تاہم دارالعلوم کے ریکارڈ میں ایسے کسی خط کی نقل نہیں ملی۔ بہرحال ہم کو

اس خط کے مضمون سے اتفاق نہیں ہے حق وہی ہے جو اس فتویٰ میں لکھا جا رہا ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو دو دن باقی تھے پورے شہر میں ہلچل مچ گئی کہ اس جمعہ کے خطاب میں دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ سنایا جائے گا۔ پھر کیا تھا جمعہ کے دن سارا شہر ٹوٹ پڑا۔ مسجد سے باہر دور دور تک صفیں لگ گئیں۔

تاریخ اسلامی کا نادر واقعہ

ہم نے نہایت حکمت عملی سے کام لیا اور تلگو مسلمانوں کے جذبات و مشکلات کا پاس و لحاظ کر کے مسئلے کی تفصیل بیان کی اور درمیان میں تاریخ اسلامی کا وہ نادر واقعہ بیان کیا جو سیدنا حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں پیش آیا تھا (جس کو شہر کے مسلمانوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ سنا)

شہر انطاکیہ (ملک شام) کے چند لوگ زر و جواہر اور قیمتی اشیاء کے تحفے تحائف لے کر مدینہ منورہ آئے اور امیر المؤمنین سیدنا علیؓ سے گذارش کی کہ آپ کی کتاب قرآن حکیم میں ہمارے شہر کا تذکرہ آیا ہے کہ زمانۂ قدیم میں سیدنا خضر علیہ السلام اور ان کے ہم سفر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سفر کرتے کرتے جب ہمارے شہر پہنچے اس وقت بھوک و پیاس نے ان دو بزرگوں کو بے دم

لہ بات ۱۹۶۲ء کی ہے ممکن ہے دارالعلوم دیوبند کا وہ فتویٰ اہل شہر کے ہاں موجود ہوگا تاہم پتہ لکھا جا رہا ہے مراجعت کی جا سکتی ہے۔

الحاج مرزا مستان صاحب متولی مسجد پٹتر پیٹ

ضلع گنٹور آندھرا پردیش (ہند)

کر دیا تھا، انہوں نے اہل شہر سے ایک دن کی مہمانی طلب کی لیکن ہمارے شہر والوں نے انکار کر دیا اور بھوکے پیاسے شہر سے نکل گئے۔ چلتے چلتے ایک یتیم بچے کا خستہ پستہ گھر جو گرنے کے قریب تھا درست کر گئے اور اس پر کوئی اجرت بھی نہ لی۔ امیر المومنین آپ کی کتاب قرآن حکیم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰی إِذَا اَتَیَا اَهْلَ قَرْیَةِ نِ اسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا۔ کہف آیت ۷۷

(پھر دونوں (سیدنا موسیٰ و سیدنا خضر علیہم السلام) آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے، وہاں کے لوگوں سے کھانا طلب کیا مگر ان لوگوں نے دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا)

امیر المومنین اس واقعہ سے ہمارے آباد و اجداد کی ذلت و رسوائی ہو رہی ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا کہ کیسے بخیل اور جاہل لوگ تھے جنہوں نے بنی اسرائیل کے ایک اولوالعزم نبی و رسول اور خاصان خدا میں ایک خاص بندے کی صرف ایک وقت کی ضیافت سے بھی انکار کر دیا۔ امیر المومنین یہ زر و جواہر حاضر ہیں اسے قبول کیجئے، ہماری یہ گزارش نہیں ہے کہ اس واقعہ کو قرآن حکیم سے نکالا جائے بلکہ یہ درخواست ہے کہ آیت سے صرف ایک حرف بدل دیا جائے فَاَبَوْا کے بجائے فَاَتَوْا کر دیا جائے۔ (یعنی ب کو ت کر دیا جائے) اب ترجمہ یہ ہوگا:- پھر ان لوگوں نے ضیافت کے لئے پیشقدمی کی۔

سیدنا علیؓ نے ان کی جانب غضب آلود تبسم فرمایا، پھر نہایت ضبط و تحمل سے ارشاد فرمایا: ہم بنی اسرائیل (قوم موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام) کی طرح نہیں ہیں جن کے علماء نے اللہ کی کتاب تورات، انجیل کو معمولی معمولی معاوضے میں بدل ڈالا۔ اللہ کی قسم اگر تم لوگ زمین برابر اور اس سے بھی دو چند سونا چاندی

پیش کرو تو ہم قرآن کا ایک حرف تو بہت عظیم ہے اس کا ایک نقطہ بھی بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں (حقیقتاً یہاں ایک نقطہ ہی بدلنا تھا) اللہ کی اس عظیم کتاب کو ہم اپنی جان و مال عزت و آبرو، ماں باپ، اولاد و ازواج بلکہ کُل جہاں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ جاؤ یہ زر و جواہر تم کو عزیز ہیں ہم کو اللہ کی کتاب عزیز ہے۔

آخر کار ناداتوں کا یہ وفد ناکام و رسوا ہو کر اپنے وطن واپس ہوا۔

حضرات یہ تھی حفاظت جو ہمارے بزرگوں نے قرآن حکیم کے بارے میں اختیار کی ہے۔ یہ صرف ایک ہی مثال نہیں ہے، بلکہ ہر دور اور ہر زمانے میں روزِ اوّل سے ایسا ہی ہوتا آرہا ہے۔ اور انشاء اللہ قیامت تک اس کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ۔ الآیۃ

پھر آخر میں دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ سنایا گیا، مجمع نے نہایت ضبط و تحمل سے سنا، اسطرح یہ مسئلہ اختتام کو پہنچا۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ۔

جمعہ کے بعد اس فتوے کی کاپیاں شہر کی ہر ہر مسجد میں چسپاں کی گئیں اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ تمام تلگو قرآن کو مرکز میں جمع کر دیا جائے۔

اس موقع پر ایک چھوٹا سا لطیفہ بھی پیش آیا۔ بعض حضرات نے سوال کیا مولانا تلگو قرآن کے اتنے بڑے ذخیرے کو دریا برد کر دیا جائے تو اس کے اوراق منتشر ہو کر کناروں پر آجائیں گے پھر اس کا احترام باقی نہ رہے گا۔ اللہ نے جواب کی رہنمائی کی۔ میں نے کہا آپ کے شہر کا قبرستان موجود ہے اس میں ایک قبرِ تلگو کی بنا دیجئے بس قصہ تمام ہوگا، لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ بِحَمْدِ اللّٰہِ ایک دیرینہ اور پر خطر مسئلہ حل ہوگیا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ایک انقلابی عنوان

شہر گنٹور کی آبادی میں اگرچہ غیر مسلم اکثریت ہے تاہم جسقدر بھی مسلمان ہیں عام طور پر خوشحال اور تجارت پیشہ ہیں۔ ان میں رئیس التجار قسم کے تاجر بھی ہیں۔ یہ شہر وسط ایشیا میں تمباکو کی بہت بڑی مارکیٹ تصور کیا جاتا ہے، یہاں اس کی بڑی بڑی فیکٹریاں ہیں۔ اس میدان میں مسلمان بھی پائے جاتے ہیں لیکن عام طور پر موٹر کار کے پرزوں کی مارکیٹ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

رمضان المبارک میں نماز تراویح کے بعد وعظ و تقریر کا جو سلسلہ تھا اس میں تقریبًا اسلام کے ہر اہم مسئلے پر گفتگو رہی۔ اسلام کے چوتھے رکن زکوٰۃ کی ہر سال ادائیگی پر توجہ دلائی گئی اور خصوصیت سے تجارت کے مال پر زکوٰۃ کی فرضیت کو واضح کیا گیا اور اس غلط فہمی کو دور کیا گیا جو عام مسلمانوں میں رائج ہے کہ زکوٰۃ صرف سونا، چاندی، زیورات اور نقد رقم پر دی جاتی ہے۔ مالِ تجارت، زرعی پیداوار، جانوروں کی زکوٰۃ کا تصور ہی ختم ہوگیا ہے۔ سامعین میں موٹر پارٹس کے ایک بڑے تاجر بھی تھے۔ ایک رات مجھکو اپنی دُکان لے گئے اور دُکان کا معائنہ کروایا۔ موٹر کار کے پرزوں سے دُکان بھری پڑی تھی میں نے دریافت کیا آپ اس مال کی زکوٰۃ کس طرح نکالتے ہیں؟ کہا کہ ہر سال اس دُکان کا جو بینک بیلنس ہوتا ہے اسکی زکوٰۃ دے دیتے ہیں۔

میں نے اُن کی اس غلط فہمی کو دور کیا پھر کہا کہ نقدی پر تو ویسے بھی زکوٰۃ واجب ہے اس کے علاوہ آپ کی دُکان کے چھوٹے بڑے ہر ہر پرزے پر بھی سالانہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے کیونکہ یہ مالِ تجارت ہے۔ اس پر انہیں سخت تعجب ہوا اور جب بات سمجھ میں آئی تو پوچھا کہ تجارت کے اس مال کی زکوٰۃ کس طرح نکالی جائے؟ میں نے کہا موجودہ جملہ مال کی قیمت خرید جمع

کی جائے پھر اس ساری قیمت پر ڈھائی فیصد زکوٰۃ دی جائے۔ انہوں نے کچھ تردّد کیا تو میں نے دریافت کیا آپ کی اس دُکان کا کُل مال کتنی مالیت کا ہے؟ کہا دس لاکھ روپیوں کا اندازہ ہے۔ میں نے کہا حساب آسان ہے صرف پچیس ہزار روپے غریبوں میں تقسیم کر دیجئے۔ پچیس ہزار کا لفظ سنکران کی زبان سے بے ساختہ نکلا (مقامی لہجے میں)

اُماں پچیس ہزار؟ میں نے بھی اُسی لہجے میں کہا اُماں دس لاکھ؟

پھر انہوں نے کہا پچیس ہزار؟ میں نے کہا دس لاکھ! اُن کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی کہنے لگے مولانا بات سمجھ میں آگئی۔ میں نے کہا اللہ کا شکر ادا کرو زکوٰۃ ادا کرو۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے وبال سے بچ گئے اور بات بھی سمجھ میں آگئی کہنے لگے واقعی دس لاکھ کے مقابل میں پچیس ہزار کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اللہ کا احسان ہے اُس نے اپنے فضل وکرم سے نوازا ہے۔

میں نے کہا پڑوسی کی دُکان دیکھئے وہ آپ سے کچھ زیادہ ہی محنت کرتا ہے پھر بھی وہ دس پندرہ ہزار روپیوں کے مال سے زیادہ کا مالک نہیں ہے۔ بہر حال انہوں نے زکوٰۃ ادا کر دی، دوسرے سال جب جانا ہوا موصوف کا انتقال ہو چکا تھا، اللہ اُن کی مغفرت فرمائے بڑے حق پرست وحق طلب آدمی تھے۔

شہر گنٹور میں تراویح کا یہ سلسلہ آٹھ دس سال تک جاری رہا اس عرصہ میں شہر کے مسلمانوں میں دینی وعلمی احساس شدت سے پیدا ہوا اس وقت شہر کی صرف دو چار مسجدوں میں چھوٹے بچوں کے صباحی مدرسے تھے اور وہ بھی برائے نام۔ پھر مستقل مدرسے قائم ہوئے جن میں طلبہ کے قیام کا بھی انتظام کیا گیا اور آج یہ مدرسے اپنی کارکردگی میں نیک شہرت رکھتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ۔

اسلامیہ کالج کرنول

۱۹۶۳ء ماہ رمضان المبارک میں ضلع گنٹور کی دینی و علمی خدمات ایسی نہ تھیں کہ وہ صرف شہر کی حد تک محدود رہوں، رفتہ رفتہ وہ اطراف واکناف میں بھی پھیل گئیں۔ خاص طور پر تلگو قرآن کا مسئلہ تو ایسا تھا کہ وہ دور دور تک چل پڑا اور اس پر تلگو مسلمانوں کے جذبات و احساسات ملے جلے طور پر ہر جگہ یکساں رہے، تاہم بہت جلد اس میں ٹھیراؤ بھی پیدا ہوگیا اور مسلمانوں نے تحفظ قرآن کی اہمیت و ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ غالبًا ان علاقوں میں اب تلگو قرآن خال خال ہی رہ گئے ہوں۔ اے کاش کہ آج کوئی دینی جماعت اس کا سروے کرے اور پھر اس کے کامل انسداد کی تدابیر اختیار کرے۔ موجودہ زمانے کی یہ عظیم خدمت متصوّر ہوگی۔ بہرحال انہی ایام میں ضلع کرنول (آندھرا) کے اسلامیہ کالج کا ایک دعوت نامہ آیا کہ کالج کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں جامعہ نظامیہ کے کم ازکم چار اساتذہ کی شرکت مطلوب ہے۔ میں ان دنوں جامعہ میں بحیثیت نائب شیخ الادب مدرس تھا۔ جناب شیخ الجامعہ نے اُن چار اساتذہ میں مجھکو بھی منتخب کرلیا۔ بتاریخ مقررہ پر جامعہ کا چار رکنی وفد کرنول پہنچا۔ اس علاقہ میں میرا یہ پہلا سفر تھا تاہم ضلع گنٹور کی دینی خدمات کا شہرہ یہاں پھیل چکا تھا البتہ شخصی طور پر لوگ مجھ سے واقف نہ تھے۔ اسلامیہ کالج میں ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا، لیکن تعارف کے بعد بہت جلد داعی حضرات کو معلوم ہوگیا کہ وفد کے ارکان میں ضلع گنٹور کی نزاعی شخصیت بھی شامل ہے۔ اس مکردہ تعارف کا پس منظر دراصل وہ ذہنی و فکری تضاد ہے جو

بریلویت کو اہل سنت والجماعت سے رہا ہے۔ اسلامیہ کالج کی مجلس منتظمہ اُن دنوں بریلوی ذہنیت سے متاثر تھی۔ بہر حال ہم وفد میں آگئے تھے برداشت کر لیا گیا لیکن ہر موقع پہ ہمارا وہی چوتھا نمبر رہا۔ حتیٰ کہ دسترخوان پہ ہم نے یہی نمبر پایا۔

قہرِ درویش بجانِ درویش۔ کیا کرتے پھنس تو گئے تھے۔

عشاء کے بعد تقسیم اسناد کا جلسہ شروع ہوا۔ عمومی خطاب میں بھی ہمارا وہی چوتھا نمبر تجویز ہوا گویا کالج کے جلسہ تقسیم اسناد میں سب سے پہلے چوتھے نمبر کی سند ہمیں دی گئی۔

جلسہ شروع ہوا تقسیم اسناد کے بعد فاضل مقررین کے خطابات ہوتے نصف شب گزر چکی تھی سامعین میں اُکتاہٹ اور بےسکونی محسوس ہونے لگی آخری خطاب ہمارا تھا ایسے وقت ہمیں صرف پندرہ منٹ کے خطاب کا موقع دیا گیا۔ حمد و ثنا کے بعد میں نے اپنا خطاب اکبرالہ آبادی کے دو مشہور شعر سے شروع کیا۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں گھومو
جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

عزیز طلبہ! تقسیم اسناد کا یہ جلسہ آپ کو مبارک ہو اور آپ کی یہ کامیابی دنیا و آخرت کی سعادت و نیک بختی ثابت ہو۔ نصف شب گزر چکی ہے میں مزید وقت لینا نہیں چاہتا لیکن ؎

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

مجھ کو صرف پندرہ منٹ دیئے گئے ہیں۔ انشاء اللہ اسی وقت میں اپنا دردِ دل سنادوں گا۔

عزیز طلبہ! دنیا میں اس وقت علم وفن کی بہت سی قسمیں ہیں۔
علم سائنس، علم کمپیوٹر، علم ریاضی، علم میڈیسن، علم انجینئرنگ، علم جیالوجی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس میں دوڑ جاری ہے اور ہر آدمی بھی رواں دواں ہے۔ بعض نے اپنی منزل پالی ہے اور بعض منتظر ہیں۔ عزیز طلبہ! علوم وفنون کی اس متنوع کثرت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بے شمار علم ہیں اور ہر علم کا موضوع ومقصد بھی جدا جدا ہے۔ اور اس کی تحصیل کے لئے حکومتوں نے بڑے بڑے ادارے قائم کر رکھے ہیں لیکن کچھ دیر کے لئے آپ میری جانب توجہ فرمائیں تو میں آپ سے ایک ضروری بات کہوں گا۔ عزیز طلبہ! علوم وفنون کی یہ موجودہ کثرت صرف ایک ہی علم کی حیثیت رکھتی ہے اگرچہ نوعیت مختلف ہوں لیکن بنیادی طور پر علم کی صرف دو ہی قسمیں ہیں تیسرا اور کوئی علم نہیں۔ علمِ دنیا اور علمِ آخرت (اس موقع پر طلبہ نے اپنے اپنے کاغذ وقلم سنبھال لئے) علمِ دنیا تو وہی ہے جس کی تحصیل میں آپ مشغول ہیں اس کی نہ وضاحت ضروری ہے نہ اسکی اہمیت بیان کرنا مقصود ہے۔ آپ اس کے منافع وفوائد سے خوب واقف ہیں۔ چونکہ آپ علم کے طلب گار اور اس کے قدر شناس ہیں تو میں اس زرخیز ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسے علم کی نشاندہی کرنا چاہونگا جو اس عالم کے علاوہ ایک بہت بڑے وسیع وعریض عالم کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے جس کے بغیر اس عالم —— کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا اور وہ علم علمِ آخرت ہے۔

جس طرح کائنات کی کل مخلوقات کے دو عالم ہیں عالمِ دنیا، عالمِ آخرت

اسی طرح ان دونوں عالم کے صرف دو ہی علم ہیں علم دنیا اور علم آخرت۔

انسان کا عالم دنیا اس کی حیات کے بعد شروع ہوتا ہے اور اس کا عالم آخرت اس کی موت وفنا کے بعد آتا ہے۔ یہی دو عالم ہیں جو اس کائناتی نظام کو گھیرے ہوئے ہیں تیسرا اور کوئی عالم نہیں ہے۔ دنیا کے رہنماؤں اور لیڈروں نے انسانوں کو عالم دنیا کا درس دیا ہے لیکن اللہ کے رسولوں نے عالم آخرت کا درس دیا ہے۔ دونوں علوم کے اپنے اپنے منافع ہیں جو اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے حقیقۃً علم کی صرف دو ہی قسمیں ہیں۔ علم دنیا و علم آخرت پہلے علم سے دنیا کی رہنمائی ملتی ہے تو دوسرے علم سے آخرت کی صلاح و فلاح، اسی بات کو اگر میں کچھ تغیر کے ساتھ کہوں تو یہ عنوان بنے گا کہ علم کی صرف دو قسمیں ہیں علم حیات، علم نجات۔

اس موقع پر مجھ کو دیا گیا وقت (پندرہ منٹ) ختم ہو گیا۔ میں نے طلبہ سے معذرت چاہی لیکن مجمع سے آوازیں بلند ہونے لگیں ہم تفصیل سننا چاہتے ہیں، ہم تفصیل سننا چاہتے ہیں۔

صدر جلسہ نے مداخلت کرتے ہوئے گذارش کی کہ آپ اپنی بات پوری کریں (بہرحال مجھکو (دردِ دل) سنانا ہی تھا پورا موقع مل گیا)

عزیز طلبہ! آپ جس ماحول میں زیر تعلیم ہیں میں یہاں اس ماحول کا تذکرہ نہیں کر رہا ہوں اور نہ اس کی ضرورت ہے میں آپ کو ایک ایسے عظیم و غیر فانی علم کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس میں کامیابی ہی کامیابی ہے ناکامی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور وہ علم نجات ہے۔

علم حیات کا فائدہ صرف انسانی زندگی تک رہتا ہے پھر انسان کی اپنی موت پر ختم بھی ہو جاتا ہے لیکن علم نجات کا فائدہ انسانی زندگی سے گزر کر

موت کے بعد عالم آخرت میں بھی نفع دیتا ہے جو غیر فانی اور غیر محدود عالم ہے اور جو ہر انسان کا آخری ٹھکانہ بھی ہے۔

عزیز طلبہ! آپ کو علم حیات اور علم نجات کی مزید وضاحت کیلئے انشاء اللہ یہ حکایت کافی ہوگی اور آپ دل کی گہرائیوں سے یہ محسوس کریں گے کہ ہم نے کیا پایا ہے اور کیا پانا باقی ہے۔ زمانۂ قدیم میں مشینی کشتیوں کا رواج نہ تھا ماہی گیر اور کشتی بان لکڑیوں کی چپّو سے کشتی چلایا کرتے تھے، دریائی سفر کا یہی واحد ذریعہ تھا۔

غالباً کسی کالج کے چار پروفیسر حضرات نے جو علم سائنس، علم فلسفہ، علم ریاضی اور علم جیالوجی کے ماہرین تھے دریائی سفر کے لئے ایک کشتی کرایہ پر لی اور سفر شروع کیا، اثناء سفر وقت گزاری کے لئے ہر علم پر نقد و تبصرہ کرتے رہے۔ جب بات ختم ہوئی تو بطور استراحت و تفریح کشتی بانوں سے ایک پروفیسر نے دریافت کیا، میاں تم نے کچھ سائنس وغیرہ تو پڑھی ہوگی؟

کشتی بان نے جواب دیا جناب بالکل نہیں۔

دوسرے نے پوچھا اچھا کچھ علم فلسفہ بھی؟

جواب دیا یہ بھی نہیں۔

تیسرے نے کہا علم ریاضی، حساب کتاب سے تو تم ضرور واقف ہوگے؟

جواب دیا جناب دو اور دو چار، تو جانتے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں

چوتھے پروفیسر نے کہا یہ سب باتیں چھوڑ دو، دریائی معلومات تو تم کو ہیں زمینی معلومات اور اس کی معدنیات کا کچھ تو علم ہوگا؟

کشتی بان نے جواب دیا جناب ہم لوگ موروثی پیشہ میں کشتی بان ہیں دور دور تک ہمارے آبا و اجداد میں علم و فن کا نشان نہیں ملتا۔ ہمارے باپ دادا

کشتی بان تھے انہوں نے ہمیں بھی تیراکی اور کشتی بانی سکھائی بس ہم اس کے ماہر ہیں سمندر خواہ کیسی ہی حالت میں ہو۔ ہم پار ہو جاتے ہیں بس یہی ہمارا علم ہے اور یہی ہمارا فن۔

یہ سنکر چاروں پروفیسروں نے کہا افسوس تم نے اپنی آدھی زندگی ڈبو دی کشتی بان خاموش ہو گئے۔ کشتی آگے چل پڑی۔ موسم کچھ خراب تھا۔ کچھ دیر بعد طوفانی موجوں میں کشتی الجھ گئی۔ کشتی بانوں نے اپنا پورا زور لگایا لیکن وہ اس دلدل سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور ہمت ہار بیٹھے۔ اب آخری صورت ہی رہ گئی کہ کشتی سے کود پڑیں اور تیراکی کرتے ہوئے کنارے آجائیں ایک کشتی بان نے علم و ہنر کے ان ماہرین کو خبر دی کہ نجات کی اب کوئی صورت نہیں ہے کسی بھی لمحہ کشتی اُلٹ سکتی ہے۔ آپ حضرات کو کچھ تیرنا آتا ہو تو کشتی سے کود پڑیں۔ سب نے ایک ہی جواب دیا ہم نے اپنی زندگی میں کبھی پانی پر قدم بھی نہیں رکھا تیرنا تو بڑی بات ہے۔

کشتی بانوں نے کہا افسوس تم نے اپنی ساری زندگی ڈبو دی۔

پھر کچھ دیر نہ لگی ایک موج اٹھی اور چاروں کو بہا لے گئی۔ اور کشتی بان تیراکی سے کنارے تک پہنچ گئے۔

عزیز طلبہ! اس وقت نجات کا علم صرف ایک ہی تھا اور وہ کشتی بانی و تیراکی، جس سے یہ حضرات محروم تھے انہیں علم حیات تو خوب حاصل تھا لیکن علم نجات (تیراکی) سے وہ نا آشنا تھے، اپنی ساری زندگی ڈبو دی اور ہلاک ہو گئے۔

عزیز دوستو! یاد رکھئے علم نجات صرف اور صرف علم دین ہے۔ عالم آخرت میں جو ساری انسانی برادری کا آخری اور ابدی وطن ہے یہی علم نجات دے گا اور اسی سے نجات ہو گی۔ خوش نصیب ہیں وہ جنہوں نے سفر آخرت سے پہلے

علم نجات (علم دین) حاصل کرلیا ہو اور جب یہ سفر شروع ہوگا تو آخرت کے حوادث زلازل و مشاکل سے ہر ہر قدم پہ نجات پائیں گے اور انجام کار دائمی کامیابی نصیب ہوگی۔

بس میری بات ختم ہو چکی۔ میں آپ کو یہی بات کہنے آیا تھا پھر ایکبار اپنی بات دہراتا ہوں اسکو اپنے ذہنوں میں محفوظ کریں زمین و آسمان میں صرف اور صرف دو ہی علم ہیں۔ علم حیات (دنیا کا علم) علم نجات (آخرت کا علم) اب آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ کو کیا کرنا ہے؟

اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔

جلسہ برخاست ہوا، عوام کے احساسات کا تو علم نہ ہوسکا البتہ طلبہ خصوصًا پروفیسر حضرات کے فکری زاویوں میں ہلچل ضرور پیدا ہوئی، اس کے مثبت و منفی اثرات کا علم اللہ علیم و خبیر ہی کو ہے۔۔ پھر ہم نے صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنا رخت سفر باندھ لیا۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ

حاضر جوابی اسلامیہ کالج کرنول کے خطاب کے بعد پڑوسی ضلع نندیال سے قرأت قرآن کے ایک نسوانی مدرسہ کا دعوت نامہ آیا کہ قاریات کے امتحان کے لئے ممتحن کی ضرورت ہے براہ کرم زحمت قبول فرمائیں تاریخ مقررہ پر نندیال پہنچا یہ جان کر مسرت ہوئی کہ مدرسہ کا پورا نظم و نسق خواتین کے ہاتھوں میں ہے اور شرعی پردے کا سختی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔

قرأت قرآن کی تین جماعتیں تھیں۔ ادنیٰ، متوسط، اعلیٰ۔

ہر روز ایک جماعت کا امتحان مقرر تھا۔ قاریات کے امتحان کے بعد معلمات کے بھی امتحان تھے اور یہ قرأت سبعہ سے متعلق تھے۔

ایک قاریہ سے عملی امتحان میں چند سوالات کے بعد وقف کے مسائل دریافت کئے گئے۔ اثنائے سوالات وقفِ اضطراری کی مثال پوچھی گئی قاریہ نے دو چار سیکنڈ توقف کیا میں نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ کہنے لگیں آپ کے سوال پر اگر میں قراءت میں وقفِ اضطراری کردوں تو آپ یہ اعتراض کریں گے یہ تو اضطرار نہ ہوا اس لئے کہ وقفِ اضطراری میں اختیار نہیں ہوتا، پھر میں وقفِ اضطراری کس طرح کروں ؟ قاریہ کی حاضر جوابی پر تعجب ہوا۔

اس پر میں نے انہیں شاباشی دی اور یہ بھی خوشخبری دی کہ آپ کو اسی ایک سوال کے جواب پر کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ اللہ اکبر۔

علم مردوں ہی کی میراث نہیں رہی خواتین نے بھی بھرپور حصہ پایا ہے جواب تو اتنا ہی کافی تھا کہ کسی آیت میں وقف کر دیا جاتا، سوال کا منشأ پورا ہوجاتا لیکن قاریہ کی حاضر جوابی ملاحظہ کیجئے کیسا لطیف اور معقول جواب دیا جو عام طور پر نہ سنا گیا۔

ہفتہ وار دروس

۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء کا دس سالہ دور میری زندگی میں درس و تدریس اور دعوت و تبلیغ کا نمایاں عنوان رہا ہے۔ جامعہ نظامیہ میں حدیث شریف کی اساسی کتب کے علاوہ دیگر علوم کی کتابیں بھی زیرِ درس رہی ہیں۔ خارجی اوقات میں عام مسلمانوں کے لئے قرآن و حدیث کے درس کا سلسلہ جاری رہا۔ اُن دنوں شہر کی صرف دو تین مساجد میں تفسیر و حدیث کے روایتی درس ہوا کرتے تھے ان میں تفسیر قرآن کا قدیم درس وسط شہر کی ایک معروف مسجد میں ہوا کرتا تھا جس میں شرکاء کی تعداد پانچ سات افراد سے زائد نہ تھی۔

دعوت و تبلیغ کے اس دس سالہ دور میں بہت جلد یہ بات راسخ ہو گئی کہ قرآن و حدیث کے علاوہ درسِ فقہ کو بھی عام کیا جانا چاہیئے میرا شدت سے یہ احساس تھا کہ دینِ الٰہی اسلام کی کامل و مکمل صورت گری ان تینوں علوم (قرآن، حدیث و فقہ) میں منحصر ہے۔ اسطرح عام مسلمانوں کی تقریبِ فہم کے لئے یہ عنوان قائم کیا۔

تفسیر۔ مرادِ قرآنی کا نام ہے۔

حدیث۔ قول و فعل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔

فقہ۔ قرآن و حدیث دونوں کے مشترک منشأ و مراد کا نام ہے۔

اس لحاظ سے علم فقہ کوئی مستقل علم نہیں ہوا بلکہ اللہ و رسول کا جو منشأ و مراد تھا وہ علم فقہ کی شکل میں جمع کر دیا گیا۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث میں باہمی تضاد یا اختلاف نہیں ہے البتہ جو ظاہری اختلاف نظر آتا ہے اُس کا واحد حل علم فقہ سے وابستہ ہے۔ اگر علم فقہ کو عام کیا جائے تو ملت کے باہمی اختلافات میں بڑی حد تک کمی ہو سکتی ہے کیونکہ صرف قرآن یا صرف حدیث دین کی مکمل تصویر نہیں ہے دونوں کا مجموعہ ہی دینِ کامل کی ضمانت ہے۔

اب یہ تاریخ تو معلوم نہیں کہ شہر حیدرآباد کے دوسو سالہ شاہی دور میں کس وقت علم فقہ کا عوامی درس ہوا کرتا تھا اور کس دور میں یہ ختم ہوا۔

سنہ ۱۹۶۱ء کے اواخر میں جامع مسجد ملے پلی (جہاں جمعہ کا عام خطاب ہوا کرتا تھا) علم فقہ کے درس کا آغاز کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ شہر کی دیگر مساجد میں بھی شروع ہوا، خاص طور پر مسجد محی الدین بیگم ملک پیٹ درس فقہ کا مرکزی مقام قرار پائی۔

تفسیر، حدیث و فقہ کے ان تینوں دروس میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کثرت رہا کرتی تھی، سن رسیدہ اور معمر حضرات بھی اہتمام سے شریک ہوا کرتے تھے، ان دروس میں درس فقہ کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں رسم ورواج اور تقلید آباوا جداد کے جامد تصورات متزلزل ہونے لگے، قرآن و حدیث کی روشنی میں حق و باطل، سنت و بدعت، ہدایت و ضلالت کے باہمی فرق کو دیکھا اور سمجھا جانے لگا۔ اس طرح ذہنی و فکری راہیں کشادہ ہونے لگیں۔ پھر مجلس علمیہ کے قیام کے بعد (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) یہ تینوں درس عام ہو گئے۔ مجلس کے مقاصد کے تحت ہر رکن پر یہ پابندی عائد تھی کہ ہفتہ میں کم از کم تین یوم مقامی مسجد میں تفسیر، حدیث و فقہ کے درس جاری کئے جائیں چنانچہ بہت جلد یہ سلسلہ شہر کی مساجد سے گذر کر اضلاع میں اور پڑوسی صوبہ کرناٹک و مہاراشٹر میں بھی جاری ہوا۔

بیدار مغزی مجلس علمیہ کی مرکزی مسجد (ملک پیٹ) میں حسب معمول درس فقہ جاری تھا، شرکاء کی کثرت تھی، اختتام درس کے بعد کچھ دیر سوالات کے جوابات کے لئے وقت دیا جاتا تھا۔ ان دنوں شہر کے روایتی مشائخ میں صحوی شاہ صاحب نامی مرشد نے بدعت کی تائید میں تین سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی تھی جس میں مروجہ بدعات کے ثبوت میں تین سو دلائل جمع کئے گئے تھے (گویا ہر صفحہ ایک مستقل دلیل) کتاب کا نام "بدعت حسنہ" رکھا تھا کتاب کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر بدعت گمراہی نہیں ہے بلکہ بدعت سیئہ (بری بدعت) گمراہی ہے (گویا بدعت کا انہیں اقرار بھی تھا) اسطرح انہوں نے بدعت کی دو قسمیں نکالیں۔

بدعتِ حسنہ، بدعتِ سیئہ (اچھی بدعت، بری بدعت)

شہر کی موجودہ تمام بدعات کو بدعت حسنہ ثابت کیا اور یہ فیصلہ دیا کہ ان اعمال کو گمراہی یا بے دینی کہنا حرام ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنون کا خرد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم

کتاب کی غیر معمولی تشہیر کی گئی۔ مقامی اخبارات میں بڑے بڑے اشتہار بھی دیئے۔ بہر حال ہمارے درس فقہ کے اختتام پر شاہ صاحب کی مذکورہ کتاب پر تبصرہ ہو رہا تھا سامعین کے شکوک و شبہات کا جواب دیا جا رہا تھا کہ اچانک معزالدین نامی ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر یہ سوال کر دیا، مولانا جب بدعت کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں تو زنا کی بھی دو قسمیں ہوں گی؟

زنا حسنہ، زنا سیئہ (اچھا زنا، بُرا زنا)

اس پر لوگ ٹوٹ پڑے اور لعن طعن کرنے لگے۔ کہ کیا بدتمیزی ہے خواہ مخواہ کیوں مداخلت کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ مجلس میں غلام احمد صاحب نامی ایک سنجیدہ با اثر آدمی تھے انہوں نے سب کو خاموش کیا پھر معزالدین سے پوچھا شاہ صاحب نے تو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی تعریف لکھدی ہے تمہارے ہاں زنا حسنہ اور زنا سیئہ کی کیا تعریف ہے؟

معزالدین نے برجستہ جواب دیا جو کام راضی مرضی سے ہو وہ زنا حسنہ ہے اور جو جبر و اکراہ سے ہو وہ زنا سیئہ۔

پھر کیا تھا پورا مجمع ہنس پڑا۔ میں نے سامعین حضرات سے کہا لیجئے صاحب معزالدین کو جواب دیجئے وہ بہر صورت جواب چاہتا ہے؟

احادیثِ رسولؐ میں جب یہ وضاحت موجود ہے کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ (الحدیث) ہر بدعت گمراہی ہے تو پھر گمراہی کی تقسیم کرنا "اچھی گمراہی، بُری گمراہی" کہاں

تک درست ہے ؟ اگر آپ کے ہاں بدعت کی یہ تقسیم صحیح ہے تو زنا کی مذکورہ تقسیم بھی درست ہونی چاہیئے ؟

یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی رشوت خور رشوت کی یہ تقسیم کرے :۔

رشوت حسنہ، رشوت سیئہ (اچھی رشوت ، بری رشوت)

ایسے ہی سود خور بیان کرے کہ سود کی دو قسمیں ہیں :۔ ربٰو حسنہ، ربٰو سیئہ (اچھا سود، برا سود) اسطرح کوئی مسخرہ تہمت کی تقسیم کرئے تہمتِ حسنہ، تہمتِ سیئہ (اچھی تہمت، بری تہمت) وغیرہ وغیرہ تو پھر بدعت کی کیا خصوصیت ہے کہ ایک بدعت اچھی ہو دوسری بری۔

ہر گناہ میں یہ تقسیم چل سکتی ہے حالانکہ یہ سب خالص گناہ ہیں۔[1]

گناہ کی دو نہیں دس بیس قسمیں کر لی جائیں تو گناہ ہی نکلے گا۔ سنت و عبادت کہاں پیدا ہوں گے، غلاظت کا جس قدر بھی تجزیہ کیا جائے گا انجام غلاظت ہی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر

---

[1] بعض فریب خوردہ ذہن بدعت کی اس تقسیم کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپؐ نے سنت کی دو قسم بیان فرمائی ہیں :۔

سنت حسنہ ، سنت سیئہ ۔ (اچھا طریقہ ، برا طریقہ)

اچھا طریقہ جاری کرنے پر اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور بُرا طریقہ جاری کرنے پر عذاب کی دھمکی دی ہے اسی حدیث سے بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ ثابت کیا ہے یہ ان نادانوں کے علم و عقل کا دیوالیہ پن ہے سنت و بدعت کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سنت کی تقسیم کی ہے بدعت کی نہیں بدعت تو سراسر گمراہی و بے دینی کا نام ہے۔

بدعت کو گمراہی و ضلالت قرار دیا ہے تو پھر ضلالت و بدعت کی تقسیم میں صداقت و دیانت کیسے ثابت ہوگی؟

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی

الغرض معز الدین کی یہ منطق ایسی نہ تھی کہ اس کو نظر انداز کیا جاسکے نوجوانوں میں ہفتوں بحث ہوتی رہی لیکن کوئی اس کو قائل معقول نہ کرسکا۔ یہ دراصل اسی درس فقہ کی ظاہری برکتیں تھیں جس کے اصول وضوابط نوجوانوں کی ذہنی وفکری تربیت کررہے تھے وہ کسی علمی فریب کو برداشت کرنے پر تیار نہ تھے ان کی آنکھیں قرآن وحدیث کے انوار سے فیض پارہی تھیں، شرک وبدعت کی تاریکی اور توحید وسنت کی روشنی اُن پر منکشف ہورہی تھی آخر وہ کسی بدعت کو سنت کے لباس میں دیکھکر مرعوب ہونیوالے نہ تھے۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (الآیۃ)

تاسیس مجلس علمیہ

۷ر ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۳ر جنوری ۱۹۷۳ء شہر حیدرآباد اور اس کے اطراف واکناف میں دیوبند سہارنپور، دہلی و ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے فارغین متفرق طور پر تبلیغی خدمات انجام دے رہے تھے اور ہر عالم اپنے اپنے حلقے میں اپنی بساط بھر ذمہ داریوں کو پورا کررہا تھا لیکن ان علماء کا آپس میں کوئی باضابطہ ربط وضبط نہ تھا البتہ کبھی کبھار ملاقاتیں ہوجاتی تھیں خاص طور پر مدارس دینیہ کے سالانہ جلسوں اور وقتاً فوقتاً تبلیغی اجتماعات میں لیکن یہ ملاقاتیں وقتی اور مختصر ہوا کرتی تھیں۔

شہر میں جامع مسجد ملّے پلّی تبلیغی جماعت کا مرکز تھا، ہمارے وعظ و درس کے سلسلے بھی اس مسجد سے وابستہ تھے۔ جماعت کی کارکردگی اور اس کے

فیوض و برکات کا ہمیشہ مشاہدہ ہوا کرتا تھا کہ عام مسلمانوں میں دینی بیداری اور مساجد سے وابستگی پیدا ہو رہی ہے اور یہ سب کچھ اجتماعی کام کی برکتیں ہیں۔ اس پر اکثر یہ خیال آتا تھا کہ اہل علم اور علماء کے لئے بھی اسی نہج پر جماعت کی تشکیل کی جائے جو قرآن و حدیث کی تبلیغ اجتماعی طور پہ جاری رکھیں جس سے جہاں قرآن و حدیث کے احکام زندہ ہوں گے وہاں علماء حضرات بھی اپنے کار منصبی پہ دائم و قائم رہیں گے، ان کے آپس کا اتحاد دین کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرتا رہے گا۔ احباب کی وقتاً فوقتاً ملاقات میں یہ تجویز بھی زیر غور رہا کرتی تھی۔

اور دوسری جانب شہر اور مضافات شہر کے وہ طلبہ جو تکمیل علم کے لئے بیرون شہر، دیوبند، سہارنپور، دہلی وغیرہ کے دینی مدارس میں زیر تعلیم تھے فارغ ہوکر اپنے وطن آرہے تھے اور ہر سال ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ایسے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے شہر میں اُن کے حسب حال دینی خدمات کا کوئی مستقل انتظام نہ تھا اور نہ ہی اُن کے حصولِ معاش کا کوئی ذریعہ۔ ایسی غیر یقینی صورت حال میں بعض طلبہ سرکاری مدارس کا رُخ کرتے یا پھر تجارت یا عصری علوم کی تحصیل میں مشغول ہو جاتے پھر کوئی اُردو پنڈت بنتا کوئی طبیب و حکیم کا پیشہ اختیار کرتا تو کوئی تجارتی لائن میں تاجر ہو جاتا اس طرح سے

جو پڑھا لکھا تھا نیازؔ نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

بہرحال اس مکروہ صورت حال کو راقم الحروف شدت سے محسوس کرتا رہا اور جب کبھی دوستوں سے باہمی ملاقات ہو جاتی بطور مرثیہ خوانی اپنے رنج والم کا اظہار کرتا اور رخصت ہو جاتا۔

یہ سلسلہ چھ آٹھ سال تک چلتا رہا لیکن کسی کو بھی اس کا مداوا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

جن احباب کو یہ خلش سبے چین کر رہی تھی ان میں مولانا سید اکبر صاحب (بھونگیر) مولانا شبیر احمد صاحب (زمٹہ) مولانا عبد العزیز صاحب (ثریا پیٹ) مولانا رضوان القاسمی صاحب (حیدرآباد) مولانا اکبر الدین صاحب قاسمی اور بعض دیگر احباب شامل تھے یہ سب کے سب ہم خیال وہم مزاج احباب تھے ان سب کا نقطۂ فکر ایک تھا۔ یہ سب چاہتے تھے کہ علماء کی یہ نئی نسل اپنی منزل ہی کی جانب رواں دواں رہے انہیں جہاں حصول معاش کے ذرائع مہیا ہوں وہاں دینی و تبلیغی خدمات سے کامل وابستگی برقرار رہے ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

سنہ ۱۳۹۲ھ مطابق سنہ ۱۹۷۳ء کے اوائل کا زمانہ تھا، راقم الحروف حسب معمول جامعہ نظامیہ میں جماعت مولوی کو درس دے رہا تھا۔ آٹھ دس نوجوان ملاقات کے لئے آئے خیال آیا کہ یہ کسی سرکاری مدرسہ کے طالب علم ہیں۔ درس سے فراغت کے بعد تعارف حاصل کیا گیا تو نہایت تعجب ہوا اور افسوس بھی، سب کے سب دینی و اسلامی مدارس کے فارغ التحصیل علماء ہیں لیکن شکل و صورت اہل علم سے بالکل مختلف۔ بہرحال خیر خیریت اور ضروری بات چیت کے بعد سب کو رخصت کیا گیا لیکن نوجوانوں کی اس ملاقات نے قلب کو غیر معمولی متاثر کیا اور گہرا اثر چھوڑا۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اپنی اور اپنے احباب کی وہ غیر شعوری خلش پھر تازہ ہوئی کہ علماء کی نئی نسل کو سنبھالنا چاہیئے۔ ہفتہ عشرہ اس تفکر میں گذر گیا۔ غالبًا مخلصین کا اخلاص

بارگاہ قدس میں مقبول ہو رہا تھا اسی اثنا میں اپنے ایک مخلص دوست مولانا سید اکبر صاحب (بھونگیر) سے ملاقات ہو گئی اور موصوف سے نوجوانوں کی ملاقات کا تذکرہ کیا گیا اس پر مستقبل کے اندیشوں کا بہت دیر تک ذکر ہوتا رہا۔ مولانا کو بھی اس صورت حال نے مزید بے چین کر دیا۔ آخر یہ طے کر لیا گیا کہ اپنے مخلص احباب کو جمع کر لیا جائے تاکہ اجتماعی طور پر غور و خوض کرنے کا موقع فراہم ہو۔ چنانچہ مولانا سید اکبر صاحب نے اپنے مدرسہ (جامعہ اسلامیہ بھونگیر) میں علماء کا اجتماع رکھنا قبول کر لیا تاکہ اس مسئلہ کی یکسوئی ہو جائے، چنانچہ شہر و بیرون شہر کے اپنے احباب کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے گئے۔

وقت مقررہ پر علماء جمع ہوئے اور دو دن بحث و مباحثہ کے بعد "مجلس علمیہ" کے نام سے پنج مقاصد مجلس کا قیام عمل میں آیا اور مقاصد ذیل طے کیے گئے:۔

مجلس علمیہ

اغراض و مقاصد

(۱) تنظیم مدارس دینیہ۔ (۲) دعوت و تبلیغ۔ (۳) تصنیف و تالیف۔ (۴) اکابر ملت سے استفادہ (۵) مکتبہ دینیہ کا قیام۔

پھر ان اغراض و مقاصد کی فقرہ وار تشریح اسطرح کی گئی۔

۱۔ تنظیم مدارس دینیہ

(ا) اضلاع خصوصًا دیہات میں دینی مدارس و مکاتب کا قیام

(ب) نصاب تعلیم کی تدوین و ترمیم

(ج) معائنہ مدارس و امتحان اور طریقہ تعلیم و تربیت میں یکسانیت پیدا کرنا۔

(د) حسب گنجائش بوقت ضرورت ایسے مدارس دینیہ کا مالی تعاون جو مجلس علمیہ کے اغراض و مقاصد سے متفق ہوں۔

۲۔ دعوت و تبلیغ

(ا) مستقر و بیرون مستقر دینی تعلیمات و احکام اسلام کی اشاعت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر خصوصی توجہ دینا۔

(ب) مقامی مساجد میں تفسیر قرآن و حدیث و فقہ کے ہفتہ وار درس کا اجراء کرنا

(ج) ہر ماہ اپنے مستقر پر ایک عام اجتماع منعقد کرنا۔

(د) تمام حلقہ ہائے مجلس علمیہ کا ہر تین ماہ بعد سہ ماہی اجتماع کسی ایک حلقہ میں منعقد کرنا تاکہ سہ ماہی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے۔

(ھ) اصلاح خواتین کے لئے مجلس وعظ قائم کرنا۔

۳۔ تصنیف و تالیف

(ا) مسائل حاضرہ کا اسلامی حل اور اس کی تحریری نشر و اشاعت

(ب) مضامین اصلاحی کی اشاعت بذریعہ رسائل۔

(ج) درسی و غیر درسی کتب کی تالیف و ترتیب۔

۴۔ اکابر ملت سے استفادہ

(ا) مدارس کے جلسوں اور دیگر عمومی اجتماعات میں خطاب کیلئے اکابر ملت کو مدعو کرنا۔

(ب) علماء کی تشریف آوری سے فائدہ اٹھا کر وعظ و مجالس کا انعقاد کرنا تاکہ زیادہ سے زیادہ استفادہ کے مواقع حاصل ہوں۔

۵۔ مکتبہ دینیہ کا قیام

(ا) مکتبہ کا قیام جس کے ذریعہ مستند دینی

کتب کی فراہمی۔ (ماخوذ از کتابچہ اساسی مجلس علمیہ)

یہ تھا مداوئی اس خلش کا جو مخلص احباب کو بے چین کئے ہوئے تھی اللہ نے ہمیں توفیق بخشی علمارکرام کے لئے ایک محتاط اور غیر نزاعی نصاب مرتب ہوگیا اور عملاً جاری وساری بھی۔ فَلَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّيْ۔

بدایۃ العمل کے طور پر مساجد میں تفسیر، حدیث وفقہ کے دروس کا آغاز کیا جانے لگا۔ بہت جلد یہ سلسلہ چل پڑا، گذشتہ صفحات میں انہی دروس کی برکات کا مختصر تذکرہ آچکا ہے۔

اس کے ساتھ ہی شہر اور دیہات میں چھوٹے بچوں کے لئے صباحی مدارس قائم کئے جانے لگے۔ ایک سال کی مختصر مدت میں پچیس سے زائد صباحی مدارس قائم ہوگئے اور اراکین مجلس علمیہ کی تعداد ایک سو سے اوپر پہنچی۔ مجلس علمیہ کا حلقہ اثر شہر حیدرآباد سے گزر کر اضلاع آندھرا، کرناٹک، مہاراشٹر تک جا پہنچا۔ ان ارکان کی فہرست مع عناوین آج بھی راقم الحروف کے ہاں محفوظ ہے۔ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَرَاجِعْنَا۔ ان سطور کے لکھتے وقت (۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۳ء) مجلس علمیہ کی عمر بحمد اللہ بیس سال ہو چکی ہے۔ اور کام میں تقدم جاری ہے۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

اہلِ خدمات کی خدمت میں

کسی بھی دینی یا دنیاوی کامیابی کے لئے جہاں اخلاص اور جہد مسلسل ضروری ہے وہاں کام کے اغراض ومقاصد سے کامل وابستگی اور عشق بھی ضروری ہے۔ اور جس طرح مقصد کو پیچھے کر دینا تحریک کی موت ہے ایسے ہی مقصد سے آگے بڑھ جانا بھی خودکشی ہے۔ دعوت وتبلیغ کی پوری تاریخ یہ نتائج پیش کرتی ہے کہ جن جماعتوں یا جن افراد نے اپنی دعوت وتبلیغ کے اغراض ومقاصد میں خیانت کی یا ان کو وقتی تقاضوں کے پیش نظر پیچھے کر دیا یا اغراض ومقاصد سے تجاوز کیا۔ ایسی تحریکیں زوال پذیر ہوگئیں یا پھر گمنامی کے غار میں دفن ہوگئیں

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زمانے میں دین کی محدود خدمت ہی کامیاب اور مفید ثابت ہوئی ہے اور مستقبل میں اس کے دائمی اثرات مرتب ہوئے ہیں طبقہ مفسرین، محدثین، فقہاء اور متکلمین کی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں جن کی محدود و مخصوص خدمات نے تفسیر، حدیث و فقہ، عقائد کے غیر فانی نقوش قائم کئے ہیں اور ہر زمانے میں آنے والے علماء کے لئے یہی نقوش راہ نما اصول کی حیثیت میں ثابت ہوئے ہیں۔ یہ دائمی صدقہ جاریہ اس لئے ثابت ہوا کہ ان میں ہر طبقے نے اپنے مقصد ومنشأ کو نہ تیچھے کیا اور نہ اُس میں اضافہ کیا جو مقصد بنایا تھا اس کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور اپنی ساری زندگی اس میں وقف کردی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہر فن میں طبقات ائمہ کی مستقل فہرستیں علیحدہ علیحدہ ملتی ہیں۔ وہ افراد فریب خوردہ ہیں جنہوں نے وقتی وہنگامی تقاضوں سے متاثر ہوکر اپنی تحریکی پیام کے مقررہ حدود و مقاصد سے خروج کیا یا کسی مصلحت کے پیش نظر ان میں حذف واضافہ کیا یا ان میں جدید تقاضوں کو شامل کرلیا۔ ایسی تحریکوں نے بہت جلد اپنے مقاصد ہی نہیں بلکہ اپنی شکل وصورت بھی کھودی ہیں۔ دعوت وعزیمت کی تاریخ میں ایسی مُردہ تحریکات کا بکثرت تذکرہ ملتا ہے۔

صُلحِ کل کے خوشنما عنوان کی طرح دینِ کُل کی دعوت وتبلیغ کا دعویٰ کرنا طبقۂ انبیاء و مرسلین کے علاوہ کسی فرد یا جماعت سے نہ عملاً پورا ہوا ہے اور نہ عقلاً ممکن رہا ہے۔ اس لئے دین کی کوئی بھی خدمت صرف اُسی وقت کامیاب اور مفید ثابت ہوئی ہے جب اُس کے کسی ایک شعبہ کو مقصدِ حیات بنا لیا گیا ہو اور پھر اُس میں اپنی زندگی کو جھونک بھی دیا گیا ہو۔ موجودہ دور میں ہمارے ہاں اسکی کم ازکم دو مثالیں موجود ہیں۔

(۱) مدارسِ دینیہ :۔ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور،

ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دہلی کے وہ قدیم مدارس جو آج سے سو سال پہلے ایک خاص مقصد کے لئے برصغیر ہند میں قائم کئے گئے تھے، اپنے اساسی مقاصد کی برقراری پر آج بھی صرف حقیقت ہی نہیں اپنی اصلی شکل وصورت میں قائم ہیں اور مزید ترقی پذیر بھی۔ ہر سال ہزاروں طلبہ علوم اسلامی سے فارغ التحصیل ہوکر اسلام کے مضبوط قلعے ثابت ہو رہے ہیں۔

(۲) نظام الدین دہلی کی تبلیغی جماعت اگرچہ مدارس دینیہ سے قدیم نہیں ہے تاہم اپنے مقاصد پر ——— باوجود عالمی تحریک بن جانے کے اپنی اصلی شکل وصورت میں برقرار ہے جس کی بدولت سارے عالم میں ہزاروں مسلمان اپنے دین پر لوٹ آ رہے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں تحریکیں صرف اور صرف اسلئے کامیاب اور نیک نام ہیں کہ ان کے ذمہ داروں نے اپنے مقررہ مقاصد میں اونچ نیچ کو قبول نہیں کیا، حوادث زمانہ ہوں یا بادِ مخالف چلی ہو ہر حالت میں اپنے مقصد سے کامل وابستگی رکھی اور اپنے اصول وضوابط کو مضبوطی سے تھامے رکھا ——— یقیناً اس طویل مدت میں عارضی، ضروری، وقتی، ہنگامی، اضطراری ہر قسم کے تقاضے بھی پیش آئے ہیں۔ فللہ الحمد۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ (الآیہ)

یہی گذارش واپیل نہایت دلسوزی وخیر خواہی سے جہاں موجودہ اسلامی تحریکات کے ذمہ داروں سے کیجاتی ہے وہاں مجلس علمیہ کے موجودہ کارکنانِ اساسی کی خدمت میں بھی پیش کی جاتی ہے کہ مجلس علمیہ کے "مقاصد خمسہ" ہی کو اپنی کارکردگی کا محور بنائے رکھیں۔[۱] اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا وَسَدِّدْ خُطَانَا۔

---

[۱] بعض مخلصین نے شبہ پیش کیا کہ کسی بھی تحریک میں مقاصد سے کامل وابستگی (باقی بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) یقیناً ضروری ہے لیکن کبھی کبھی ہنگامی تقاضے بھی ملک و ملت کی صلاح و فلاح کے لئے ضروری ہو جاتے ہیں۔ ایسی ناگہانی صورت میں اکابر ملت کا صرف نظر کر لینا اور اپنے اپنے سابقہ کام ہی میں مشغول رہنا اسلام اور مسلمانوں کی زندگی کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔

دراصل یہ شبہ قلتِ غور و فکر کا نتیجہ ہے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ملت کی ساری عمر میں ایسے وقتی و ہنگامی حالات پیش آئے ہیں اور آتے رہیں گے لیکن دردِ سر کا علاج قطع سر نہیں ہوتا۔ ایسے ہنگامی حالات میں اپنے کام کو کچھ وقفے کے لئے پیچھے کر دینا یا اس کو وقتی طور پر موقوف کر دینا یا پھر اپنے کام میں ان جدید تقاضوں کو شامل کر لینا بظاہر بے ضرر معلوم ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا ہے یہ تجویز اپنی سابقہ مستقل تحریک کی موت بلکہ خودکشی کے مترادف ہوگی۔ ماضی میں جتنی تحریکیں بھی گمنام ہوئی ہیں وہ دراصل اسی افراتفری اور ہنگامی تقاضوں کی آمیزش سے متاثر ہو کر اپنا اساسی کردار کھو بیٹھی تھیں لیکن بہرحال ملک و ملت کے اس ہنگامی اور وقتی تقاضوں پر بھی خصوصی توجہ دینی ضروری ہے۔

ہمارے ہاں اس کا سیدھا سادہ حل تو یہی ہے کہ ملت کے دیگر افراد اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کا مداوا کریں۔ یا پھر تحریکات موجودہ کے کارکنوں میں جو اشخاص اس ہنگامی صورت حال سے متاثر اور غم سے نڈھال ہو رہے ہیں اُنہیں اپنی موجودہ تحریک سے جدا کر دیا جائے تاکہ وہ ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کریں۔ تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ ملک و ملت میں ایک ہمہ مقصدی (ALL-ENCOMPASSING) جماعت قائم کر دی جائے جو ایسے ہنگامی حالات میں ملک و ملت کی رہنمائی کر سکے۔ ہند و پاک میں کم از کم اس کی دو مثالیں موجود ہیں۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مجلس اشاعت اسلام ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۴ء

مجلس علمیہ کی ایک سالہ کارکردگی کے بعد احباب کی خواہش پر سالانہ جلسہ طے کیا گیا تاکہ کام کا جائزہ لیا جائے۔ جلسے کی صدارت کے لئے دارالعلوم دیوبند کے مولانا محمد سالم صاحب (صاحبزادہ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ) کو زحمت دی گئی لیکن موصوف نے اپنی علالت کے باعث مولانا ارشاد احمد صاحب رئیس المبلغین دارالعلوم دیوبند کو روانہ فرما دیا۔

مولانا تشریف لائے، سہ یومی اجتماع تھا، شہر میں یہ پہلا موقع تھا کہ بیک وقت ساٹھ ستر علماء جمع ہو گئے۔ مولانا ارشاد احمد صاحب نے اس اہم اجتماع میں مجلس علمیہ کے ارکان کو جہاں مفید مشورے اور ہدایات دیں وہاں شرک و بدعات اور رسم و رواج کے خلاف جو شہر میں دین و ایمان کی شکل اختیار کئے ہوئے تھے ایک کھلی تحریک چلانے کا مشورہ دیا۔

مجلس علمیہ کے اصول خمسہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تبلیغ شامل تھی۔ مولانا نے علماء کے اس کثیر مجمع کو نہی عن المنکر کی اس متروک سنت کے احیاء پر اتنا زور دیا کہ وہ مستقل ایک تحریک معلوم ہو رہی تھی۔ مولانا کا شہر میں بارہ یومی قیام تھا اس عرصہ میں شہر کی اہم مساجد میں مولانا کے انقلابی اور لرزہ خیز

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۰)

پاکستان میں جماعت اسلامی اور بھارت میں جمعیۃ العلماء ہند
بہرحال دین کے قائم شدہ نظام کو وقتی اور ہنگامی حالات سے متاثر ہونے نہ
دیا جائے جبکہ وہ نظام خود اپنی ذات میں نہایت اہم اور ضروری بھی ہے۔

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

خطابات ہوئے۔ اس کے علاوہ مجلس اتحاد المسلمین کے سالانہ جلسہ سیرت النبیؐ (دارالسلام) میں ایک ایسا معرکۃ الآرا خطاب فرمایا جس سے نواب بہادر یار جنگ اور مولوی قاسم رضویؒ کی یادیں تازہ ہوگئیں۔

بہرحال مولانا نے اپنے قیام کے زمانے میں مجلس علمیہ کو یہ مشورہ دیا کہ شرک و بدعات کی بیخ کنی کے لئے مولانا پالن حقانی صاحب کی خدمات حاصل کی جائیں، جو پچھلے چند سالوں سے "رجال غیب" کی شکل میں نمودار ہوئے ہیں اور جن کی دعوت توحید و سنت اور تردید شرک و بدعت نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں تہلکہ مچا دیا ہے گویا شرک و بدعت پر قہر آسمانی ٹوٹ پڑا ہے۔ ایک ایک خطاب میں ہزاروں نہیں لاکھوں کا مجمع ہو رہا ہے اور جہاں کہیں بھی خطاب ہو رہا ہے وہاں ہزاروں مرد و خواتین شرک و بدعات سے توبہ کر رہے ہیں۔ (تفصیلات آگے آرہی ہیں)

بہرحال یہ عجیب و غریب اطلاع تھی جس کا ہمیں مطلق علم نہ تھا۔ مولانا کے اس تعارف نے ہم کو بھی متحرک کر دیا۔ مولانا ارشاد احمد صاحب کی موجودگی ہی میں حقانی صاحب سے رابطہ پیدا کیا گیا۔ جو اُن دنوں مہاراشٹر کے کسی ضلع میں (نام یاد نہیں رہا) خطاب فرما رہے تھے۔ فون پر راقم الحروف نے گفتگو کی حقانی صاحب نے دوسرے دن جواب دینے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن نوید عید کی طرح جواب آیا مقامی خطاب کے ذمہ داروں نے ہماری غائبانہ عقیدت اور مخلصانہ طلب پر اپنے پروگرام سے دو یوم دینے پر اتفاق کر لیا۔ تاریخ مقرر ہوگئی پہلا خطاب مکہ مسجد میں اور دوسرا جامع مسجد سکندرآباد میں طے پایا۔ اگرچہ ان دونوں خطاب عام کا انتظام و انصرام مجلس علمیہ کی جانب سے ہو رہا تھا جس کا راقم الحروف ذمہ دار تھا لیکن موقع و محل کی نزاکت کی وجہ سے اس تحریک کو مجلس علمیہ سے

علیحدہ رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ اس کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ شہر کے سربرآوردہ حضرات کے نام سے حقانی صاحب کا دو لیومی خطاب عام شائع کر دیا جائے پھر اکیس افراد کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں شہر حیدرآباد و سکندرآباد کے نامی گرامی حضرات اور رئیس التجار شامل تھے۔ بس مجلس اشاعت اسلام کی تاسیس کی یہ خشت اوّل تھی۔ آئندہ چند سالوں میں اس تحریک نے مسلمانانِ دکن کی رشد وہدایت کے لئے وہ کارنامہ انجام دیا جس کو مستقبل کا اسلامی مؤرخ مجلس علمیہ کا تجدیدی کارنامہ قرار دے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ (تفصیلات آگے آرہی ہیں)

حقانی صاحب کا تعارف

محمد پالن حقانی صاحب صوبۂ گجرات (ہند) قبیلہ میانہ کے (جو انگریزی دور میں ڈاکو قبیلہ کی حیثیت سے معروف تھا) ایک فرد ہیں۔ شہر حیدرآباد میں جب تشریف لائے تھے جامع مسجد سکندرآباد میں دو لاکھ سے زائد مسلمانوں کے اجتماع میں خود اپنا تعارف اس طرح کروایا۔

"میں ایک امّی صفت مسلمان ہوں اُردو پڑھنا تو جانتا ہوں لکھ نہیں سکتا۔ انگریزی دور میں میرے ماں باپ لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے الزام میں جیل میں تھے۔ میں انہی دنوں جیل میں پیدا ہوا۔ میرے باپ نے میرا نام محمد پالن رکھا۔ گجراتی زبان میں پالن کے معنی مہربان کے ہیں۔

میں نے اسکول کی صورت نہیں دیکھی ہے جب ہوش آیا تو محنت مزدوری میں لگا دیا گیا۔ جوان ہوا تو اپنے شہر داکانیر (گجرات) کی ایک کپڑا مل میں ملازم ہو گیا، فطرۃً میری آواز اچھی تھی خارجی اوقات میں قوّالی شروع

کردی میرے بچپن کا ایک دوست[1] جو طبلہ بجانے میں ماہر تھا اس نے میری قوالی پر چار چاند لگا دیئے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے اپنی قوالی کا رخ پھیر دیا اور نعتیہ قوالی شروع کردی اور اس میں کمال حاصل کیا اس پر عوامی شہرت نے مجھ کو "حقانی قوال" کا خطاب دیا۔ اسی دن سے میرا نام محمد پالن حقانی ہوگیا۔ یہ تو میرا ذاتی تعارف تھا باقی مجھ کو قرآن و حدیث کا علم کیسے ملا جبکہ میں اُمّی صفت آدمی تھا؟ اس کا قصہ یہ ہوا کہ ہمارے ضلع واکانیر میں علاقہ کچھ سے ایک مجذوب جن کا نام محمد مرتضیٰ تھا چلے آئے، پستہ قد، بھاری بدن، سر بہت بڑا۔ آنکھیں شیر کی طرح کشادہ اور نہایت سرخ، کسی پر ایک نظر پڑ جائے تو لرزہ طاری ہوجائے، ایک برہمن نوجوان اُن سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگیا تھا اور ان کی خدمت کے لئے ہمیشہ ساتھ رہا کرتا تھا۔ میں نے سخت سردیوں میں بھی دیکھا کہ وقفہ وقفہ سے وہ خادم مجذوب صاحب کے سر پر ٹھنڈے پانی کا برتن انڈیل دیا کرتا تھا جس سے اُن کی بے قراری میں کچھ سکون پیدا ہوا کرتا تھا، شہر کے ہندو اور مسلم اُن مجذوب سے دُعا کروانے آتے تھے لیکن وہ کسی کو دیکھتے تک نہ تھے میں بھی فرصت کے اوقات میں اُن مجذوب کو اپنی نعتیہ قوالی سنانے جایا کرتا تھا۔ بعض دفعہ میری قوالی پر خوش ہوتے، میں دعا کی درخواست کرتا کبھی تو خاموش ہوجاتے اور کبھی مسکرا دیتے اور کبھی کہتے تیرا گھوڑا سب سے

---

[1] مشہر بمبئی میں یہ طبلہ نواز آج کل (۱۹۹۳ء) آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ موسیقی کا مقبول ترین پروفیسر ہے۔ حقانی صاحب سے آج بھی بہت محبت کرتا ہے۔ راقم الحروف سے بارہا ملاقات ہوئی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اھدہ وسدد خطاہٗ

آگے ہو جائے گا۔ میرا مقصد تو یہ ہوتا تھا کہ میں قوالی میں سب سے آگے ہو جاؤں
(حقانی صاحب نے یہاں ۔اے وَن قوال کا لفظ استعمال کیا)

اس طرح سلسلہ جاری رہا لوگوں نے اُن کے لئے جنگل میں ایک جھونپڑی بنادی تھی اُسی میں وہ رہا کرتے تھے کبھی شہر یا بازار کا رخ نہ کرتے۔ ایک رات میں عشا کے بعد پہنچا اسوقت وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کھچڑی قسم کا کھانا تھا۔ برتن سے ایک لقمہ اُٹھاتے آدھا گر جاتا اور آدھا منہ میں جاتا۔ ناک اور منہ کی آلائش بھی گر رہی تھی بہت دیر تک کھاتے رہے دو ایک لقمے بچ گئے تو برتن میری جانب ڈھکیل دیا اور گجراتی زبان میں زور سے کہا "کھالے" میں نے کہا بابا آپ کھالیں میں ابھی گھر جا رہا ہوں وہاں کھالوں گا بچے بھی انتظار کر رہے ہیں۔

ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مجھ پر کیکپی طاری ہوگئی پھر اتنے زور سے "کھالے" کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی بھی لمحہ ایک زبردست طمانچہ پڑنے ہی والا ہے میں نے آنکھ بند کر کے وہ لقمہ منہ میں ڈال لیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن آپ دیکھ رہے ہیں ہمیں چھ چھ ماہ گھر جانے کی فرصت نہیں ملتی، ایک ایک سال کے پیشگی پروگرام طے ہو جاتے ہیں آئندہ چھ ماہ تک ہمارے ہاں ایک دن بھی خالی نہیں ہے۔

بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے، یہی ہمارے علم کا تعارف ہے۔

دو ضروری سوال راقم الحروف نے ایک دفعہ حقانی صاحب سے دریافت کیا تھا مجذوب صاحب کا واقعہ تو ایک قسم کا تصرف تھا لیکن آپ کی زندگی میں تبدیلی کی عملاً کیا صورت پیش آئی ؟

کہنے لگے اس واقعہ کے بعد میں قوالی سے دل برداشتہ ہونے لگا اور دلچسپی ختم ہونے لگی۔ کپڑے کی مل میں ملازمت کا سلسلہ جاری تھا ماہانہ بیس روپے

تنخواہ ملا کرتی تھی۔

دینی کتابیں خریدنے کا شوق پیدا ہوا ہر ماہ دس بارہ روپوں کی دینی کتابیں خریدنے لگا۔ ہر روز مطالعہ کا شوق بڑھتا ہی گیا اور غیر شعوری طور پر جو کچھ بھی پڑھتا وہ ذہن میں محفوظ ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد بہت جلد شہر کی مساجد میں وعظ و نصیحت کرنے لگا، ہر وعظ میں لوگوں کی کثرت ہونے لگی ایک شخص نے دستی لاؤڈ اسپیکر خرید کر دیا اس طرح ہفتے میں دو دن سائیکل پر دیہات چلا جاتا اور وہاں مسلمانوں کو جمع کر کے وعظ و نصیحت کر آتا یہ سلسلہ مقبول ہونا شروع ہوا، پھر مختلف دیہات سے تقاضے آنے شروع ہو گئے، ایک دفعہ ایک گاؤں میں وعظ کر رہا تھا غیر مسلم حضرات بھی شریک تھے، انہیں میری باتیں بہت پسند آئیں۔ ایک ہندو چودھری نے میری آمد و رفت کی مشقت کو محسوس کیا اور ایک گھوڑا گاڑی خرید کر دی اس کے بعد میرا مسئلہ آسان ہو گیا اب دور دور دیہات میں بھی جانے لگا، جب دیہات کے مطالبے بڑھ گئے تو مل کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اب ہمارا کام وعظ و نصیحت ہی کا رہ گیا۔ جو کتاب بھی پڑھتا اس کا مضمون اور صفحہ نمبر از بر ہو جاتا یہی حال قرآن و حدیث کا تھا۔ جو بھی آیت پڑھتا اس کی سورت کا نام، پارہ نمبر، آیت نمبر اور حدیث میں کتاب کا نام، جلد کا نام، عنوان کا نام، حدیث نمبر، راوی کا نام اور حدیث کا مضمون سب کا سب ذہن میں محفوظ ہو جایا کرتا تھا پھر جب بولنے لگتا تو خود بخود ساری باتیں یاد آ جاتیں۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا پھر تو یہ ٹیپ ریکارڈ ہوا؟ کہنے لگے ہاں خدائی ٹیپ ریکارڈ۔

اس کے بعد میں نے دوسرا سوال کیا، حقانی صاحب کیا آپ وعظ کے درمیان

کسی بات کو بھول بھی جاتے ہیں؟
کہنے لگے ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔
میں نے کہا پھر وہ بات کیسے یاد آجاتی ہے؟
فرمانے لگے ایسی صورت بہت کم پیش آتی ہے اور جب بھی آگئی ہم یہ آیت پڑھ لیتے ہیں:۔
اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝
پھر نبی علیہ السلام پر درود پڑھتے ہیں وہ بات یاد آجاتی ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ راقم الحروف ہی نہیں شہر حیدرآباد کے لاکھوں مسلمانوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ اللہ اکبر

حقانی صاحب کا دو یومی خطاب

گذشتہ اوراق میں یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ مجلس علمیہ کو وقتی طور پر تحریک حقانی سے علیحدہ رکھنا ضروری تھا اس کی یہ صورت اختیار کی گئی کہ شہر کے سربرآوردہ حضرات کی ایک کمیٹی بنادی گئی اور انہی کی جانب سے اعلانات اور اشتہارات شائع کئے گئے۔
ان خطابات کے عملی انتظام و انصرام میں سرفہرست جناب محبوب عالم خان صاحب (گولکنڈہ فیکٹری مشیرآباد) صدیق بھائی مرحوم (ملک پیٹ) مولانا قطب الدین صاحب چشتی (مدرسہ نورالہدیٰ) نواب عبدالرحمٰن خان صاحب ونواب باقر خان صاحب (باقر باغ سعید آباد) شفیع میاں صاحب (میدک ٹرانسپورٹ) جناب نعمت اللہ صاحب (آپٹیکل سیاسی عابد روڈ) جناب ابراہیم مستقطی صاحب (کوٹلہ عالیجاہ) الحاج محمد عمر صاحب (مرحوم)

(مشیرآباد) سعید حقانی صاحب اور ملک حقانی صاحب (ملک پیٹ) شامل تھے بلکہ انہی حضرات کی جدوجہد وایثار وقربانی سے حقانی صاحب کا پہلا دو یومی خطاب نہایت صبر آزما حالات میں تکمیل پایا۔ فجزاہم اللہ خیراً

ان دو یومی خطاب میں شہر اور مضافات شہر کے تین لاکھ سے زائد مسلمانوں نے شرکت کی۔ خطابات نہایت حیرت انگیز اور معجز نما تھے جو عام طور پر دیکھنے اور سننے میں نہیں آئے ان کی تفصیلات زیر نظر کتاب "کاروانِ حیات" کا موضوع نہیں ہیں تاہم مجلس علمیہ سے وابستگی کا رشتہ ایسا نہیں کہ ان کو نظر انداز کردیا جائے جبکہ مجلس علمیہ کے ذمہ دار ہی ان اجتماعات کے محرک رہے ہیں۔

بہرحال دو یومی خطاب طے ہوجانے کے بعد حقانی صاحب کا ایک مکتوب راقم الحروف کے نام آیا جس میں تین باتیں درج تھیں۔

(۱) شہر میں قیام صرف چھتیس گھنٹے رہے گا اس میں دو پروگرام ہوں گے (یعنی دو خطاب)

(۲) آمدورفت بذریعہ ہوائی جہاز ہوگی۔

(۳) دونوں خطاب کھلے میدان میں رکھے جائیں۔

اس وقت تک پروگرام طے پا چکا تھا، پہلا خطاب شہر کی طویل و عریض دور قطب شاہی کی قدیم "مکہ مسجد" میں اور دوسرا خطاب جامع مسجد سکندرآباد میں اور اس کے اعلانات بھی شائع ہوچکے تھے، حقانی صاحب کے مطالبہ کو اس وقت پورا کرنا ممکن نہ تھا، کیونکہ کافی تشہیر ہوچکی تھی اور وقت بھی تنگ تھا۔ بہرحال حقانی صاحب تشریف لائے ایرپورٹ پر اچھا خاصا مجمع ہوچکا تھا حقانی صاحب کو جہاز سے اترتا دیکھکر سب کی آنکھیں خیرہ ہورہی تھیں۔ قلوب پر عظمت وشوکت کے ساتھ ہیبت وخوف طاری ہونے لگا۔

اس کیفیت کو ہر ایک نے محسوس کیا حالانکہ یہ کوئی پہلا استقبال نہ تھا اس سے پہلے بھی بڑے بڑے علمار کرام کا اسی ایئر پورٹ پر استقبال کیا جا چکا تھا۔ حقانی صاحب دراز قد، چھریرا بدن، دراز زُلف، با وقار چہرہ، اونچی گردن، نیچی آنکھیں، لمبا کُرتا (عربی ثوب کی طرح) تہبند پوش، نہایت مستعد، صحت مند حالت میں تیزی کے ساتھ ایئر پورٹ ہال میں آگئے اور آتے ہی اپنے سامان سے امریکن پستول کارتوس سے بھرا پٹہ زیب تن کرلیا اب تو کچھ اور ہی شکل تھی۔ اہلِ دکن نے علما، وواعظین کو اس حال میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

مختصر تعارف کے بعد جناب ابراہیم مستقطی صاحب باہر لے آئے اور اپنی کار میں آگے خود بیٹھ گئے پیچھے دائیں بائیں راقم الحروف اور مولانا قطب الدین صاحب چشتی اور درمیان میں حقانی صاحب چاروں کا قافلہ قیام گاہ باغ قربا سعید آباد روانہ ہوا۔ پیچھے موٹر کارز اور اسکوٹرز کی قطاریں تھیں۔ ایئر پورٹ سے نکلتے ہی میں نے حقانی صاحب کو اُن کے دو یومی خطاب کا قد آدم اشتہار دکھایا دیکھتے ہی فرمایا مولوی صاحب ہم نے آپ کو کیا لکھا تھا؟ میں خاموش ہوگیا، کچھ ترش روئی سے فرمایا ہم نے آپ کو لکھا تھا کہ ہمارے پروگرام کسی کھلے میدان میں رکھے جائیں آپ کی سمجھ میں نہیں آیا؟

اس وقت ابراہیم مستقطی صاحب اور مولانا قطب الدین صاحب دم بخود تھے میں نے ہمت کرکے کہا۔ حقانی صاحب مکہ مسجد کسی میدان سے کم نہیں ہے، طویل و عریض مسجد ہے۔ بس اس پر میری شامت آگئی۔ نہایت ہی تند و تیز لہجہ میں فرمانے لگے۔ کیا پولو گراؤنڈ سے بھی بڑی ہے؟

ارے مولوی نے کب مانا ہے جو تم مانوگے؟ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّابِاللهِ اَسْتَغْفِرُ اللهَ۔

پھر یکدم خاموش بھی ہوگئے۔ ادھر ہم تینوں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
اللہ اللہ یہ کیا ہوگیا؟ اب یہ کیا وعظ کریں گے انہیں کسطرح منایا جائے؟
سارا راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ باقر باغ پہنچتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے دوپہر کا وقت تھا، دسترخوان تیار تھا۔ منتظمین حضرات کو راستے کی کہانی سنائی گئی۔ اب کسی کی ہمت نہ تھی کہ حقانی صاحب کو دسترخوان پر بلائے۔ نواب سکندر پاشا اور صدیق بھائی نے کہا۔ مولانا صاحب آپ ہی ہمت کریں ؏ یہ کچھ اور ہی سننے ہنے اگر کہتے ہم ہی کہتے
میں نے بسم اللہ پڑھی اور حقانی صاحب سے کہا دسترخوان تیار ہے اور آپ کا انتظار کیا جارہا ہے؟
بس فوری اُٹھے اور دسترخوان پر آبیٹھے۔ نواب صاحب نے اپنی خاندانی روایت کے تحت ہمہ نوعی دسترخوان تیار کیا تھا کئی قسم کے کھانے تھے۔ دسترخوان پر ایک لطیفہ پیش آیا جس سے حقانی صاحب کھل گئے۔ مولانا حامد صدیقی صاحب (شہر کے معروف عالم دین) حقانی صاحب کی داہنی جانب بیٹھے تھے، حقانی صاحب سے کہا مولانا اپنا پستول اور کارتوس پٹہ اتار دیجئے اور آرام سے بیٹھ جائیے!
حقانی صاحب نے فوراً جواب دیا۔ مولانا آپ خواہ مخواہ وزن سے کیوں دبے جارہے ہیں؟ بھینس پر بھینس کے سینگ بھاری نہیں ہوتے۔ بس سارا دسترخوان ہنس پڑا اور وہ سکوت وحیرانی جو سب پر چھائی ہوئی تھی جاتی رہی۔ پھر حقانی صاحب سب میں ایسے رل مل گئے گویا بے تکلف دوستوں میں ہیں۔
کھانے کے بعد استراحت کے لئے لیٹ گئے۔ راقم الحروف اور سکندر نواب و باقر نواب کے علاوہ سب حضرات اجتماع کی تیاری کے لئے باہر چلے گئے۔ تین بجے شام باقر باغ کے احاطہ میں پولیس گاڑی داخل ہوئی ایک پولیس آفیسر نے تفصیلات

معلوم کیں کہ مہمان کون ہیں ؟ ان کا تعارف کیا ہے ؟ آنے کا کیا مقصد ہے ؟ وغیرہ وغیرہ۔ سکندر نواب صاحب نے سب جوابات دیدیئے، پھر پوچھا کہ آخر کیا بات ہے ایسا کبھی نہیں ہوا یہاں اکثر علماء آیا کرتے ہیں۔ پولیس آفیسر نے کہا مجھ کو اس کا علم نہیں ابھی ابھی پولیس کنٹرول روم سے فون آیا کہ معلومات حاصل کی جائیں ولبس۔ بہرحال وہ چلا گیا، ہم نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ عصر کے بعد چائے نوش کی جا رہی تھی احباب کا خاصا مجمع تھا اچانک پولیس گاڑی پھر داخل ہوئی اس میں چار مسلح پولیس والے تھے سپرنٹنڈنٹ پولیس حقانی صاحب کے کمرے میں ادب واحترام سے داخل ہوا مصافحہ کیا اور ادب سے بیٹھ گیا اس وقت منتظمین حضرات میں ہلچل پیدا ہوگئی کہ آخر قصہ کیا ہے ؟

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حقانی صاحب کا ذاتی تعارف حاصل کیا۔ (جو بڑا تفصیلی اور دلچسپ تھا) آخر میں یہ خبر دی کہ مولانا آپ کی تشریف آوری سے شہر میں نقضِ امن کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے آئی جی پی صاحب (انسپکٹر جنرل پولیس) (جو اُس وقت عبدالسلام صاحب تھے) نے شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی ہے جلسہ، جلوس اور اجتماعات پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ حقانی صاحب نے بغیر کسی تردد نہایت اطمینان سے فرمایا ٹھیک ہے یہ اُن کا اپنا کام ہے، ہمارا کام وعظ کرنا ہے جو آج بہر صورت ہوگا۔

اس پُراعتماد جواب پر منتظمین ہی نہیں سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی حیران تھا کہ مولانا کیا کہہ رہے ہیں ؟ پھر اُس نے یہ انکشاف کیا کہ آپ کی تشریف آوری کے اعلان پر شہر کے تمام علماء ومشائخ نے آئی جی پی سے نمائندگی کی اور یہ محضر پیش کی کہ حقانی گستاخِ رسول ہے۔ اولیاء اللہ کی توہین کرتا ہے۔ مسلمانوں میں انتشار و تفریق پیدا کردیتا ہے، دکن کے مسلمان اسکو ہرگز برداشت نہیں کریں گے نقضِ امن

کے علاوہ قتل و خون کا بھی اندیشہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس الزام پر حقانی صاحب ایسے برس پڑے کہ پولیس والے بھی دم بخود ہو گئے، پھر حقانی صاحب نے اپنی بات دہرائی آج ہمارا وعظ ہوگا جائیے آئی جی پی صاحب سے کہہ دیجئے کہ وہ پولیس جمعیت لیکر مکہ مسجد آجائیں۔

اس وقت حقانی صاحب اپنی مسلح حالت میں ایسے معلوم ہو رہے تھے کہ وہ کسی محاذ جنگ کے فیلڈ مارشل ہیں۔ اُن کی پُر وقار اور پُر اعتماد شخصیت سے پولیس والے بھی مرعوب نظر آرہے تھے۔ بہرحال پولیس سپرنٹنڈنٹ شائستہ قسم کا ہندو تھا یہ کہتا ہوا باہر نکلا کہ اپنے مولوی صاحب کو سنبھالیئے صورت حال نازک ہے۔ وہ تو روانہ ہو گیا۔ اِدھر منتظمین حضرات میں کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ حقانی صاحب کے قریب ہی آئے۔

مغرب کا وقت قریب تھا، عشاء کے بعد وعظ ہونے والا ہے ابھی تک ایک فیصد بھی یکسوئی نہ ہوسکی۔ مغرب سے کچھ پہلے پھر ایک مسلح گاڑی آئی اس میں سابق سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ دو ایک مسلم پولیس آفیسر بھی تھے اور دو چار مجلس اشاعت اسلام کے ذمہ دار بھی۔ یہ صورت اور بھی زیادہ تشویشناک ثابت ہوئی حقانی صاحب اُسی جاہ و جلال کی حالت میں تھے اسب داخل ہوئے اور دُعا سلام کے بعد شہر کی موجودہ صورت حال کو پھر بیان کیا اور کہا کہ آئی جی پی صاحب سے مراجعت کے بعد طے ہوا ہے کہ حقانی صاحب اپنی جانب سے ایک تحریری ضمانت دیں کہ وہ اپنے وعظ میں رسول اللہ اور اولیاء اللہ کی شان میں بے ادبی نہیں کرینگے اور مسلم جماعتوں کا نام بھی نہیں لیں گے۔

اس تجویز پر حقانی صاحب کا سکوت طوفان و آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا کہنے لگے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم آج تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں

گستاخی کرتے رہے ہیں، اولیاء اللہ کا مذاق اڑایا ہے اور مسلمانوں میں انتشار وتفرقہ پیدا کی ہے اور آج آپ کے شہر میں ایسا نہیں کریں گے، یہی مطلب ہے نا آپ کا؟ یہی مطلب ہے نا آپ کا؟

سب دم بخود تھے، حاجی محمد عمر صاحب (مشیر آباد) نے بڑی ہمت کی اور کہا حقانی صاحب! تو پھر آج آپ کا وعظ نہیں ہوگا؟ حقانی صاحب نے فوراً جواب دیا اگر آپ حضرات مرد ہیں تو اجازت لیکر رہیں گے، پھر سب پر سکوت چھا گیا، پولیس والے بھی خاموش تھے، مغرب کی نماز کا وقت شروع ہوگیا ایک ہندو آفیسر نے کہا حقانی صاحب جب آپ زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی شان میں کبھی گستاخی نہیں کی، اولیاء اللہ کی توہین نہیں کی ہے تو پھر آپ کو یہی بات کاغذ پر لکھنے میں کیا اعتراض ہے؟ بس کشتی بھنور سے نکل آئی راقم الحروف سے فرمایا مولوی صاحب کاغذ اور قلم لایئے۔

میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ حقانی صاحب نے اپنا بیان اسطرح قلم بند کروایا جناب آئی۔ جی پی صاحب حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

جناب عالی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں گستاخی کرنا یا اولیاء اللہ کی توہین کرنا کفر ہے۔ ہم خود ایسے گستاخی کرنے والوں کو کافر کہتے ہیں۔ فقط

دستخط
محمد پالن حقانی

لطیفہ: اس وقت کافروں کی جماعت (پولیس والے) سامنے تھی حقانی صاحب نے مجھ سے قلم لیا اور گجراتی میں دستخط کردیئے اور کاغذ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے حوالہ کردیا۔

طوفان و زلزلہ کا یہ غیر یقینی ماحول یکدم سکون و مسرت کا ماحول بن گیا سب کے چہرے دمک اٹھے، پولیس والے یہ کہتے ہوئے اُٹھے چلیے صاحب آپ لوگ جلسہ کا انتظام کیجئے ہم بھی آ رہے ہیں۔

حدیث شریف میں یہ مضمون ملتا ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت بدکار آدمی سے بھی لے لیتے ہیں۔ مغرب کی اذان شروع ہو گئی۔ نماز مغرب کے بعد حقانی صاحب کی استراحت کے لئے کمرہ خالی کر دیا گیا۔ منتظمین حضرات مکہ مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔ اس وقت اتنے کارکن ہاتھ آئے کہ گھنٹوں کا کام منٹوں میں مکمل ہونے لگا اور مکہ مسجد سے بار بار یہ اطلاع آنے لگی کہ چاروں جانب سے ہجوم ٹوٹ پڑا ہے مرد و خواتین کے قافلے در قافلے چلے آ رہے ہیں۔ مکہ مسجد کا طویل و عریض صحن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ پانچ سو مسلح پولیس نے ٹریفک کا انتظام سنبھال لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بعد عشاء حقانی صاحب اپنی مسلح حالت میں راقم الحروف اور ابراہیم مستقلی صاحب اور دو مسلح نوجوانوں کی معیت میں روانہ ہوئے کار میں بیٹھتے ہی حقانی صاحب نے کہا کہ غیر معروف راستے پر چلیں چنانچہ سعید آباد سے براہ عابد روڈ مکہ مسجد پہنچے۔ جب مکہ مسجد کے گیٹ پر پہنچے، ہماری آنکھیں پھٹ گئیں۔ انسانی سروں کا سمندر معلوم ہو رہا تھا۔ چار مینار تک لوگوں کا ہجوم ہی ہجوم تھا، خدا جانے اتنے مسلمان کیوں جمع ہوئے؟ اِنہیں کس نے جمع کیا؟ واعظ ایک اجنبی غیر معروف انسان ہے شہر میں پہلی دفعہ آیا ہے اہل شہر تو کیا منتظمین حضرات بھی ناواقف ہیں، پھر مرد و خواتین کا حد نظر ہجوم کیونکر جمع ہو گیا؟

جلسے کی پولیس منظوری سے پہلے یہ چھوٹا سا لطیفہ پیش آیا جو قابل ذکر ہے اسکو جلسے کی منظوری کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

آئی جی پی کی جناب عالی میں مشائخ دکن کی فریاد نے یہ صورت پیدا کر دی کہ مجلس اشاعت اسلام کے سارے ذمہ داروں کو پولیس کمشنر نے اپنے آفس طلب کر لیا، یہ سب کے سب شہر کے نامی گرامی نیک نام اور اہل ثروت و تجار حضرات تھے۔ کمشنر نے کہا کہ شہر کے مشائخ و لیڈروں کو حقانی صاحب پر یہ یہ الزامات ہیں آپ حضرات نے ایسے آدمی کو کیوں دعوت دی۔ شہر میں نقص امن کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ارکان مجلس نے کہا کہ یہ سب حقانی صاحب پر جھوٹے الزامات ہیں۔ حقانی صاحب بیس پچیس سال سے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں وعظ کر رہے ہیں، ہزاروں نہیں لاکھوں مسلمان ان کا وعظ سننے جمع ہو جاتے ہیں۔ قتل و فساد تو در کنار آج تک کہیں بھی انتشار نہیں ہوا دوجود امن و اتحاد کے بہت بڑے رہنما ہیں ارکان میں آٹیکل سیلس عابد روڈ کے رئیس التجار جناب نعمت اللہ صاحب بھی تھے کمشنر پولیس انکا دوست تھا اُس نے نعمت اللہ صاحب سے کہا کہ جناب آپ خاموش کیوں ہیں؟ آپ بھی کچھ فرمائیے۔ اس پر نعمت اللہ صاحب بول پڑے، کمشنر صاحب شہر کے مشائخ کہتے ہیں کہ حقانی صاحب رسول اللہ اور اولیاء اللہ کی شانِ مبارک میں توہین اور گستاخی کرتے ہیں ہم کو ایسا کوئی علم نہیں ہے ہم پہلی بار انہیں سن رہے ہیں، البتہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ایک چیلنج کرنا چاہتا ہوں؟ اس پر سب متوجہ ہو گئے۔ آپ ایک ہزار مسلح پولیس کی موجودگی میں مسجد کے اندر نہیں اپنے پولیس کنٹرول روم کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں صرف ایک گستاخی کر دکھائیں نعمت اللہ آپ کی زبان کو کھینچ نہ لے تو نعمت اللہ نعمت اللہ نہ ہو گا۔

کمشنر اور دیگر آفیسرز ہنس پڑے، پھر کہا کمشنر صاحب حقانی بیس سال سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں علی الاعلان گستاخی کر رہا ہے لیکن ہندوستان کے مسلمان اتنے بے غیرت ہو گئے ہیں کہ اسکی زبان نہیں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر دیئے، بات آپ کی سمجھ میں کچھ آ رہی ہے ؟

کمشنر نے کہا نعمت اللہ صاحب واقعی آپ کے مہمان حقانی صاحب کے بارے میں شہر کے مشائخ نے بڑی سازش کی ہے ایسا ممکن ہی نہیں کہ مسلمان اپنے رسول کے بارے میں اتنے بے غیرت ہو گئے ہوں؟ جائیے حقانی صاحب سے ایک سیدھی سادھی تحریر لے آیئے میں جلسہ کی اجازت دے دوں گا۔ ویسے آئی جی پی نے تو دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی ہے۔

بہرحال اس کے بعد سب ارکان اور سپرنٹنڈنٹ پولیس دوسری بار حقانی صاحب کے پاس آئے جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے پھر جلسے کی اجازت مل گئی ایک محتاط اندازے کے مطابق مکہ مسجد میں دو لاکھ سے زائد مرد و خواتین جمع ہو گئے تھے دوسرے دن مقامی اخبارات نے صرف خواتین کی تعداد ساٹھ تا ستر ہزار ظاہر کی تھی جو تاریخ دکن کا نادر واقعہ ہے۔

پہلا خطاب مکہ مسجد (۱۹۷۳ء)

حقانی صاحب نے وعظ سے پہلے ایک نعت پڑھی جس سے سارا مجمع سمٹ کر ایک جان ہو گیا، پھر فرمایا کہ ہم آپ کے شہر میں صرف دو دن کے لئے آئے ہیں آج کا خطاب لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر ہوگا اور کل مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ پر ہوگا۔

پھر توحید پر بیان شروع ہوا۔ علماء اور حافظین قرآن کی عقلیں دنگ رہ گئیں حقانی صاحب توحید الٰہی کے بارے میں اتنی کثرت سے آیات پیش کر رہے تھے گویا آیاتِ قرآنی کی بارش ہو رہی ہے۔ جو چیز انسانی عقل کو مغلوب و متاثر کر رہی تھی وہ ہر ہر آیت کا حوالہ تھا۔ پارہ نمبر، سورت کا نام،

رکوع نمبر، آیت نمبر، اتنی روانی سے بیان کر رہے تھے کہ کتاب دیکھکر بیان کرنے والا بھی ادا نہ کر سکے۔ یک وقت چار چار چھ چھ آیات کا اسی ترتیب سے بیان کرنا اہل علم اور علماء کو حیرت میں ڈال گیا اسی طرح جب حدیث شریف بیان کرتے تو کتاب نمبر، جلد نمبر، صفحہ نمبر، عنوان کا نام، حدیث نمبر، راوی کا نام ایک ایک وقت میں چار چار کتابوں کے حوالے اسی ترتیب سے بے تکلف بولتے جاتے، بعض دفعہ یک وقت سات کتابوں کے حوالے مذکورہ ترتیب کیساتھ بیان کرتے۔

راقم الحروف نے تو اس وعظ میں دو سو سے زائد حوالے شمار کر کے ہمت ہار دی، ڈیڑھ دو لاکھ کا مجمع ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پا بزنجیر ہے اور اسقدر پُرسکون کہ ذرا سی بھی ہلچل نہیں۔ اللہ کی ذات و صفات کا تذکرہ کچھ ایسا معجز نما تھا کہ اہل علم کو یہ کہتے سنا گیا کہ ہم نے اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا قرآنی تعارف اسطرح پہلی بار سنا ہے۔ وَلِلّٰہِ دَرُّہٗ۔

وعظ کے آخر میں پھر نعت پڑھی اور دعا کی۔ جلسہ برخاست ہوا لیکن پورا ہجوم اس طرح کھڑا رہا۔ گویا ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے ہوں۔ اسٹیج سے مسلسل گذارش کی جاتی رہی کہ راستہ خالی کر دیا جائے تاکہ حقانی صاحب باہر نکل سکیں لیکن عملی صورت گری قطعاً ممکن نہ تھی، ہجوم کا اسٹیج کی طرف ایسا دباؤ کہ ایک قدم بھی چلنا مشکل تھا نصف گھنٹہ اسی گذارش میں گذر گیا پھر ایسا ہوا کہ اس نازک وقت ایک غیبی طاقت نمودار ہوئی محلہ بارکس کے آہنی پہلوان سعید بام اپنے ساتھیوں کے ساتھ مجمع کو چیرتے پھاڑتے اسٹیج کے قریب آگئے اور ابراہیم مستقلی صاحب سے کہا حقانی صاحب کو اتار دیئے بس مسئلہ حل ہو گیا۔ سعید بام اپنے آہنی حلقہ میں حقانی صاحب کو لے کر چل پڑے، مجمع ایسا دور ہو رہا تھا جیسے

ہواؤں سے بادل پھٹتا ہے۔ گیٹ پر کار تیار کھڑی تھی۔ حقانی صاحب روانہ ہو گئے چلتے ہی حقانی صاحب نے کہا کسی اور راستے سے چلیئے چنانچہ مکہ مسجد سے براہ نامپلی، حبین ساگر کٹہ، بشیر باغ، کنگ کوٹھی چادرگھاٹ سعید آباد پہنچے۔ مکہ مسجد سے جونہی کار آگے بڑھی حقانی صاحب نے راقم الحروف سے کہا مولوی صاحب فرمائیے کل کے خطاب کے لئے جامع مسجد سکندرآباد کیا مکہ مسجد سے بڑی ہے؟

میں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ فوری اعتراف کرلوں کہا کم از کم پچاس گنا چھوٹی ہے۔ کہنے لگے تو پھر آپ مزہ چکھیئے، بہرحال ہم قیام گاہ پہنچے وہاں سعید بام اپنے ساتھیوں کے ساتھ منتظر تھے سب نے حقانی صاحب کے ہاتھ چومے، دعا لی اور ایک وحشت ناک انکشاف کیا جس سے فضا مکدر ہوگئی کہنے لگے حقانی صاحب شہر کا ایک مشائخ زادہ (جس کا نام بھی ظاہر کیا) ہمارے پاس آیا تھا اور ہمیں دس ہزار روپوں کی پیش کش کی اور کہا کہ حقانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے، اولیاء اللہ کی توہین کرتا ہے آج اس کا وعظ ہے اس جلسہ کو درہم برہم کردیا جائے اور حقانی کو ایسی ضرب لگائی جائے کہ وہ معذور ہوکر رہ جائے۔ شہر کے مشائخ نے مجھ کو آپ کے ہاں روانہ کیا ہے۔ (پھر سعید بام نے کہا) یہ سنکر ہم نے ارادہ کرلیا کہ ایسے گستاخِ رسول کو مزہ چکھانا چاہیئے، ہم اپنی جماعت کے ساتھ مکہ مسجد آگئے لیکن جب آپ نے توحید الٰہی کا بیان شروع کیا ہم سب رو پڑے ہم عرب نسل ہیں آپ نے ہم کو ہمارے ماں باپ کا سبق۔ یاد دلایا جس کو ہم ساری زندگی بھول بیٹھے تھے، شہر کے مشائخ نے ہم کو خدا پرستی کے بجائے قبر پرستی پر ڈال دیا۔ ہم نے مکہ مسجد کے صحن ہی میں توبہ کی اور اب آپ سے ملاقات کرنے آئے ہیں حاضرین کی زبان سے

اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔

حقانی صاحب نے انہیں قیمتی عطر جو انہیں کلکتہ میں دیا گیا تھا پیش کیا اور دُعا دے کر رخصت کیا۔ سعید بام نے چلتے وقت حقانی صاحب سے آئندہ تشریف آوری پر ایک وعظ اپنے محلہ بارکس میں طے کروالیا۔ چنانچہ چھ ماہ بعد جب حقانی صاحب بارہ یوم کے لئے شہر حیدر آباد آئے تو بارکس میں بھی ایک وعظ ہوا جس میں پرانے شہر کے سارے مسلمان جمع ہو گئے جس کے عجیب وغریب اثرات مرتب ہوئے۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

دوسرا خطاب ۱۹۷۳ء (جامع مسجد سکندرآباد) مکہ مسجد کے پہلے ہی خطاب میں حقانی صاحب نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کل ہم اپنا ذاتی تعارف بھی بیان کریں گے کہ ہم اُمّی صفت انسان تھے، ہمیں قرآن وحدیث کا یہ عظیم الشان علم کیسے ملا؟ (اس کی تفصیل پہلے آچکی ہے) دوسری بات یہ کہ وعظ کے آخر میں ہم اپنی ماں، بہنوں کو بھی خصوصی خطاب کریں گے، جو خواتین اس جلسے میں شرکت سے محروم رہیں گی وہ آئندہ چھ ماہ تک افسوس کرتی رہیں گی۔

ویسے بھی مکہ مسجد کے پہلے خطاب نے شہر کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ دوسرے دن مقامی اخبارات نے اس خطاب کو جلی عنوانات سے شائع بھی کر دیا تھا اسطرح شہر اور مضافات شہر میں عام تہلکہ مچ گیا، بات منہ درمنہ ایسی چلی کہ اضلاع سے قافلے در قافلے چلے آنے لگے۔ مسلمان مغرب ہی سے سکندرآباد کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ عشاء کی نماز تک اتنا ہجوم ہو گیا کہ جامع مسجد کے اطراف واکناف کے راستے بند ہو گئے۔ مسلمانوں نے جامع مسجد سے متصل عمارتوں کی چھتوں پر حتیٰ کہ درختوں پر سہارا لے لیا۔ تاریخ جامع مسجد میں

اتنا بڑا مجمع اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ گیا تھا۔ حقانی صاحب کا یہ خطاب اتنا پُر اثر اور لرزہ خیز تھا کہ جب خواتین کو خصوصی خطاب فرمانے لگے خواتین کی صفوں میں آہ و بکا کا طوفان اُبل پڑا، خواتین تو ویسے بھی رقیق القلب ہوتی ہیں۔ مرد بھی بے قرار ہوتے جا رہے تھے۔ راقم الحروف نے خود دیکھا ہے شہر کے ایک پیر صاحب جو اپنی بدعت پسندی میں عام شہرت رکھتے تھے زار و قطار رو رہے تھے۔ اللہ اکبر اَللّٰھُمَّ اھْدِہٖ وَسَدِّدْ خَطَاہُ

حقانی صاحب کا یہ خطاب "مائی تیرا لعل" (میری ماں تیرا بیٹا) کے عنوان پر تھا کہ جب تو بھلی تھی تو ایسے ایسے لعل تجھ سے پیدا ہوئے (یہاں نیکیوں کی طویل فہرست بیان کی) اور جب تو بُری بنی تو ایسے ویسے لعل جنم دیے (بُرے لوگوں کی طویل فہرست بیان کی) ترغیب و ترہیب کا یہ نادر الوجود عنوان تھا جسکو نہ صرف عورتوں نے پہلی بار سنا بلکہ مردوں نے بھی کبھی نہیں سنا تھا خطاب کی یہ تفصیل آج ۱۹۹۳ء میرے پاس موجود ہے۔

حقانی صاحب نے اپنے وعظ کے اختتام پر ایک اعلان کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ فرمایا ہمارے پاس آپ کے شہر میں دوبارہ آنے کیلئے اندرون چھ ماہ ایک دن بھی خالی نہیں ہے۔ انشاء اللہ آئندہ چھ ماہ تک ہمارے یہ دو وعظ آپ کے شہر میں اس طرح سنے جائیں گے جیسے ہر روز ریڈیو پر خبریں سنی جاتی ہیں۔

ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حقانی صاحب کے چلے جانے کے بعد شہر کے محلوں، مساجد میں ان دونوں وعظوں کے ٹیپ ریکارڈ اتنی کثرت سے سنے جانے لگے گویا حقانی صاحب شہر میں موجود ہیں۔

کراماتی مذاکرہ :- حقانی صاحب کے دو یومی خطاب کے دوران مجلس علمیہ

نے دوسرے دن بعد نماز عصر علماء کرام کے لئے ایک مجلس مذاکرہ کا اعلان کردیا تھا۔ حقانی صاحب نے خالی الذہنی میں ہماری اس خواہش کو قبول کرلیا۔ یہ خصوصی خطاب مجلس علمیہ کی مرکزی مسجد (ملک پیٹ) میں تھا۔ عصر کے بعد اپنی قیام گاہ "باقر باغ" سے چلے۔ راقم الحروف ساتھ تھا۔ دریافت فرمایا مولوی صاحب مجلس مذاکرہ کیا ہوتی ہے؟ بس میں پریشان ہوگیا یا اللہ اب کیا ہوگا؟ جب یہ مجلس مذاکرہ ہی نہ جانتے ہوں تو علماء کرام سے کیا گفتگو کریں گے؟ فوری سنبھل کر کہا حقانی صاحب آپ سے چند سوالات کئے جائیں گے آپ انکا جواب دیدیں بس یہی مجلس مذاکرہ ہوگی۔ حقانی صاحب خاموش ہوگئے۔

مسجد ملک پیٹ پہنچے بے پناہ ہجوم ہوگیا تھا حقانی صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہی از خود تقلید اور اس کی ضرورت پر پون گھنٹہ ایسی مکمل و مدلل تقریر کردی کہ سارے علماء کرام کی زبان پر سبحان اللہ سبحان اللہ کے کلمات جاری تھے، پھر اپنی تقریر روک دی اور راقم الحروف سے فرمایا مولوی صاحب مجلس مذاکرہ شروع کیجئے۔

میں نے حقانی صاحب سے عرض کیا اب چونکہ وقت کم ہے کسی مخصوص عنوان پر مذاکرہ ممکن نہ رہا بہتر ہے حاضرین کو اپنے اپنے سوالات پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ عوام کی جانب سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ حقانی صاحب ہر سوال کا جواب دینے لگے۔

سوالات مختلف قسم کے تھے، لیکن ہر جواب پر بطور حوالہ کتاب کا نام، جلد نمبر، باب نمبر، صفحہ نمبر اس طرح بیان کرنے لگے گویا کتاب سامنے موجود ہے۔ جب بیک وقت سوالات کی کثرت ہونے لگی تھیں نے حقانی صاحب سے گذارش کی کہ جواب دہی کا سلسلہ پانچ منٹ کے لئے بند کردیں پھر حاضرین سے گذارش کی

جن صاحب کو بھی سوال کرنا ہو براہ کرم کاغذ پر لکھکر ہمیں دیدیں اس کیلئے پانچ منٹ کا وقت دیا جاتا ہے۔

جب سب پرچیاں جمع ہوگئیں تو راقم الحروف نے سلسلہ وار سوالات پڑھنے شروع کئے، حقانی صاحب برجستہ اس روانی سے جواب دینے لگے کہ عوام ہی نہیں علمائے کرام دم بخود تھے۔ کسی بھی مسئلہ پر جائز ناجائز، حلال، حرام یا مکروہ کہدینا ہر عالم کے لئے آسان ہے لیکن ہر جواب پر بغیر کتاب دیکھے برجستہ مستند کتابوں کا صفحہ نمبر اور نام بتادینا کسی کے بس کی بات نہیں لیکن حقانی صاحب نہایت پراعتمادی سے ہر سوال کا جواب مع حوالۂ کتاب و صفحہ نمبر دینے لگے۔ سوالات کی وہ پرچیاں آج (۱۹۹۳ء) میرے ہاں محفوظ ہیں۔ وَمَنْ شَآءَ فَلْیَرَاجِعْنَا۔ بہرحال مغرب کی اذان تک یہ کراماتی مذاکرہ جاری رہا۔

اذان کے بعد حقانی صاحب نے اعلان کیا کہ جوابات میں جن جن کتابوں کے نام اور صفحہ نمبر دیئے گئے ہیں۔ انشاء اللہ نماز کے بعد آپ کے کتب خانے کی کتابوں میں وہ صفحہ نمبر وغیرہ دکھائیں گے۔ نماز کے بعد ہم سے ربط پیدا کیا جاسکتا ہے (مجلس علمیہ کا نایاب کتب خانہ اسی مسجد میں تھا) اس اعلان پر مذاکرہ کا اختتام عمل میں آیا۔ فَسُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔

صدائے بازگشت

حقانی صاحب کے شہر سے چلے جانے کے کچھ دن بعد جامعہ نظامیہ میں جہاں راقم الحروف تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا حقانی صاحب کے وعظ پر تبصرہ ہوا اکثر علماء نے یہ تاثر دیا کہ وعظ و تقریر میں قرآن و حدیث و فقہ کی کتابوں کا برجستہ حوالہ دینا کوئی نادر بات نہیں ہے جس پر حیرت و تعجب کا اظہار کیا جائے، یہ بات مشق اور محنت سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اُمت میں ہر زمانہ میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں۔ امام بخاری پانچ لاکھ

احادیث کے حافظ تھے۔ امام ترمذی سات لاکھ احادیث کے اور امام حاکم پورے ذخیرۂ حدیث کے حامل رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت غالباً سب حضرات مجھ سے کچھ سننا چاہتے تھے ویسے بھی میں اپنا تاثر ظاہر کرنے والا تھا، ان حضرات کی خواہش پر میں نے کہا ٹھیک ہے امت دمشق سے ایسے لوگ پیدا ہوسکتے ہیں تاہم یہ نادر شخصیتیں نہ سہی، حیرت انگیز اور عظیم شخصیتیں ضرور ہیں جن پر اللہ کا بڑا فضل وکرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، امام حاکمؒ وغیرہم اسی حیثیت سے امت کی وہ عظیم شخصیتیں ہیں جن پر نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ اسلام کو بھی ناز و فخر ہے اور قیامت تک یہ حضرات ہدایت کے روشن چراغ قرار پائے ہیں لیکن اب تک ہم حیران اور لاجواب ہیں کہ مجلس علمیہ کے مذاکرے میں عوام کے مختلف النوع بیسیوں سوالات کے جوابات مع حوالہ کتاب، صفحہ نمبر، حدیث نمبر وغیرہ برجستہ دینا کس طرح ممکن ہوا؟ جبکہ نہ سوالات متعین تھے اور نہ جواب دینے والے کو پہلے اس کا علم تھا اس کی تاویل آج تک سمجھ میں نہیں آئی کیا آپ حضرات اس کا کچھ جواب دے سکیں گے؟ میرے اس تاثر سے ساری مجلس پر اوس پڑ گئی اور پھر بات دوسری جانب چل پڑی۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

تحریکِ حقانی کا پس منظر

سنہ ۱۹۶۱ء تا سنہ ۱۹۷۲ء بارہ سالہ وقفہ شہر حیدرآباد کا دینی اضطرابی دور سمجھا جاتا ہے ان دس بارہ سالوں میں شہر کے اہل بدعت نے اپنی طویل وعمیق نیند کے بعد کروٹ بدلی اور غیر شعوری طور پر احیاء بدعت کی جانب مائل ہوئے۔

اسباب کیا تھے، اس کا محرک کون تھا؟ ایسی کوئی بات واضح نہ ہوسکی البتہ جامع مسجد ملّے پلی (جہاں راقم الحروف کی خطابت کا سلسلہ تھا) کے قریب

مسجد ٹیک ناہیتی میں بیرون شہر کے بریلوی علماء وعظ کے لئے آنے لگے، غالباً سب سے پہلا واعظ جو اس مسجد میں طلب کیا گیا وہ بریلوی مکتب فکر کے ترجمان مولوی حبیب اشرف سنبھلی تھے۔ انہوں نے جہاں بریلوی عقائد کی ترجمانی کی، وہاں اپنے وعظ میں اہل سنت والجماعت کے علماء کی توہین و تذلیل کا عنوان بھی رائج کیا۔

یہ سلسلہ تیزی سے چل پڑا پھر بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے بلبل ہند طوطی گجرات، شیر پنجاب کی یلغار ٹوٹ پڑی اس بدنام زمانہ ٹولے نے تنقید یا تبصرہ کے طور پر نہیں ذلت واہانت کے لئے اپنا نشانہ شہر کی دینی واسلامی جماعتوں کو بنایا۔ اس میں جہاں اہل سنت والجماعت کے عام مسلمان تھے وہاں جماعت اسلامی، جماعت اہل حدیث اور جماعت تبلیغی کو خاص طور پر نشانہ بنایا جانے لگا، اس مکروہ صورت حال سے جہاں عام مسلمان مجروح ہو رہے تھے وہاں شہر کا سنجیدہ طبقہ بھی پریشان تھا کہ اس بدتمیزی اور بدکلامی کا انسداد کیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ علماء حق کو زحمت دی جانے لگی، انہوں نے صبر وتحمل اور شرافت کے عنوانات میں مسلمانوں کو دعوت فکر دی کہ دین وہ نہیں ہے جو یہ درآمدی طبقہ پیش کر رہا ہے ان کا کلام اور ان کی زبان خود یہ شہادت دے رہی ہے کہ یہ تفریق بین المسلمین کے علمبردار ہیں، ان کے ہاں کوئی مثبت پہلو نہیں اور نہ کوئی تعمیری مقصد تاہم ان کی بدتمیزی اور بدکلامی کا جواب ان حضرات سے ممکن نہ تھا ان کی شرافت ومتانت سے ان واعظین کے حوصلے اور زیادہ ہو گئے اور وہ حق پرست علماء کا نام لے کر مذاق اڑانے لگے۔

ٹھیک ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت لوٹ آئی (لِکُلِّ فِرْعَوْنٍ مُوْسٰی۔ ہر فرعون کے لئے موسیٰ پیدا ہوا ہے) اللہ تعالیٰ نے حضرت حقانی صاحب

کو ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا، حقانی صاحب کی صرف پہلی دو تقریروں نے ان کے تانے بانے بکھیر دیئے۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ (الآیۃ) (آخرکار تیرے رب نے اُن پر عذاب کا کوڑا برسایا) الفجر آیت ۱۳

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ (الآیۃ)

تحریک حقانی کے ثمرات

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا شہر حیدرآباد میں حقانی صاحب کی پہلی تشریف آوری ۱۹۷۳ء کی ہے پھر یہ سلسلہ ۱۹۸۸ء کے آخر تک جاری رہا۔ اس پندرہ سالہ دور میں بعض مرتبہ دس دس یوم اور کبھی پندرہ یوم کے مسلسل خطابات ہوتے رہے ہیں۔ درمیانی مدت میں اس تحریک کی سرپرستی جناب محبوب عالم خان (گولکنڈہ فیکٹری) نے لے لی تھی جس نے اس تحریک کو بام عروج پر پہنچایا۔ شہر حیدرآباد کے ہر وعظ میں دو تا تین لاکھ مسلمانوں کی شرکت ہوا کرتی تھی اور ایک مرتبہ تو شہر کے نمائش گراؤنڈ پر پانچ لاکھ مسلمانوں کا مجمع ہو گیا تھا۔

پولیس انتظامیہ کا کہنا تھا کہ شہر میں ایسے بڑے مذہبی اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے اس کے باوجود نظم و نسق کو کنٹرول کرنے کی ہمیں کبھی بھی ضرورت پیش نہ آئی، نہایت سکون و شائستگی سے مجمع جمع ہوتا اور اسی شان سے واپس بھی ہو جایا کرتا ہے۔ شہر کے معمر مسلمانوں کا کہنا تھا کہ ایسے دینی مجامع ہم نے اپنی پچھلی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے۔

حقانی صاحب کی تحریک کا بنیادی مقصد توحید و سنت کو مسلمانوں میں عام

کرنا اور شرک و بدعات اور جہالت کی رسومات سے مسلمانوں کو بچانا تھا۔
اس سلسلے میں ان کی معرکۃ الآرا تقریریں مسلمانوں کے قلوب کو اللہ کی کتاب عظیم اور اس کے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات سے قریب کر رہی تھیں اور عملی شکل میں اس کے نتائج مرد و خواتین میں یکساں طور پر ظاہر ہو رہے تھے مرد و خواتین میں نمازوں کا اہتمام، خواتین میں پردے کا اہتمام، رسومات اور خرافات سے بیزارگی، قبر پرستی سے دوری، عرس و قوالی سے نفرت نوجوانوں میں اسلامی زندگی اختیار کرنے کا جذبہ، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ مکہ مسجد (شہر میں دورِ قطب شاہی کی وسیع ترین مسجد) کے ایک خطاب میں حقانی صاحب کی اپیل پر کم و بیش دس ہزار نوجوان لڑکوں نے اپنے اپنے نکاح میں جوڑے گھوڑے کی رقم نہ لینے کا عہد کیا تھا، پھر بہت جلد ایسے شرعی نکاحوں کا آغاز بھی ہو گیا۔
اس عظیم تحریک کی مخالفت جہاں خاندانی و روایتی مشائخ کے حلقوں میں شدت سے اُبل پڑی وہاں شہر کے بعض سنجیدہ حضرات بھی متاثر تھے، ایسے ہی ایک موقع پر مجلس تعمیر ملت (شہر میں طلباء کی فلاح و بہبود کی قدیم جماعت) کے ایک ذمہ دار نے راقم الحروف سے حقانی صاحب کی تحریک کے منفی اثرات پر گفتگو کی اور اس کو ایک ناپسندیدہ تحریک قرار دیا۔
میں نے موصوف کی پوری کہانی بغیر کسی مداخلت کے سماعت کی، جب ان کی بات پوری ہو چکی تو میں نے بھی گذارش کی کہ اگر آپ کچھ وضاحت چاہتے ہیں تو آپ کو بھی بغیر کسی مداخلت کے سماعت کرنا ضروری ہوگا۔ موصوف از خود گرفت میں آچکے میں نے کہنا شروع کیا۔
جناب عالی اصولی بات تو یہ ہے کہ ہر تعمیر میں کچھ نہ کچھ تخریبی پہلو ہوا کرتے ہیں

بغیر کچھ توڑ پھوڑ تعمیر مکمل نہیں ہوتی، مسئلہ جہاد کو لیجئے اس میں جہاں قتل و خون، لوٹ مار، غارت گری وغیرہ سب کچھ پیش آتے ہیں لیکن جہاد کے اعلیٰ ترین مقصد کو محض اس تخریبی پہلو کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جاتا یہ اسلئے بھی کہ اس کاروائی کے بغیر اعلاء کلمۃ اللہ ممکن نہیں ہوتا، تو کیا توحید اتنی گئی گذری حقیقت ہے کہ اسکو چند نادانوں اور مفاد پرستوں کے ہجوم کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جائے؟

جب یہ حقیقت ہے تو آپ ہمارے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کیجئے اگر تائید نہ کر سکیں تو اختلاف بھی نہ کیجئے۔ ہماری یہ تحریک تخریبی قسم کی نہیں ہے ہم اسلام کے اساسی رکن توحید الہٰ کو مسلمانوں میں عام کرنا چاہتے ہیں شہر حیدرآباد کے مسلم معاشرے میں معلوم نہیں کس زمانے سے غیر اسلامی نظریات شرک و بدعات، قبر پرستی، مشائخ پرستی نے دین و مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے اگرچہ اس کی اصلاح کے لئے بعض اہل علم نے قدم اٹھایا لیکن یہ انفرادی کوششیں تھیں جو صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ عرصہ دس سال کی مسلسل جد وجہد کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شرک و بدعت کے اس صنم کدے کو ضرب کلیم کی ضرورت ہے، چنانچہ حقانی صاحب کی پہلی ضرب نے اس بت کدے کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا۔ اختلاف و انتشار تو ایک طبعی چیز ہے جس کا کوئی مضائقہ نہیں، یہ نہ ہو تو تعجب ہونا چاہیئے تھا۔

بہر حال اس "ضرب کلیم" سے کم از کم تین نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔

(۱) توحید و شرک، سنت و بدعت جو عرصہ دراز سے مخلوط ہو چکے تھے وہ جدا جدا واضح ہو گئے۔

(۲) اس وضاحت کے بعد اہل توحید، اہل بدعت سے ممتاز ہو گئے۔

(۱۳) نوجوانوں کا وہ طبقہ جو حق و باطل کی تلاش میں حیران و سرگردان تھا توحید و سنت کی روشنی میں ہدایت پاگیا

جناب عالی! یہ تحریک حقانی کے چند واضح نتائج و ثمرات ہیں جنکو تحریک کے مثبت اثرات قرار دیا جاتا ہے۔ بہرحال موصوف نے تحمل سے سنا لیکن کچھ بڑبڑاتے رخصت ہوگئے۔ اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ الْمُشْتَکیٰ

سب سے بڑی رکاوٹ

تحریک حقانی کی مخالفت میں جہاں شہر کا سجادہ نشین طبقہ سرگرم عمل تھا وہاں مقامی صحافت بھی پیش پیش تھی۔

موجودہ زمانے میں کسی بھی تحریک کی زیست و موت کے لئے ذرائع ابلاغ، اخبار و رسائل بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ تحریک حقانی بھی ایک مرحلہ پر اس مکروہ صورت حال سے دو چار ہوگئی، شہر کا مشہور و معروف روزنامہ جو مشائخ دکن کی گرفت میں تھا۔ تحریک حقانی کی کردار کشی میں مخالف عنوانات اور اشتہارات کو جلی سرخیوں سے شائع کر رہا تھا جبکہ حقانی صاحب کے ہر خطاب میں دو دو لاکھ مسلمانوں کے اجتماع کی رپورٹ اسی اخبار کے کسی کونے میں بطور خانہ پُری شائع ہو جاتی تھی۔ بس اخبار کی اس جانبداری کا یہ تکلیف دہ پہلو بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔

دوستوں کے مشورے پر اخبار کے ایڈیٹر (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) سے ملاقات طے پائی۔ دوران گفتگو ایڈیٹر صاحب نے ایک استفسار پر فرمایا کہ میں نے خود حقانی صاحب کی کوئی تقریر سنی نہیں ہے۔ بس یہ سننا ہی تھا کہ ہمارا مسئلہ حل ہوگیا۔ ہم نے کہا تو آپ ایک تقریر سن لیں اس کے بعد جو بھی فیصلہ کریں ہم کو اختلاف نہ ہوگا۔

چنانچہ وقت طے پاچکا اور ہم وقت مقررہ پر" زیبا باغ" موصوف کے شاہی مکان پر پہنچے، نہایت اکرام کا معاملہ کیا، تحریک حقانی کے فعال رکن جناب مولوی قطب الدین صاحب چشتی ، مولانا رضوان القاسمی اور مولانا سید اکبر صاحب اور راقم الحروف نے ایڈیٹر صاحب سے دریافت کیا آپ حقانی صاحب کی کون سی تقریر سننا چاہتے ہیں؟

فرمایا کوئی ایک تقریر سنا دیجئے۔

یہ عجیب وغریب بات تھی، دس پندرہ کیسٹ کے مجموعے سے ایک کیسٹ نکالا گیا اس کا عنوان "وسیلہ" تھا جو حقانی تقاریر میں نہایت معرکۃ الآرا اور اس وقت کے مشائخ کے ہاں نہایت مکروہ اور قابل اعتراض تقریر تھی ہم نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ چلو اس پر حق وباطل کا فیصلہ ہوجائے گا۔

ایڈیٹر صاحب نے اس تقریر کو اندرون خانہ بھی سنانے کا انتظام کر لیا تھا، جب ریکارڈ چلنے لگا رہم اس وقت تاثیر حق کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں) کچھ دیر نہ لگی کہ ایڈیٹر صاحب خشیت الٰہی سے دو زانو بیٹھ گئے پھر اس پر بھی چین نہ آیا تو بے اختیار ٹہلنا شروع کر دیا اور جب حقانی صاحب قرآن پڑھتے تو جھوم جھوم جاتے، مسلسل تین گھنٹے بلا وقفہ سماعت کی، اختتام پر خود کہنے لگے کہ اس تقریر میں کوئی بات بھی قابل اعتراض نہیں ہے ہم نے کہا جناب عالی حقانی تقاریر میں یہی وہ تقریر ہے جو شہر کے مشائخ کے ہاں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ ایڈیٹر صاحب حیران تھے کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔

بہر حال کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

ظہر کی اذان ہو چکی تھی نماز ظہر کے بعد نہایت پرتکلف دسترخوان پر تواضع کر کے رخصت کیا گیا۔ اسطرح آنے والے دنوں میں بڑی حد تک صحافت کی مخالفت

سے حفاظت رہی۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ۔

حادثہ خیر

اہل بدعت کے اس ہجوم میں ایک خصوصی تحریک یہ چلائی گئی کہ جامع مسجد ملّے پلّی کی خطابت سے راقم الحروف کو ہٹایا جائے یہ وہ وقت تھا کہ اس مسجد کا جمعہ والا خطبہ نوجوانوں کے دینی واسلامی فکر میں انقلاب پیدا کر رہا تھا اور شہر کی دیگر مساجد میں حدیث وتفسیر وفقہ کے درس عام ہو رہے تھے۔ شہر کے اہل بدعت نے یہ سلسلہ ختم کرنے کے لئے وہ سب کچھ وسائل اختیار کئے جو انہیں میسر آسکتے تھے لیکن جب انہیں ناکامی ہوئی تو ایک سیاسی ہتھکنڈہ اختیار کیا۔ شہر کے صنعتی علاقے کی مشہور زمانہ فیکٹری آلوین کی مزدور یونین تحریک کے لیڈر کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اب تو یاد نہیں کہ کیا کیا الزامات تراشے گئے تھے اُس مزدور لیڈر نے مسجد کمیٹی کو نوٹس دیا اور عدم تعمیل کی صورت میں جامع مسجد کے گیٹ پر بھوک ہڑتال کا اعلان کردیا چنانچہ جمعہ سے ایک دن پہلے بھوک ہڑتال کیمپ ڈال دیا گیا۔

دوسرے دن جمعہ کا خطبہ تو بہرحال ہونا تھا غیر یقینی اور انتشاری کیفیت میں جمعہ تو ادا ہو گیا لیکن پولیس کی مداخلت کے بعد راقم الحروف سے خطابت کا یہ خیر کثیر چھین لیا گیا۔

دل ودماغ عرصے تک ماؤف سے رہنے لگے غیر شعوری طور پر خطابت سے دل اُچاٹ سا ہو گیا۔ چھ ماہ تک یہی کیفیت رہی۔ چند مخلص احباب نے جمعہ کی خطابت کے لئے مسجد منٹ کا انتخاب کیا یہ مسجد شہر کے مرکزی علاقے میں واقع ہے جہاں حکومت کے کئی ایک مرکزی دفاتر (آفس) واقع ہیں خواہی نخواہی قبول تو کر لیا لیکن دل برداشتہ کیفیت اب بھی واقع تھی، جامع مسجد ملّے پلّی کا خیر کثیر کسی اور جگہ نظر نہ آتا تھا، بہرحال خطابت کا آغاز ہو ہی گیا۔

چند ہفتوں بعد ایک رات خواب آیا کوئی صاحب میری خستہ بستہ حالت دیکھکر دریافت کر رہے ہیں، مولانا کیا حال ہے؟ آپ اُداس اور غمگین کیوں رہنے لگے ہیں؟

میں نے جواب دیا ظالموں نے میری دعوت و تبلیغ کے خیر کثیر کو چھین لیا ہے اب کسی کام میں بھی دل نہیں لگتا۔ یہ سُنکر اُن صاحب نے کہا مولانا اللہ تعالیٰ نے آپ سے جامع مسجد کی خطابت لیکر اُس سے کہیں زیادہ بہتر مقام عنایت کیا ہے، اب تک تو آپ کے خطاب سے دو چار محلّے کے مسلمان استفادہ کر رہے تھے مسجد منٹ اگرچہ چھوٹی مسجد ہے لیکن شہر کے تمام محلوں کے مسلمان ملازم یہاں جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ حکومت کے سارے مرکزی دفاتر اور ادارے مسجد کے اطراف میں واقع ہیں، اس طرح آپ کی دعوت و تبلیغ کا حلقہ پورا شہر قرار پاتا ہے گویا آپ اپنا ہفتہ وار پیام پورے شہر میں دے رہے ہیں۔

اس کے بعد نیند سے بیدار ہوگئی قلب میں انشراح محسوس کیا اور اطمینان کی کیفیت لوٹ آئی، یہ خواب، خواب و خیال کی طرح نہ تھا، ایک پُر حقیقت بشارت تھی جس نے اُس گہری خلش کو کافور کر دیا جو عرصۂ چھ آٹھ ماہ سے دل و دماغ کو پریشان کر رہی تھی، بحمداللہ اس خواب کے بعد دعوت و تبلیغ کا میدان وسیع تر ہو گیا۔ پھر وہ نتائج ظاہر ہوئے جو حقانی تحریک میں اہل شہر نے دیکھے ہیں۔

تَوبَۃً نَصُوحًا

جامع مسجد کی خطابت سے علیحدگی پر دو ہفتے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک صبح وہ مزدور لیڈر اچانک میرے گھر آیا اور ہندو تہذیب کے مطابق دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے جُھک گیا اور میرے قدموں کو چھو کر آشیرباد (معافی و دُعا) چاہی، میں اس ناجنس عمل پر حیران تھا کہ

یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟ میرے استفسار پر کہنے لگا میں ایک گنہگار مسلمان ہوں میں نے زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا ہے، مجھ سے ایک بہت بڑا پاپ (گناہ) ہوگیا ہے میں نے دین کے ایک بہت بڑے کام کو روک دیا ہے میں جہاں بھی جاتا ہوں لوگ پوچھتے ہیں محمد حسین تم نے یہ کیا حرکت کی ہے؟ کتنا بڑا گناہ کر دیا۔ مولوی صاحب! میں نے آپ کو جانا نہیں مجھے توبہ کرا دیجئے، یہ کہکر زار و قطار رونے لگا، مجھکو اُسکی نادانی اور احساس گناہ پر عبرت ملی کہ بے دین بدعتیوں نے اپنے مفاد کے لئے ایک بھولے بھالے مسلمان سے ایک ایسا کام کروالیا جو کافر و مشرک سے بھی پورا نہ ہو سکے، میں نے اسکا تعارف حاصل کیا، عجیب بات تھی کہ وہ مسجد ہی کا پڑوسی تھا، مبارک راتوں میں مسجد آیا کرتا تھا وبس۔ میرے دریافت کرنے پر کہا کہ اُس نے میرا وعظ کبھی نہیں سنا ہے اور نہ کسی درس میں شریک رہا ہے، صرف محلہ کے چند لوگوں نے یہ باور کروادیا کہ جامع مسجد کا خطیب وہابی بدعقیدہ ہے، عام مسلمان اس سے بیزار ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس منافقانہ حکایت وشکایت پر میں نے بھوک ہڑتال کا فیصلہ کرلیا پولیس نے مداخلت کی اور مسجد کمیٹی سے علیحدگی کا فیصلہ لے لیا، مولوی صاحب دین کے بہت بڑے کام کو میں نے ختم کردیا میں توبہ کرنے آیا ہوں۔

اس کی ندامت وصداقت پر مجھے یقین آیا، قریب کی مسجد (مسجد عبدالرزاق ترپ بازار) لے گیا دو رکعت نماز پڑھا کر توبہ کروادی، دوسرے دن محمد حسین نے جامع مسجد کے سامنے والے گراؤنڈ پر جلسہ عام منعقد کرکے کثیر مجمع کی موجودگی میں اپنی برأت کا اعلان کیا اور راقم الحروف کو اسی جلسہ عام میں نقد نذرانہ بھی پیش کیا جسکو میں نے مال غنیمت کے طور پر قبول کرلیا۔

نہ کھلتے رازِ سربستہ

شرک و بدعت کا اختلاف عقلِ سلیم یا دلیل شرعی پر قائم نہیں ہوتا، یہ مسئلہ صرف اور صرف جذباتی اور نفسانی قسم کا ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ عبادت اس طرح کی جائے، محبت کا تقاضا اسطرح پورا کیا جائے، ادب واحترام کے لوازم اسطرح ادا ہوں جس کام سے نفس انسانی کو سیرابی ہو اس کی تکمیل کی جائے اور یہ سب کچھ دین و مذہب کے لبادے میں ہوا کرتا ہے۔

بقول شخصے آنکھوں پر ہری عینک لگا دی جائے تاکہ ہر چیز سبز نظر آنے لگے، یہی شرک و بدعت کا مزاج ہوا کرتا ہے، قرآن و حدیث، قانون شریعت حدود الٰہی، نظر و فکر، حجت و دلیل سے اس نظریئے کو سروکار نہیں کیونکہ یہ سب امور بدعتی انسان کو حدود شریعت میں مقید کر دیتے ہیں اور وہ اس سے فرار چاہتا ہے۔

علماء اہل سنت والجماعت کی ہر زمانے میں یہ روش رہی ہے کہ وہ توحید الٰہ اور سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مرکزیت پر خود بھی قائم رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دیتے ہیں اس لئے ان کی تبلیغی جدوجہد میں تعمیل و تعمیر کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔ یہ حضرات توحید و سنت کے منفی پہلو (شرک و بدعت) پر جب ہی توجہ دیتے ہیں جب کوئی توحید و سنت سے متصادم ہوا کرتا ہے۔

اہل حق کی اس پاکیزہ روش کے مطابق شہر حیدرآباد میں ایک ایسا بھی وقت آیا کہ وہ شرک و بدعت کی بیخ کنی کے لئے زبان و قلم کو متحرک کریں چنانچہ اسوقت یہاں جہاں تقریری تحریک چلائی گئی وہاں تحریری جہاد بھی کیا گیا اور بدعت اور اہل بدعت کی گمراہیوں اور ان کے کارناموں کی تفصیلات عام کی گئیں ۱۹۷۴ء

تا ۱۹۷۷ء کے مقامی جرائد میں یہ تفصیلات ملیں گی۔
اسی ضمن میں راقم الحروف نے ایک مختصر کتابچہ "اظہارِ حقیقت"[1] کے نام سے شائع کیا تھا جس میں بریلوی عقائد اور ان کی تکفیری مہم (مسلمانوں کو کافر قرار دینے کی تحریک) کا سیاہ کارنامہ انہی کی کتابوں سے نقل کیا گیا تھا یہ کتابچہ شہر میں خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبول ہوا اور بریلوی فتنے سے عوام کو آگاہی ملی۔ خاص طور پر بریلیوں کے سرخیل اور ان کے مرشد عام احمد رضا خان کی ایک خاص اور اہم وصیت جسکو انہوں نے اپنی موت سے دو گھنٹے پہلے ناوہ بجکر اکیس منٹ پر بہوش وحواس خود اپنے ہی قلم سے لکھی تھی من وعن شائع کی گئی اس وصیت نے خود بریلوی مسلک کی مٹی پلید کردی، خان صاحب اس وصیت میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے گذارش کرتے ہیں کہ وفات کے بعد خوش دلی اور فراخدلی سے ہفتہ میں دو چار مرتبہ میری فاتحہ میں مذکورہ چٹخارے بھیج دیا کریں۔

وصیت نامہ

"اعزہ اگر بطیب خاطر ممکن ہو سکے تو فاتحہ میں ہفتے میں دو یا تین بار ان اشیاء میں سے کچھ بھیج دیا کریں۔
(۱) دودھ کا برف خانہ ساز اگرچہ بھینس کے دودھ کا ہو۔
(۲) مرغ بریانی۔

---

[1] وقتی مصلحت کے پیش نظر یہ کتابچہ ہمارے بزرگ دوست مولانا سید شریف حسین صاحب ترمذی کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ منہ،

(۳) مرغ پلاؤ خواہ بکری کا۔
(۴) شامی کباب، (۵) پراٹھے (۶) بالائی (۷) فیرنی
(۸) اُرد کی پھریری دال مع ادرک و لوازم
(۹) گوشت بھری کچوریاں (۱۰) سیب کا پانی
(۱۱) انار کا پانی (۱۲) دودھ کا برف
(۱۳) سوڈے کی بوتل۔

وصایا شریف (احمد رضا خان)
وصیت نمبر (۱۲۰) بقلم خود بحالت صحت و حواس
۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ بارہ بجکر ۲۱ منٹ

تبصرہ:۔
خان صاحب کی اس وصیت کو نقل کرکے مولانا عامر عثمانی ایڈیٹر ماہنامہ "تجلّی" نے یہ پُر مغز تبصرہ کیا ہے:۔

"ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسی وصیت کو کسی انصاف پسند جج کے سامنے رکھدیا جائے تو وہ سوائے اس کے اور کوئی فیصلہ نہ دے گا کہ بریلوی مذہب "پیٹ پوجا" کا دوسرا نام ہے"۔ لہ

بہرحال پہلے اس کتابچہ "اظہارِ حقیقت" نے بریلوی واعظین کے منہ میں

لہ اہل بدعت کا یہ عقیدہ ہے کہ میت کو جو چیزیں زندگی میں محبوب تھیں اگر وہ چیزیں فاتحہ میں روانہ کی جائیں تو بعینہٖ وہی چیزیں اُسکو قبر میں ملا کرتی ہیں۔
خان صاحب مرنے چکھ رہے ہونگے۔

لگام کا کام دیا اور وہ کچھ محتاط سے ہو گئے۔

فیضانِ قبور عام مسلمانوں کے لیئے فیضانِ قبور کا عنوان اگرچہ غیر معروف اور نا قابلِ فہم ہے لیکن خاندانی ورِوایتی مشائخ کے ہاں یہ ایک رازِ سربستہ اور "روحِ سلسلہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان نادانوں کا خیال ہے کہ اولیاءاللہ اپنی وفات کے بعد قبر والی زندگی میں اپنی طبعی حیثیت سے لاکھوں درجہ قوت اور اختیار کے حامل ہو جاتے ہیں اور پھر اپنے مریدوں اور معتقدوں کو وہ سب کچھ دیتے دلاتے ہیں جو اُن کو اپنی دنیاوی زندگی میں میسر نہ تھا۔ فیضانِ قبور اسی خام خیالی کا نام ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

حقانی صاحب کی تقاریر میں ایک معرکۃ الآرا تقریر کا عنوان "وسیلہ" تھا یہ تقریر وسطِ شہر کے نمائش گراؤنڈ پر کم و بیش پانچ لاکھ مسلمانوں کے مجمع میں ہوئی اس تقریر نے مشائخ پرستی اور قبر پرستی کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں۔

دوسرے دن مشائخ کی خانقاہوں اور ان کے حلقوں میں واویلا واویلا کا شور مچ گیا تھا تاریخ دکن میں پہلی مرتبہ شہر کے سارے مشائخ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے جبکہ ہر ایک کی مسند جدا جدا تھی، شہر کے ایک نامی گرامی نورالمشائخ نے اس جمعیت کی صدارت قبول کی اور اولیاءاللہ کے وسیلہ کے بارے میں تحریری و تقریری مہم کا آغاز کیا۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں لکھا گیا شہر کا مشہور و معروف اُردو روزنامہ ایسے مریض مضامین کے لئے وقف ہو چکا تھا، انہی ایام میں راقم الحروف کا اخبار کے آفس جانا ہوا۔ ایڈیٹر صاحب اور ان کے عملہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مسلمانوں کی موجودہ انتشاری صورت حال پر تبادلۂ خیال کیا میں نہ اس کے لیئے تیار تھا اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی ایسا موقع پیش آیا تھا۔ ایڈیٹر صاحب

کی آخری گفتگو فیضانِ قبور سے متعلق تھی اور اُن کا شدید اصرار تھا کہ اس کا انکار کرنا ہٹ دھرمی اور جہالت ہے جبکہ علماء دیوبند بھی اس کے مخالف نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ایڈیٹر صاحب کی تفصیلی گفتگو بغیر کسی مداخلت کے سماعت کی اور بات سمجھنے کی بھی کوشش کی۔ اس درمیان اخبار کے آفس کا عملہ بھی جمع ہو گیا تھا۔ جب بات ختم ہو گئی تو میں نے بہت ہی اختصار پسندی سے کام لیا مسئلہ گھنے جنگل کی طرح پیچ دار تھا اس سے دور رہنا ہی مناسب معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی۔ میں نے ایڈیٹر صاحب سے بلا تمہید و تبصرہ کہنا شروع کیا:

جنابِ عالی!

آپ کی بات سمجھنے کی میں نے پوری کوشش کی ہے، آپ فیضانِ قبور کو ایک مسئلہ حقیقت قرار دے رہے ہیں لیکن فیضانِ قبور کیا ہوتا ہے میری سمجھ میں نہیں آیا براہ کرم اس کی وضاحت کر دیں تاکہ میں کچھ جواب دے سکوں؟

ایڈیٹر صاحب نے پہلے تو حیرت و استعجاب کا اظہار کیا کہنے لگے فیضانِ قبور سے قبر شریف کا فیض مراد ہے جو زیارت کرنے والے کو ملتا ہے۔

میں نے عرض کیا مسئلہ اب بھی غیر واضح ہے، قبر کا فیض کیا ہوتا ہے؟ اور اسکی کیا صورت ہوتی ہے؟

کہنے لگے آپ سمجھنے کی کوشش کریں فیض ایک عام لفظ ہے جسکو ہر مسلمان سمجھتا ہے ہر قسم کا فیض مراد ہے۔

تیسری بار پھر میں نے یہی سوال دہرایا اور عرض کیا جناب میں فیض ہی کو تو سمجھنا چاہتا ہوں اور آپ فیض کا جواب فیض ہی سے دے رہے ہیں، میرا سوال تو اب بھی باقی ہے۔

ایڈیٹر صاحب اس موقع پر پیچ و تاب کھا کر پھر اپنی سابقہ تقریر دہرانے لگے، حاضرین میں سے ایک صاحب نے مداخلت کی اور وہ کچھ کہنا چاہتے تھے میں نے معذرت کے ساتھ گذارش کی کہ میری گفتگو تو صرف ایڈیٹر صاحب سے ہے براہ کرم آپ مداخلت نہ فرمائیں۔ اس کے بعد ایڈیٹر صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی اور علماء دیوبند کے حوالے نقل کرنے لگے کہ فلاں مولانا اس کے قائل تھے، فلاں اس کی تائید کرتے ہیں اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے موصوف کی کسی اور بات پر توجہ نہ دی صرف فیض و فیضان کا مفہوم سننا چاہتا تھا۔ اور یہی موضوع سخن بھی تھا خواہ مخواہ اِدھر اُدھر اُلجھ کر اپنے مقصود سے ہٹ جانا مسئلہ کا حل نہ تھا۔

علم مناظرہ کے ہمارے استاذ مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوری نے مناظرہ کی عملی تربیت میں یہ نکتہ خاص طور پر ذہن نشین کروایا تھا کہ کسی بھی بحث و مباحثہ میں موضوع سخن کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ کامیاب مناظر کی یہی علامت ہے کہ وہ بحث و مباحثہ میں بار بار اپنے مقصد کی طرف لوٹ آتا ہے آخر کار کامیابی اُسی کا نصیب بن جاتی ہے۔

میں نے ایڈیٹر صاحب کی بے بسی شدت سے محسوس کی کہ وہ فیض و فیضان کی وضاحت کرنے میں بے بس ہو رہے ہیں، مداخلت کرتے ہوئے اس طرح مخاطب ہوا:

جناب عالی! آپ اگر اجازت دیں تو فیض و فیضان کی میں ہی وضاحت کر دوں؟ پھر آپ اُس کو متعین کر دیں کہ فیض سے مراد یہ صورت ہے موصوف نے اتفاق کر لیا۔ میں نے کہا کہ فیضان قبور کی ایک وضاحت تو یہ ہے کہ:

اہل قبور کی زیارت سے بے اولاد کو اولاد ملتی ہے. محروم رزق رزق پاتا ہے، نابینا کو بینائی ملتی ہے، کاروبار میں برکت ہوتی ہے، دنیا کی خوشحالی نصیب ہوتی ہے، بلاؤں اور امراض سے نجات ملتی ہے، مقدمات کا موافق فیصلہ ہوتا ہے، بے نکاحوں کے نکاح ہوجاتے ہیں، قرضداروں کے قرض بھی ادا ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد میں نے سوال کیا جناب عالی! فیضان قبور سے کیا یہ مقاصد مراد ہیں؟ ایڈیٹر اور حاضرین پر دو چار سیکنڈ سکتہ سا طاری ہوگیا پھر کہنے لگے ٹھیک ہے فیضانِ قبور کی دوسری وضاحت کیا ہے؟

میں نے ان کی شکست کو مزید نیچا کرنے کیلئے فوری کہنا شروع کیا:

فیضانِ قبور کی دوسری وضاحت یہ ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے سے آخرت یاد آتی ہے، اللہ کا خوف پیدا ہوتا ہے، اپنی بھی موت یاد آتی ہے۔ دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ سامنے آتا ہے، گناہوں سے اجتناب پیدا ہوتا ہے نیکیوں کی جانب ترغیب ہوتی ہے، دل نرم ہوجاتے ہیں آدمی کی بھول و غفلت پر ضرب پڑتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

فرمائیے، فیضانِ قبور سے کیا یہ امور مراد ہیں؟

میرے اس سوال پر ایڈیٹر صاحب کے علاوہ سارے حاضرین گومگو کی حالت میں آگئے. بہرحال میرا سوال تو ایڈیٹر صاحب سے تھا موصوف فرمانے لگے مولانا فیضان کی وضاحت میں اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے. فیض عام ہے ہر قسم کو حاصل ہے آپ مسئلہ کو خواہ مخواہ الجھا رہے ہیں۔ ؎

؎ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ایڈیٹر صاحب بے دست و پا ہوگئے تھے (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

میں نے کہا ایڈیٹر صاحب میں نے تو آپ کی ترجمانی میں یہ وضاحت کی ہے تاکہ آپ جواب دے سکیں، میرا سوال تو اب بھی یہی ہے کہ فیض وفیضان سے کیا مراد ہے؟ وقت طویل ہو چکا تھا جواب کی کوئی صورت بن نہ پڑی میں نے مناسب سمجھا کہ اب ان سب کو منزل تک پہنچا دینا چاہیئے تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے اور ایڈیٹر صاحب اس دلدل سے نکل پڑیں۔

اس کے بعد ایڈیٹر صاحب سے پھر اجازت لی جناب عالی آپ مناسب سمجھیں تو آپ کا جواب میں خود دوں؟ انہیں اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا، سر کے اشارے سے ہاں کر لی۔

میں نے کہا فیضان قبور سے اگر پہلی وضاحت مراد ہو تو اس کا اسلام میں کوئی بھی قائل نہیں ہے، چہ جائیکہ علماء دیوبند قائل ہوں، یہ عقیدہ پوری ملت اسلامیہ میں شرک سمجھا جاتا ہے۔ وہ جاہلی مذاہب تھے جن کا یہ جاہلی عقیدہ تھا پھر وہ قبر پرستی میں مبتلا ہو گئے، ضَلُّوا فَاَضَلُّوْا۔

اور اگر فیضان قبور سے دوسری وضاحت مراد ہو تو اس میں کسی بھی عالم کا اختلاف نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کا یہی فائدہ (فیض) بیان کیا ہے، علماء دیوبند بھی قبروں کے اسی فیض کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

فیضان قبور سے اگر پہلی وضاحت مراد لیتے تو دوسرے تو کیا ان کے اپنے ساتھی اس کو تسلیم نہ کرتے، اور اگر دوسری صورت مراد لیتے تو فیضانِ قبور کی عمارت ہی ڈھیر ہو جاتی، اور اونچی اونچی پختہ قبریں، بلند و بالا گنبدیں زیر زمین آجاتیں

نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن

قائل ہیں اور جناب میرا بھی یہی عقیدہ ہے۔ غالباً بات اب پوری طرح سمجھ میں آگئی ہو؟ بس سب خاموش تھے۔

مخاطب کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ حاضرین کے چہرے مہرے سے واضح ہو رہا تھا کہ انہوں نے حقیقت پالی تھی ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔

گفتگو کے آخری مرحلے میں شہر کے ایک ممتاز عالم حافظ ابو یوسف صاحب ایم ایل سی آگئے بس محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ موصوف نے خلاصہ کلام کے طور پر میری وضاحت کو سماعت کیا پھر ضمیمۂ کلام کے طور پر دیوبند اور علماء دیوبند اور ان کی دینی وسیاسی خدمات کا ایسا شاندار تذکرہ فرمایا جس کو میں نے بھی پہلی بار سنا۔

بہرحال ہماری گفتگو تو ختم ہوگئی ہم تو سلام و مصافحہ کرکے رخصت ہوگئے معلوم نہیں مجلس کا سلسلہ کب تک جاری رہا، حق کے متلاشیوں کے لئے اللہ کی حجت و برہان ہر دور میں پوری ہوا کرتی ہے۔ فیضان قبور کے بارے میں اہل بدعت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں لیکن بقول حافظ ابو یوسف صاحب فیضانِ قبور پر ایسا مختصر اور جامع ترین تبصرہ نہ پڑھا گیا نہ سنا گیا فَلَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّيْ۔

اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تائید و نصرت کے لئے کسی کے محتاج نہیں ہیں وہ طَيْرًا اَبَابِيْلَ سے ہاتھیوں کے لشکر کو بھوسہ کردیں، مکھی و مچھر سے فرعونی لشکر کو پریشان کردیں، یا ایک ہزار مسلح جنگجوؤں کو نہتے ہاتھوں سے شکست دیدیں۔ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ

زلزلہ شہر میں فیضان قبور کی تحریری و تقریری مہم کے دوران بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے بیرونی واعظین کو کثرت سے

طلب کیا جانے لگا اور اشتہار بازی کی گرم بازاری شروع ہوگئی۔ جواب، جواب الجواب کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا انہی ایام میں اچانک زلزلہ ٹوٹ پڑا جس نے شہر میں ہیجانی کیفیت پیدا کردی اور ہر طبقے میں انتشار سا پیدا ہوگیا یہ کوئی زمینی زلزلہ نہ تھا یہ ایک کتاب کا نام تھا جس کے مؤلف اہل بدعت کے سرخیل ارشد القادری (مقیم لندن) تھے انہوں نے نہایت چابکدستی سے پرفریب عنوان کے تحت یہ کتاب مرتب کی اور اسکو شہر حیدرآباد میں پھیلا دیا۔ مؤلف کے زعم میں یہ ایک بروقت کاروائی نہیں بلکہ ایک کاری ضرب تھی،

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (الآیۃ)

کتاب کا خلاصہ یہ تھا کہ اولیاء اللہ کی کرامات اور اُن کے تصرفات جہاں اُن کی حیات میں جاری و ساری رہتے ہیں اور جن کا اہل سنت کو اعتراف ہے لیسے ہی اُن کی وفات کے بعد بھی ان کی کرامات اُس سے کہیں زائد جاری رہا کرتی ہیں وہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو وہ سب کچھ دیتے دلاتے ہیں جو اپنی حیات میں انہیں میسّر نہ تھا۔

کتاب کا روئے سخن علماء دیوبند کی جانب تھا اس لئے مؤلف نے علماء دیوبند کے بزرگوں کے وہ واقعات و تصرفات مع حوالہ کتاب اور صفحہ نمبر اپنی کتاب زلزلہ میں نقل کردیئے جن میں ان بزرگوں سے وفات کے بعد کشف و کرامات کا ظہور ہوا ہے پھر نہایت جرأت و بے باکی سے علماء دیوبند پر اعتراض کیا کہ اگر آپ کے بزرگوں سے وفات کے بعد کرامات اور تصرفات کا ظہور ہوا کرتا ہے تو وہ توحید و سنت کے عین مطابق ہیں۔ اور اگر یہی واقعات و کرامات ہمارے بریلوی بزرگوں سے وفات کے بعد جاری ہوں تو وہ شرک و بدعت قرار پاتے ہیں آخر یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے ؟

علماءِ دیوبند کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ ساری کتاب میں یہی طرز اختیار کیا گیا ہے۔

مسئلہ کوئی نیا نہ تھا جسکو ثابت کرنے کے لئے ارشد القادری صاحب کو کتاب لکھنی پڑی ہو لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا ہے اُن دنوں شہر میں فیضانِ قبور کی بحث عام ہوچکی تھی اس ہنگامی صورت حال سے کتاب کی اشاعت کو تقویت ملی، تاہم یہ تقویت بھی کچھ زیادہ اہم نہ تھی اگر ماہنامہ تجلّی کے ایڈیٹر مولانا عامرؔ عثمانی صاحب اس کتاب کی تائید میں تبصرہ نہ فرماتے۔ عامر عثمانی صاحب کے تبصرے نے ارشد القادری صاحب کی کتاب کو چار چاند لگا دیئے، مولوی ارشد القادری نے اس مالِ غنیمت سے فائدہ اٹھایا اور اندرون ایک ماہ اپنی کتاب کا دوسرا ایڈیشن دس ہزار تعداد میں مولانا عامر عثمانی کے تائیدی تبصرے کو دیباچہ کتاب بناکر شائع کردیا۔

بدعتی حلقوں میں ویسے بھی یہ کتاب حلوے مانڈے کی طرح تبرک بنی ہوئی تھی لیکن مولانا عامر عثمانی کے تائیدی تبصرے کے بعد علمی حلقوں میں موضوع بحث بن گئی۔ جواب، جواب الجواب کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی ارشد القادری نے اپنی کتاب میں قلمی فنکاری

لے مولانا عامر عثمانی فاضل دیوبند، کہنہ مشق صحافی، ادیب و شاعر اور سخنہ نقّاد اور عظیم تبصرہ نگار عالم ہیں ساری زندگی شرک و بدعت کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہے ہیں۔ ان کا ماہنامہ تجلّی (دیوبند) شرک و بدعت کے مریض عنوانات کے لئے تریاق ثابت ہوا کرتا تھا قبر پرستی اور شرک و بدعت کے لئے ہر ماہ "شہاب ثاقب" بن کر برس پڑتا تھا۔
اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ

کو جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ فریب نظر کا جادو تھا، عنوان ایسا سریع الفہم اور زود ہضم کہ عام آدمی پہلی ہی نظر میں متاثر ہو جائے، عام آدمی کی فہم تو بہرحال عام ہی ہوا کرتی ہے اگر یہ متاثر ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں لیکن قرطاس وقلم کے شہسوار بھی ٹھوکر کھا جائیں، یہ عجوبہ نہ سہی نادر بات ضرور ہے کچھ ایسی ہی ٹھوکر مولانا عامر عثمانی کو لگی اور وہ "زلزلہ" کی تائید میں اتنی دور نکل گئے کہ اپنی منزل یاد نہ رہی۔

تبصرہ بر زلزلہ

مولانا عامر عثمانی کے تبصرے کا خلاصہ یہ تھا:۔

مولوی ارشد القادری نے اپنی کتاب "زلزلہ" میں علماءِ دیوبند کی جن جن کتابوں کا صفحہ نمبر دیا ہے وہ بعینہ وہی ہے جسکو علماءِ دیوبند نے لکھا ہے ان کتابوں کے واقعات پر ارشد القادری صاحب کے اعتراضات ایسے قوی اور شدید ہیں کہ سارے علماء دیوبند قیامت تک ان کے جوابات دینے سے عاجز و بے بس رہیں گے۔ (تجلی ڈاک نمبر دسمبر ۱۹۷۲ء)

مولانا عامر عثمانی اس کو اپنی شکست نہیں دیوبند کی شکست قرار دے رہے تھے اور پھر دو قدم آگے بڑھکر یہ بھی فتویٰ داغ دیا کہ علماء دیوبند کی ایسی ساری کتابیں[1] سر بازار آگ میں جھونک دی جائیں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی عامر عثمانی کا یہ فیصلہ جہاں مخالف کیمپ میں جشن چراغاں ثابت ہوا وہاں علمی و دینی

---

[1] کیونکہ ان کتابوں میں دیوبند کے بزرگوں کی وفات کے بعد کشف و کرامات کا تذکرہ ملتا ہے۔ (اشرف السوانح۔ انفاس قدسیہ۔ تذکرۃ الرشید۔ سوانح قاسمی۔ ارواح قدسیہ)

حلقوں سے قرطاس وقلم کے شرارے پھوٹ پڑے، بقول عامر عثمانی صاحب ہر روز سینکڑوں خطوط آنے لگے، آخر مجھ کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ جوابات کا انتظار نہ کیا جائے جو بات حق تھی وہ لکھ دی گئی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

ع وفا بھی کی تو ظالم نے جفا کی

کتاب زلزلہ کی اشاعت تو بہر حال دوچند ہو ہی گئی لیکن پہلی بار اہل بدعت کے حلقوں میں تجلّی دیوبند اسطرح پڑھا جانے لگا گویا یہ ان کا اپنا رسالہ ہے۔ ایسے وقت مولانا عامر عثمانی کو ہندوپاک کے اکابر نے بھی متنبہ کیا اور دینی مدارس کے اہل علم وقلم نے بھی توجہ دلائی۔ توقع یہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے لیکن اُن کا دوسرا شمارہ "تجلّی" نے ایسی ساری توقعات کو خاک آلود کردیا، اُنہوں نے پوری قوت سے اپنے اختیار کردہ موقف کو پھر دہرایا اور نقد وتبصرہ کرنے والوں کی زبانیں بند کردیں۔ اَن پڑھ کو پڑھانا سمجھانا آسان ہے پڑھے لکھے جن کو کون سمجھائے۔

زلزلہ در زلزلہ تاہم اہل علم نے تعاقب جاری رکھا، ہدایت نصیبی تو اللہ کا اختیار ہے افہام وتفہیم تو بہر حال کرنی ہی ہے ایک کرم فرما نے پوری کتاب زلزلہ کا رَدّ لکھا اور ہر ہر الزام — کے جواب دینے کی پوری پوری کوشش کی، کتاب کا نام "زلزلہ در زلزلہ" رکھا۔

دوسری جانب سے اس کا جواب الجواب شائع ہوا اور اس کا نام انہوں نے "زلزلہ در زلزلہ در زلزلہ" رکھا۔ چھوٹے موٹے زلزلے تو اس کے علاوہ تھے لیکن یہ سارے زلازل صدا بصحرا ثابت ہوئے۔

زلزلہ در جامعہ انہی ایام میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد جہاں راقم الحروف کی تدریسی خدمات جاری تھیں "زلزلہ" کے جھٹکے محسوس کئے

جارہے تھے اور عام طور پر اس کو چودھویں صدی ہجری میں اللہ کی حجت اور برہان سمجھا جارہا تھا لیکن یہ خیالات شخصی طور پر آپس میں جاری وساری تھے، اساتذہ جامعہ سے تبادلہ خیال کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی۔ شاید بلکہ یقیناً اس کیلئے عنداللہ وقت مقرر ہوچکا تھا۔

بہرحال نظامیہ کے اوقاتِ تدریس میں نماز ظہر کے لئے ایک گھنٹہ وقفہ ملا کرتا تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد کچھ دیر کے لئے سب اساتذہ شیخ الجامعہ کے کمرے میں جمع ہوجایا کرتے تھے، چائے نوشی کا سلسلہ رہتا اس کے بعد اپنی اپنی خدمات میں مشغول ہوجاتے، ایسے ہی ایک دن حسب معمول چائے نوشی کا سلسلہ تھا۔ اساتذہ جامعہ میں میرے ایک مخلص دوست نے جن کو میں بے تکلفی میں "نادان دوست" کہا کرتا تھا کتاب "زلزلہ" کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ موصوف خوب جانتے تھے کہ میں ذہنی وفکری طور پر زلزلہ اور صاحب زلزلہ دونوں سے اختلاف رکھتا ہوں اس کے باوجود اس مجلس میں بحث کا آغاز کردیا پھر کیا تھا ہر ایک کی زبان سے کتاب کی تعریف وتوصیف میں پھول جھڑنے لگے۔

مزید برآں مولانا عامر عثمانی فاضل دیوبند کا تبصرہ بڑے فخر ومباہات سے پڑھا گیا اور کہا جانے لگا

اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَآءُ

سب کے چہرے تو ایک دوسرے کی طرف تھے لیکن سارے قلوب میری جانب متوجہ تھے کہ دیکھو یہ کچھ کہتا بھی ہے یا انجان ہوجاتا ہے؟

جب سب کے تبصرے ختم ہوچکے ہمارے وہ نادان دوست پھر نادانی کر بیٹھے اور کہنے لگے مولوی عبدالرحمن صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ نے کتاب زلزلہ پڑھی بھی ہے؟

دلائل اور شواہد کا کیسا کچھ وزن ہے ؟ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ
سوال کا نہ اندیشہ تھا اور نہ جواب کے لئے میں تیار تھا، اس غیر متوقع سوال
پر سینہ تنگ ہو گیا۔ چند سیکنڈ تو یہ بھی فیصلہ نہ کر پایا کہ جواب دینا چاہئیے یا نہیں
پھر اچانک اللہ کی مدد آگئی جو ایسے نازک موقعوں پر مظلوموں کیساتھ ہوا کرتی
ہے۔ پانچ دس سیکنڈ بھی گزرنے نہ پائے تھے، تائیدِ الٰہی سے سینہ کشادہ ہو گیا
موقع محل کی رو رعایت کئے بغیر بے تکلف زبان سے نکلا۔

" مولوی . . . صاحب کتاب تو میں نے پوری پڑھی ہے البتہ اسکی
تالیف میں ارشد القادری صاحب کو دھوکہ لگا ہے یا وہ دوسروں کو دھوکہ دے
رہے ہیں" یہ میرے جواب کا آغاز تھا جو مخالف ماحول میں دھماکہ کی طرح
پھٹ پڑا۔ تبصرہ مجمل ضرور تھا لیکن زبان کشی کے لئے کافی تھا پھر معًا کہنا
شروع کر دیا۔

مولوی . . . صاحب جہاں تک میں نے ارشد القادری صاحب کے
مقصد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی وفات
کے بعد ان کی کرامات و تصرفات کا ثبوت جیسا بریلوی مسلک میں ثابت ہے
ایسے ہی علماء دیوبند کی کتابوں میں بھی ان کا ثبوت ملتا ہے لیکن ارشد
القادری کا اعتراض یہ ہے جب ہم اپنے بزرگوں کی وفات کے بعد والی
کرامات و تصرفات کو بیان کرتے ہیں تو علماءِ دیوبند اُس کو کفر و شرک قرار دیتے
ہیں اور یہی کشف و کرامات اگر دیوبند کے بزرگوں سے جاری ہوں تو وہ کفر و
شرک تو کجا توحید و سنت کے عین مطابق ہوتے ہیں (پوری کتاب "زلزلہ" کا
یہی خلاصہ تھا) ارشد القادری صاحب نے چونکہ علماء دیوبند کی مستند کتابوں
سے ایسے واقعات نقل کئے ہیں اس لئے عام آدمی تو کیا عامر عثمانی فاضل دیوبند

جیسا کہنہ مشق تبصرہ نگار بھی متاثر ہو گیا۔ اور پھر اُس نے ماہنامہ تجلی میں اپنا تبصرہ بھی شائع کر دیا۔

بہرحال ہر ایک کی نظر و فکر اسکی اپنی بساطِ عقل کے مطابق ہوا کرتی ہے یہ ان کا اپنا ذاتی خیال ہے۔ مولوی صاحب میں نے جو یہ کہا کہ علماء دیوبند پر الزام دینے میں ارشد القادری صاحب کو دھوکہ لگا یا وہ دوسروں کو دھوکہ دے رہے ہیں، براہ کرم اگر آپ درمیان میں کسی بھی قسم کی مداخلت نہ کریں تو میں تفصیل عرض کروں گا ورنہ میری بات پوری ہو چکی ہے۔ حاضرین میں ایک اُستاذ نے خواہش ظاہر کی پھر میں نے بطور تمہید چند امور کا اعادہ کیا تاکہ "زلزلہ" کا فریب ظاہر ہو جائے۔

(۱) جیسے علماء دیوبند کا مسلک حنفی ہے۔ علماء بریلوی کا مسلک بھی حنفی ہے۔
(۲) اور جیسے علماء دیوبند تصوّف کے قائل ہیں علماء بریلوی بھی قائل ہیں۔
(۳) اور جیسے ان کے ہاں خانقاہی نظام جاری ہے وہاں بھی موجود ہے۔
(۴) اور جہاں خانقاہی سلسلہ ہوا کرتا ہے وہاں الہام، کشف وکرامات وغیرہ بکثرت ہوا کرتے ہیں
(۵) ان کشف وکرامات کا نہ دیوبند میں انکار کیا جاتا ہے نہ بریلی میں۔

اس لحاظ سے ہر دو فریق کے ہاں کشف وکرامات والہام کا بکثرت تذکرہ پایا جاتا ہے مسئلہ یہ نہیں ہے اصل بحث یہ ہے کہ کیا کشف وکرامات سے کوئی شرعی مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے جبکہ کشف وکرامات ہر دو فریق کے ہاں مسلّم اور حق ہیں۔

علماء بریلوی کہتے ہیں کہ کشف وکرامات سے مسئلہ شرعی نہیں عقیدہ بھی ثابت ہو سکتا ہے، چنانچہ اولیاء اللہ کو اُن کی وفات کے بعد پکارنا اُن سے مدد و

استعانت طلب کرنا ان کو حاضر وناظر جاننا، اُن کو غیب کا عالم سمجھنا اور انکے تصرفات وتائیدات کا اعتقاد رکھنا، اُن کی عطاء بخشش کا عام ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں عقائد سے تعلق رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے جب کشف وکرامات سے ایسے عقائد ثابت کیے جائیں تو وہ یقیناً کفر وشرک ہوں گے، خاص طور پر جبکہ یہ سب امور قرآن وحدیث کے بالکل خلاف ہیں یہ تو بریلوی عقیدہ ہے۔ اور علماء دیوبند بزرگوں کے کشف وکرامات سے عقیدہ تو بڑی بات ہے استنجاء کا کوئی ادنیٰ مسئلہ بھی ثابت ہونے نہیں دیتے تو پھر ان کے ہاں کشف وکرامات کفر وشرک کیوں ہوں گے؟

اب ارشد القادری صاحب کا یہ کہنا کہ ہمارے بزرگوں کے کشف وکرامات اگر کفر وشرک ہیں تو دیوبند کے بزرگوں کے کشف وکرامات بھی کفر وشرک ہوں گے خود فریبی یا فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے؟ یقیناً جو کرامات عقائد کو بدل دیتی ہوں وہ کفر وشرک ہوں گی اور جو صرف واقعہ کی حیثیت رکھتی ہوں وہ کفر وشرک ہرگز نہیں ہوسکتی علماء دیوبند اسی کے قائل ہیں، لہٰذا ارشد القادری کا الزام بے حقیقت ہوجاتا ہے اور ان کی کتاب زلزلہ بھی بے حیثیت اور فریب نظر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ارشد القادری نے قلمی فن کاری سے کام لیا ہے اور کرامات کی دونوں حیثیتوں کو ایک ثابت کرنے کی مکروہ کوشش کی ہے۔ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ بات ختم ہوگئی ساری مجلس کو ساکت بلکہ جامد کرکے میں تو باہر نکل آیا، عصر تک وہ حضرات گومگو کی حالت میں رہے۔ واللّٰہ اعلم کیا کیا تبصرے ہوئے۔

تبصرہ بر تبصرہ میں نے زلزلہ پر تبصرہ کر ہی دیا تھا، عصر کے بعد میرے وہ نادان دوست مولوی .... صاحب بڑے اخلاص

ومحبت سے تشریف لائے اور فرمانے لگے آپ کے جانے کے بعد سارے اساتذہ کا یہ عمومی تأثر تھا کہ:

مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے تبصرے کے بعد "زلزلہ" بے حقیقت ہوجاتا ہے

فَلَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّيْ

میرے اس تبصرے پر اساتذہ جامعہ کے تبصرے نے اس کی اہمیت کو میری نظروں میں مزید بلند و بالا کر دیا، میں تو خالی الذہنی کی حالت میں تھا تبصرہ تو درکنار جواب دہی کے لئے بھی تیار نہ تھا لیکن برجستہ ایک وزنی جواب نکل پڑا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ۔

روایتی مشائخ نے تو فیضان قبور کے خوشنما فرضی عنوانات سے اپنی اپنی مسندیں سجا رکھی ہیں لیکن دین کے یہ ادنیٰ طالب علم فیضان علمی کے اظہار سے بھی احتیاط برتتے ہیں۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تابکجاست

وجدانی تبصرہ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک نقشبندی بزرگ (سعودی عرب) نے راقم الحروف سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ "زلزلہ" پر تبصرہ بلا واسطہ سننا چاہتے ہیں میں نے تعمیل حکم میں سنا تو دیا لیکن آخر میں اُن بزرگ سے یہ بھی بیان کیا کہ جب میں تبصرے سے فارغ ہوا اور کمرۂ اساتذہ سے باہر آیا اس وقت میرے سارے کپڑے پسینے میں تر بتر تھے ایسے جیسے کہ کسی نے پانی کا گھڑا انڈیل دیا ہو۔ زندگی میں یہ کیفیت پہلی بار پیش آئی ہے۔

فرمانے لگے تبصرہ الہامی تھا اور وحی اور الہام کی خاصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے نزول کے وقت شدید بوجھ پڑتا ہے اور آدمی بوجھ سے

چور چور ہوجاتا ہے۔ اس بات کی تائید صحابہ کرامؓ کے اقوال میں اسطرح ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوا کرتی تھی تو سخت سردیوں میں دیکھا گیا ہے کہ آپؐ کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرات موتیوں کیطرح گرنے لگتے تھے اور بوجھ سے آپ دبے جاتے تھے (صلی اللہ علیہ وسلم)

بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو یہ اُن بزرگ کا اپنا وجدان تھا، میں تو دین کا ایک ادنیٰ طالب علم ہی تھا اور آج بھی اسی حیثیت میں ہوں۔

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔

سجدۂ سہو

مولانا عامر عثمانی نے کتاب "زلزلہ" پر اپنا تائیدی تبصرہ لکھ کر قلمی جہاد کا اعلان کر دیا، اس پر ہر جانب سے انہیں دعوتِ مناظرہ دی جانے لگی اور دوسری طرف مضامین اور تنقید کا طوفان بھی زور و شور سے جاری ہوگیا۔

لیکن قطب آنست کہ نہ جنبد

مولانا عامر عثمانی جواب دینا تو درکنار کسی کو خاطر میں بھی نہیں لا رہے تھے دیوبند میں بیٹھے دیوبندیت کو آگ لگا رہے تھے۔ بقول ایک بریلوی معاصر

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خوشی و مسرت میں "شکوہ چراغاں" تو بہرحال اہل بدعت کی سنتوں میں شامل ہے وہ تو ہونا ہی تھا ملک میں بھی عام ہوگیا

اِدھر مجلس علمیہ حیدرآباد کے ارکان (جس کا راقم الحروف ذمہ دار تھا) فکرمند تھے کہ ایڈیٹر تجلی کو صراطِ مستقیم پر کس طرح لایا جائے؟ اس سلسلے میں دو چار اجلاس بھی منعقد ہوئے آخر کار یہ طے پایا کہ دو رکنی وفد کو دیوبند روانہ کیا جائے تاکہ عامر عثمانی صاحب سے بالمشافہ بات کی جاسکے، چنانچہ ارکان مجلس علمیہ سے دو

عالموں کا انتخاب کر کے دیوبند روانہ کیا گیا لیکن وہ کسی کامیاب کوشش کے بغیر واپس آ گئے۔ اس کے بعد جامعہ نظامیہ میں ہمارا وہ تبصرہ پیش آیا جسکی تفصیل اوپر لکھی جا چکی ہے۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے اپنے تبصرے کی اہمیت اسوقت زیادہ محسوس ہوئی جبکہ اساتذہ جامعہ نے اُسکو سراہا۔ میں نے مجلس علمیہ کے ارکان میں غالباً سب سے پہلے مولانا رضوان القاسمی صاحب (ناظم مدرسہ سبیل السلام حیدرآباد) سے جامعہ نظامیہ کا مذکورہ واقعہ بیان کیا، موصوف چونک پڑے اور فرمانے لگے کتاب زلزلہ کا یہی آخری اور حقیقی جواب ہے۔

ارشد القادری کی کتاب "زلزلہ" خود زلزلے سے دوچار ہو گئی۔

پھر مجلس علمیہ کا اجلاس طلب کیا گیا اور اس میں راقم الحروف کے تبصرے کو تفصیل سے سنا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ یہی تبصرہ عامر عثمانی صاحب کے نام روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ راقم الحروف نے نہایت اختصار لیکن وضاحت کیساتھ اس کو قلمبند کیا اور عامر عثمانی صاحب کے نام رجسٹرڈ پوسٹ کر دیا گیا۔

اب اللہ علیم وخبیر ہی کو حقیقی علم ہے کہ کس کی رہنمائی نے ہدایت کا کام دیا۔ ماہنامہ تجلی کے تیسرے شمارے میں عامر عثمانی صاحب نے چونکا دینے والا عنوان "سجدۂ سہو" قائم کیا اور اس میں کتاب زلزلہ کا پس منظر لکھکر اپنا تائیدی تبصرہ واپس لے لیا اور حضور رب میں توبہ کی پھر عامۃ الناس سے معذرت بھی چاہی اس کے بعد تفصیل سے ارشد القادری صاحب کی نظر وفکر کے تانے بانے بکھیر دیئے (کاش آج (۱۹۹۳ء) میرے ہاں تجلی کا وہ شمارہ موجود ہوتا تو یہاں مولانا عامر عثمانی کا "سجدۂ سہو" من وعن نقل کر دیتا تاہم یہ بات ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۴ء کی ہے حیدرآباد دکن میں یہ شمارے مل جائیں گے)

ممکن ہے مولانا عامر عثمانی نے ہمارے مکتوب کا جواب روانہ کر دیا ہو لیکن ہمیں ایسا کوئی مکتوب نہیں ملا لیکن عامر عثمانی صاحب نے ماہنامہ تجلی میں اپنے تائیدی تبصرے کو جن نکات کی روشنی میں واپس لیا ہے وہ بعینہ وہی نکات ہیں جو راقم الحروف نے لکھے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ مجلس علمیہ نے مولانا عامر عثمانی کے رجوع الی الحق کو مجلس علمیہ کا کارنامہ قرار دیا تھا۔ لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ۔

عربی کا مشہور قول ہے "لِکُلِّ جَوَادٍ زَلَّۃٌ" ہر شہسوار لغزش کھاتا ہے میدان میں دوڑنے والے ہی گر پڑتے ہیں، نشانے پر وار کرنے والا کبھی کبھی خطا کر جاتا ہے۔ عامر عثمانی کی یہ لغزش اپنے مسلک سے خروج و بغاوت یا نظر و فکر کی تبدیلی نہ تھی بلکہ یہ ایک اجتہادی قسم کی خطا تھی جو بڑے لوگوں سے جاری ہوتی ہے۔ جب ان پر حقیقت واضح ہو گئی تو اپنی غلطی کا اعلان کیا اور اعلان بھی پاکیزہ قسم کا عنوان تھا، نماز کی کسی بھول پر تلافی کے لئے سجدہ سہو کیا جاتا ہے جس کے بعد نماز کامل و مکمل ہو جاتی ہے۔ اور احادیث میں یہ مضمون ملتا ہے کہ نمازی کا یہ سہو شیطان پر بڑا بھاری ثابت ہوتا ہے۔

مطلب یہ کہ شیطان نے سہو تو آدمی کی نماز خراب کرنے کیلئے پیدا کر دیا تھا لیکن نماز پڑھنے والے نے سجدہ سہو کر کے نہ صرف اپنی سابقہ نماز کو کامل و مکمل کر لیا بلکہ سہو کے دو سجدے اضافہ کر کے اللہ کے حضور میں اپنی بندگی اور نیازمندی کا ثبوت پیش کیا۔ اس لئے نمازی کا سجدہ سہو شیطان پر بھاری پڑا اور وہ ناکام ہوا مولانا عامر عثمانی نے اپنے تائیدی تبصرے سے توبہ کی۔ اپنی خطا کا اعتراف کیا اور اپنا تائیدی تبصرہ واپس لے لیا، اس پر ایوانِ شرک و بدعت میں زلزلہ آگیا، عامر عثمانی صاحب پر الزامات، اعتراضات، حتّٰی کہ مغلظات کا انہی جوانب سے طوفان

اُبل پڑا جن جوانب سے تعریف وتوصیف کے بادل اُمنڈ آئے تھے۔

حضرت سلمان فارسیؓ بہت بڑے یہودی عالم اور اپنی قوم کے نیک نام قابلِ احترام بزرگ تھے جب ان پر اسلام کی حقانیت ظاہر ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا پھر آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ میری قوم نہایت جھوٹی اور افتراء پرداز ہے آپ میرے بارے میں اُن سے دریافت فرمالیں میں کیسا آدمی ہوں ؟

چنانچہ آپؐ نے اُن کی قوم سے سلمان فارسی کے بارے میں دریافت فرمایا کہ سلمان تم میں کیسا آدمی ہے ؟

ساری قوم نے کہا شریف ابن شریف ابن شریف ہے (یعنی نسلاً شریف وبزرگ خاندان کا شریف زادہ ہے) ہم اُسکو سچا جانتے ہیں وہ ہمارا بڑا عالم بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔

سلمان فارسیؓ وہیں کہیں چھپے ہوئے تھے اچانک ظاہر ہو کر کہنے لگے:۔

اے قوم کے لوگو! اگر میں سچا ہوں تو میری پیروی کرو یہ اللہ کے رسول ہیں، میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔

بس یہ کہنا ہی تھا کہ ساری قوم الجھ پڑی کہنے لگی سلمان کذّاب ابن کذّاب ابن کذّاب ہے۔ سلمان فارسیؓ نے کہا یا رسول اللہؐ آپ نے دیکھ لیا یہودی کیسے جھوٹے اور افتراء پرداز ہوتے ہیں۔ اللہ عامر عثمانی کی مغفرت فرمائے آنے والے مسلمانوں کے لئے کتنا اچھا نمونہ چھوڑ گئے۔

رَحْمَةً وَّاسِعَةً

تیج مسئلہ گذشتہ اوراق میں مولوی ابوالوفا صاحب افغانی کا اجمالاً ذکر آچکا ہے، موصوف اپنے دورِ جوانی میں شہر حیدرآباد

آبسے تھے اور آخری زندگی تک یہاں ہی مقیم رہے۔ اساتذہ دیوبند کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں، ابتداءً شہر کے روایتی مشائخ وعلماء کی نظر وفکر سے اختلاف تھا بعد میں انہی مشائخ وعلماء کی قیادت وسیادت سنبھالی شہر میں مجلس علمیہ کی سرگرمی اور تحریک حقانی کے دور میں جہاں چھوٹے موٹے مشائخ نے اشتہار بازی کا سلسلہ جاری رکھا تھا اُن دنوں شہر کے بعض مقامی علماء بھی قرطاس وقلم لے کر میدان میں آگئے تھے، چھوٹے موٹے رسائل اور کتابچے شائع ہونے لگے لیکن ان کتابچوں کا کچھ زیادہ وزن نہ تھا یہ صرف اپنے مسلک ومکتب کے تحفظ کی ناکام کوششیں تھیں۔

انہی ایام میں مذکور الصدر عالم صاحب نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "پنج مسئلہ" تھا (یعنی پانچ مسئلے) یہ کوئی علم فقہ وحدیث وتفسیر کے مسائل نہ تھے بلکہ شہر کے رسمی ورواجی مسائل تھے جو موجودہ مسلمانوں میں دین و ایمان کی طرح جاری وساری ہوگئے ہیں۔

بات کتنی ہی ہلکی و معمولی ہو لیکن جب کسی بڑے کی زبان سے نکل جائے بنا وزن پیدا کرلیتی ہے ایسی ہی کچھ صورت ان پانچ مسائل کی ہوگئی ان مسائل کی تردید میں اگرچہ بارہا لکھا اور بولا جا چکا ہے لیکن یہ مسائل ہر دور میں بار بار دُہرائے جاتے رہے ہیں۔

ل موصوف کی صلوٰۃ جنازہ میں راقم الحروف شریک تھا، صلوٰۃ جنازہ کے بعد میت کو مدرسہ نظامیہ کے بانی مولانا انوار اللہ خان صاحب فضیلت جنگ کی قبر شریف کا طواف کروایا گیا جو ایک خوبصورت گنبد کے اندر مدرسہ کے احاطے میں موجود ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

وہ پانچ مسائل کیا تھے ہم موصوف کے اسی کتابچہ سے نقل کر دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والے حضرات ان مسائل کی اہمیت اور وزن کو خود متعین کر لیں۔

(۱) مروّجہ فاتحہ (۲) نماز کے بعد مصافحہ

(۳) نماز کے بعد دوسری دعاء (۴) ایصالِ ثواب (۵) ترجمۂ خطبۂ جمعہ

فیصلہ پنج مسئلہ:

چالیس صفحات کا یہ کتابچہ انہی پانچ مسائل کا فیصلہ ہے "وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ"

(۱) مروّجہ فاتحہ سے صرف فاتحہ مراد نہیں ہے کیونکہ یہ تمام علماء کے ہاں جائز ہے بلکہ رواجی اور "حلوا چلاؤ" والی فاتحہ مراد ہے جو خاص اوقات میں خاص طریقے سے پڑھی جاتی ہے اس لئے مولانا افغانی نے مروّجہ کا لفظ لکھا ہے۔

(۲) نماز کے بعد مصافحہ، یہاں نماز سے صرف نماز فجر اور نماز عصر مراد ہے اسلئے کہ صرف ان نمازوں کے بعد سب مُصلّی ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں بقیہ تین نمازوں کے بعد نہیں کرتے۔

(۳) نماز کے بعد دوسری دعا اس سے اجتماعی دعا مراد ہے یعنی فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ اور پھر سنتوں کے بعد دوبارہ امام دعا کرے گا اور سب مصلی آمین کہیں گے۔

(۴) ایصالِ ثواب:۔ یہاں بھی رواجی اور "حلوا چلاؤ" والی فاتحہ مراد ہے کیونکہ خالص ایصالِ ثواب کا کوئی مخالف نہیں ہے۔

(۵) ترجمہ خطبۂ جمعہ یہ عربی خطبے کے اردو ترجمے سے متعلق ہے جو عربی خطبہ سے پہلے نیچے کھڑے ہو کر پڑھا جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ پانچ مسائل جن کو عوام نے کتاب وسنّت والی اہمیت دے رکھی ہے، حالانکہ معمولی علم وعقل رکھنے والا مسلمان بھی جانتا ہے کہ ان اعمال کا وجود عہدِ نبوت میں تو کجا سلف صالحین کے دور میں بھی نہیں تھا اور یہ سب اعمال خیر القرون (دین کا کامل ومکمل زمانہ) کے بعد کی پیداوار ہیں، غالباً مولانا عامر عثمانی پہلے عالم ہیں جنہوں نے اپنے ماہنامہ تجلی (دیوبند) میں تفصیل کے ساتھ "پنج مسئلہ" کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔

جب یہ کتابچہ شائع ہوا تو مولانا موصوف کی جانب سے جامعۂ نظامیہ کے اساتذہ کے نام بھی اسکی کاپیاں آئیں ایک کتابچہ راقم الحروف کے نام بھی تھا۔

اللہ کو جب اپنے کسی بندے سے کام لینا ہوتا ہے تو اسباب یوں فراہم ہو جاتے ہیں۔ کتاب زلزلہ بھی تو اسی طرح آئی تھی مخالف کیمپ کے کسی کرم فرما نے بھیج دی — میری خریداری کا تو سوال ہی پیدا نہیں تا۔ بہر حال "پنج مسئلہ" ہم نے بھی پڑھ لیا بات آئی گئی ہوگئی اسکے کچھ عرصہ بعد مدرسہ نظامیہ کی اُسی دوپہر والی چائے نوشی کی مجلس میں جس کا تذکرہ "زلزلہ" کے عنوان میں آچکا ہے "پنج مسئلہ" پر تبصرہ چھڑ گیا، "پنج مسئلہ" "زلزلہ" کی طرح بیرونِ خانہ نہ تھا۔ اندرون خانہ اپنے ہی شیخ المشائخ، فقیہ زمانہ، ابوحنیفۂ ثانی کے قلم زرّین[۱] کا نوشتہ تھا، موصوف شہر میں استاذ الکل کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ اس مجلس میں "پنج مسئلہ" پر نقد وتبصرہ کرنا سوائے تعریف اور توصیف کے اور کیا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ اس مختصر مجلس میں عام طور پر یہی تاثر تھا کہ وہی نادان دوست مولوی .... صاحب

---

[۱] مولانا افغانی کے معتقدین اور ہم مسلک ان کے لئے ایسے ہی القاب استعمال کیا کرتے تھے۔

پھر ادائی کر بیٹھے. فرمانے لگے مولوی عبدالرحمٰن صاحب غالباً آپ نے "پنج مسئلہ" کا مطالعہ کیا ہوگا؟ حضرت کے دلائل و شواہد کیسے ہیں؟

اس پر مجلس کا رُخ نیا موڑ اختیار کر گیا. موصوف نے سابقہ نادانیوں کو تازہ کر دیا. چند لمحات کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا لیکن اہل مجلس میرا جواب سننا چاہتے تھے اور اس سے فرار ممکن نہ تھا اس وقت تبصرہ کسی معمولی شخصیت پر نہ تھا اُستاذ الکل، شیخ المشائخ، فقیہ زمانہ پر ہونا تھا. ع

اگر گویم زبان سوزد

ایسے وقت یہاں بھی اللہ کی وہ قدیم سنت جاری ہوئی جو ایسے نازک وقتوں پر اپنے بندوں کی دستگیری کرتی ہے. برجستہ یہ فقرہ نکل پڑا:

"مولوی صاحب میں نے "پنج مسئلہ" توجہ سے پڑھا ہے
کتابچے میں اِثبات تھا ثبوت نہ ملا"

بس بات ختم ہوگئی ایسے طور پر کہ کوئی مسئلہ ہی پیش نہ آیا ہو.

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرۂ خون نہ نکلا

معلوم نہیں میرے اس مختصر تبصرے کے بعد مجلس پر آگ برسی یا پانی برسا بالکل جمود و سکوت طاری ہوگیا اس کے چند ہی لمحات بعد ایک استاذ نے نئی بات شروع کی مجلس کا رخ اُسی جانب چل پڑا اور "پنج مسئلہ" برف دان کی نذر ہوگیا ان سطور کے پڑھنے والے حضرات یقیناً حیران ہوں گے کہ سوال کیا تھا اور جواب کیا دیا گیا پوری مجلس سرد کیوں پڑ گئی؟ عامۃ الناس کی تفہیم کے لئے جواب کی وضاحت کی جاتی ہے.

اِثبات و ثبوت دو علمی الفاظ ہیں اہل علم ان کی حقیقت خوب جانتے ہیں

اثبات کہتے ہیں کسی چیز کو ثابت کر دکھانا جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے سے وہ چیز موجود نہ تھی اب ثابت کی گئی ہو۔

ثبوت، اس کا برعکس مفہوم ہے یعنی کسی چیز کا پہلے سے موجود ہونا اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے نماز، روزہ، حج اور عقائد وغیرہ۔

یہ دو علمی اصطلاحات اصول دین میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں جن سے سینکڑوں جگہ کام لیا جاتا ہے اسلام میں عقائد اور عبادات کا معاملہ دیگر مسائل سے بالکل مختلف ہے اس میں مسلمانوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ عبادات کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ادا کریں۔

دین اسلام کے سارے عقائد اور عبادات کا ثبوت موجود ہے یعنی اُن کا طور طریقہ، آغاز و انجام تفصیل سے بتلا دیا گیا ہے اُسی کیفیت سے عبادت کی تکمیل کرنی چاہیئے۔ ان طریقوں میں جیسے کمی کرنے پر عبادت باطل ہو جاتی ہے ایسے ہی کسی قسم کی زیادتی اور اضافہ کرنے پر عبادت مَردُود ہو جاتی ہے۔

اب اس اصول پر "پنج مسئلہ" پر غور کر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسمیں سارے مسائل عبادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ان کو ثابت کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مسائل پہلے نہ تھے اب ثابت کئے جا رہے ہیں یا ثابت تھے لیکن چند اہم مصلحتوں کے پیش نظر ان میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ عبادات میں اس قسم کا اضافہ یا کسی بھی حذف و انحصار کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ دین کامل و مکمل ہو چکا ہے عبادات کے آداب و مستحبات تک جمع ہو چکے ہیں اب کسی اضافہ کی ضرورت نہیں

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ (الآیۃ)

دین میں ایسے ہی اضافوں کو بدعت کہا جاتا ہے جو اللہ اور رسول کے ہاں مردود ہے۔

کسی فلسفی کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی قوتِ علم وفکر سے پتھر کے ستون کو سونا ثابت کرنا چاہتا تو اس پر دلائل وشواہد پیش کر کے سونا ثابت کر دیتا تھا اور سننے والوں کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوا کرتا تھا۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ بہر صورت پتھر تو پتھر ہی رہے گا سونا چاندی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

یہی حال "پنج مسئلہ" کے دلائل وشواہد کا تھا مولانا افغانی نے دلائل و شواہد سے ان اعمال کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو نادان مسلمانوں میں رائج ہیں جن کی عبادات میں قطعاً ضرورت نہیں ہے اللہ رحم کرے عالِم کا فسادِ عالَم کا فساد ہوا کرتا ہے۔ مولانا کی اس نظر وفکر کو اُنہی کے کتابچے "پنج مسئلہ" سے نقل کر رہے ہیں تاکہ پڑھنے والے حضرات "پنج مسئلہ" کا علمی و فکری وزن خود متعین کر لیں۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ

مولانا "پنج مسئلہ" کے صفحہ ۷ا تا ۲۰ر پر اس طرح حجت پیش کرتے ہیں:۔

پہلی دلیل:۔ فاتحہ اور سورہ اخلاص اور ان کے سوا دیگر سورتیں پڑھنے کی ممانعت شرع میں وارد نہیں بلکہ ان کے پڑھنے کی ترغیب حدیثوں میں وارد ہے اور ان کے فضائل میں احادیث بکثرت آئی ہیں۔

دوسری دلیل:۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی اور قرآن عظیم فرمایا ہے اور اس کو قرآن کی سب سے بڑی سورت قرار دیا ہے۔

(بخاری صـ۶۴۲)

تیسری دلیل:۔ حدیث شریف میں ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی) جان ہے تورات وانجیل اور قرآن میں سورۂ فاتحہ کے جیسی کوئی اور سورت نہیں ہے۔

چوتھی دلیل :- ابو سعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ ہم سفر میں تھے راہ میں ایک قبیلے کے سردار کو زہریلے جانور نے کاٹا تھا میں نے سورۂ فاتحہ پڑھکر اس کا زہر اتار دیا اس کے صلے میں مجھے تیس بکریاں ملیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قصہ بیان کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا بکریاں آپس میں تقسیم کرلو اور میرا حصہ بھی اس میں لگاؤ۔
(بخاری ص ۳۰۴)

چند ایسے ہی دلائل بیان کر کے مولانا افغانی اپنا زبردست دعویٰ اسطرح ثابت کرتے ہیں۔

ملاحظہ ہو کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے بغیر صحابی (ابوسعید الخدریؓ) نے سورۂ فاتحہ پڑھکر زہر اتار دیا جس سے معلوم ہوا کہ یہ (سورۂ فاتحہ) ایسی عظیم الشان سورت ہے کہ ہر مشکل میں اس سے کام لے سکتے ہیں اور ہر بھلائی کے لئے اسے تبرکاً استعمال کر سکتے ہیں اور اس کا استعمال موجب برکات اور یہ سورت حامل برکات و کرامات ہے اس لئے اس کا نام سورۂ شفا بھی ہے، علماء و مشائخین نے ہمیشہ اسکو دَم، جھوِ (جھا) علاج و معالجہ میں استعمال کیا ہے اور کرتے آئے ہیں جس سے مخلوق خدا کو فائدہ بھی ہوتا ہے۔

مولانا افغانی کے دلائل میں بطور نمونہ یہ چار دلیلیں ہیں اس کے بعد کتب فقہ کے حوالے درج کئے ہیں بس مسئلہ ثابت ہوگیا کہ نماز فجر وعصر اور جمعہ کی سنتوں کے بعد فاتحہ پڑھنا چاہیئے۔ والسلام

مولانا افغانی کے بقیہ دلائل کا وزن کتابچہ پڑھنے والے حضرات خود متعین کرلیں۔ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

یہ تھی تفصیل ہمارے اس جواب کی جو ”اثبات و ثبوت“ کے عنوان میں برجستہ

کہہ دی گئی تھی اور جس کو علماء کی جماعت نے خاموشی سے سماعت کیا تھا۔
یہ تو اب یاد نہیں کہ ہمارے اس تبصرے کا عمل یا ردِّ عمل کیا رہا لیکن "صحیح مسئلہ" کی حقیقت واضح ہوگئی کہ وہ سب رسمی اور رواجی اعمال ہیں جنکو بے علم مسلمانوں نے اپنے اپنے شہروں میں جاری کرلئے ہیں اور اُس پرستم ظریفی یہ ہوئی کہ ان کے ماتحت علماء و مشائخ نے ان مسائل پر اپنی مہریں ثبت کردیں۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

دربارِ خواجہ میں

گذشتہ اوراق میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں سلطنتِ آصف جاہی کے زوال کے بعد مدرسہ نظامیہ مالی بحران سے دوچار ہوگیا تھا، نظامِ دکن کی سرپرستی ختم ہوچکی تھی حکومتِ ہند نے وہ ساری مراعات ختم کردیں جو دورِ شاہی میں مدرسہ کو حاصل تھیں اس طرح مدرسہ کی مالی مشکلات دوچند ہوگئیں تاہم مجلس انتظامیہ نے اپنی جدوجہد میں اضافہ کردیا تھا جس کے نتیجہ میں مدرسہ کی کارکردگی کو برقرار رکھا جاسکا۔ لیکن ہر زمانے میں نادان دوست مشکلات کا باعث رہے ہیں مدرسہ نظامیہ کو بھی ایسے ہی چند ایک نادان دوست مل گئے اور انہوں نے مدرسہ کی مالی فراہمی کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، یہ حضرات پرانے شہر میں مستعملہ موٹر پارٹس کے تاجر تھے، فراہمی مال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ان کی جدوجہد کی منزل شہر میں چرمِ قربانی کا حصول اور زکوٰۃ وصدقات کو جمع کرنا تھا اس بہانے مدرسے کی انتظامیہ میں بھی دخل اندازی ہونے لگی انہی ایام اجمیر شریف (بھارت) میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سالانہ عرس[1]

---

[1] یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اجمیر کے سالانہ عرس شریف کے دن مدرسہ نظامیہ کی چھٹی ہوتی ہے۔

ہونے والا تھا ان نادان خیر خواہوں نے مجلس انتظامیہ سے یہ طے کروالیا کہ اس سال مدرسہ نظامیہ کا سہ رکنی وفد مدرسہ کی نمائندگی کے طور پر عرس شریف میں شرکت کرے گا اور مدرسہ کے استحکام مالیہ کے لئے دربار خواجہ میں (نقل کفر کفر نباشد) استغاثہ پیش کرے گا۔

ان نادانوں کے ہاں فراہمی مالیہ کا یہ بھی ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ نَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَنَتُوْبُ اِلَیْہِ چنانچہ مدرسہ کے اساتذہ کا سہ رکنی وفد نہایت اکرام واحترام سے اجمیر شریف روانہ کردیا گیا۔

مراسم عرس شریف میں شرکت کے بعد یہ مقدس وفد حیدرآباد واپس ہوا تو حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور اسی شان وآن سے مدرسہ لایا گیا۔

دوسرے دن جلسہ استقبالیہ طے تھا امیر الوفد نے عرس شریف کے روحانی وعرفانی تاثرات تفصیل سے بیان کئے اور آخر میں سامعین کو جن میں شہر کے مشائخ، مدرسہ کے اساتذہ وطلبۂ اور عوام الناس تھے یہ عظیم خوشخبری دی کہ ہم نے بھی دربار خواجہ غریب نواز میں ہزاروں عرضیات کے ہجوم میں نہایت ادب واحترام سے مدرسہ نظامیہ کا سالانہ بجٹ پیش کردیا، دوسروں کا انجام تو ہمیں معلوم نہ ہوسکا البتہ حضرت خواجۂ خواجگان، فریادرس بے کساں، چارۂ بے چارگان نے مدرسہ کا سالانہ بجٹ منظور کرلیا اور مزید اپنی کرم فرمائی سے مدرسہ کی دائمی سرپرستی بھی قبول کرلی۔

یہ خوشخبری اجمیر شریف سے ایک دن پہلے ہمیں مل گئی، اب ہم مدرسہ کے مالیہ سے بے نیاز ہوچکے ہیں۔ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔

اس عظیم انکشاف پر ساری محفل جھوم اٹھی اور ہر جانب سے سبحان اللہ،

سبحان اللہ، جزاکم اللہ، جزاکم اللہ کے نعرے بلند ہونے لگے، اور اولیاء اللہ کے فیوض و برکات کی ایک اور سند فراہم ہو گئی۔ آخر میں صدر جلسہ نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد حضرت خواجۂ خواجگان، چراغ چشتیان، محبّ فقیران، انیس غریبان، سلطان الہند کی خدمتِ اقدس فیض درجت میں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا پھر سلام بحضور خیرالانام کے بعد ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

رازِ سربستہ خواجۂ خواجگان کے دربار کی خوشخبری شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہر جگہ چرچے تھے، ردِ عمل کا تو علم نہیں البتہ مشائخ کی خانقاہوں اور علماء کی مجلسوں میں فیضانِ قبور اور کشف و کرامات کی بحثیں چل پڑیں۔ اللہ اہل فلسفہ پر رحم فرمائے انہوں نے عالمِ امکان کو اسقدر طویل و عریض کر رکھا ہے کہ اس کی حدود سے پہلے عقل انسانی کی پروازیں دم توڑ دیتی ہیں۔ دنیا میں کیا نہیں ہوا اور کیا نہیں ہو سکتا؟ اولیاء اللہ نے تو کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لے لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

رنگ برنگ کی بولیاں سننے میں آ رہی تھیں ایک دن وہی امیرالوفد جنہوں نے دربارِ خواجہ میں مدرسہ نظامیہ کا بجٹ پیش کیا تھا بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ موصوف جب زیادہ بے تکلف ہو جاتے تو مجھ کو لفظ یار سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ کہنے لگے قرآن کی اس آیت کا ترجمہ کر دے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔

میں نے ان پر ایک اڑتی نظر ڈالی پھر پوچھا ترجمہ دو طرح کا ہوا کرتا ہے تحت اللفظ اور بامحاورہ کونسا ترجمہ چاہیئے؟

بس موصوف چکرا گئے پھر سنبھل کر کہنے لگے دونوں ترجمے کر دو۔

میں نے کہا ٹھیک ہے۔ بامحاورہ ترجمہ تو یہ ہوگا۔
اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔
اور تحت اللفظ ترجمہ:۔
اور اللہ بہتر ہے روزی دینے والوں میں۔
اس تحت اللفظ ترجمہ پر میرا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور کہنے لگے اب تو تم پورے قبضے میں آگئے ہو میں تمہاری زبان سے یہی سننا چاہتا تھا،
وَاللّٰہُ خَیْرُ الرَّازِقِیْنَ اور اللہ سب سے اچھا روزی دینے والوں میں رازقین جمع کا لفظ ہے (یعنی رزق دینے والے) معلوم ہوا کہ رزق دینے والے اور بھی ہیں۔
موصوف کا مقصد یہ تھا کہ اگر ہم نے حضرت خواجۂ خواجگان سے مدرسہ نظامیہ کا بجٹ مانگ لیا تو کیا گناہ کیا؟ پھر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔
میں نے مداخلت کے طور پر کہا براہِ کرم آپ بھی ایک آیت کا ترجمہ فرما دیں میں آپ کی بات تسلیم کرلوں گا۔
فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (المومنون آیت ۱۴)
"بہت برکت والا ہے اللہ جو پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے"
پیدا کرنے والے اور بھی ہیں، تین سو ساٹھ نہ سہی تو کم از کم تین خالق آپ بھی تسلیم کرلیں تاکہ عیسائیوں[1] میں آپ کا شمار ہوسکے۔
کہنے لگے بس بات ختم ہوگئی دراز نہ کیجئے، میں نے کہا ٹھیک ہے تو پھر قیامت تک بھی آپ میرا جواب نہ دے سکیں گے۔

---

[1] عیسائیوں کے تین خدا ہیں۔ عیسیٰ، مریم، روح القدس۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نادان لوگ دین کہاں سیکھے ہیں جو دوسروں کو سکھائیں گے

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

ان کے بڑوں نے ان کو ایسے ہی سکھایا یہ اوروں کو بھی تلقین کرنے لگے۔ دراصل یہ عقیدہ شرکیہ جو وراثتہً انہیں ملا ہے اس پر غور و فکر کرنا تو درکنار اس کو دین و ایمان کی طرح سینوں میں دبائے بیٹھے ہیں ایک راز سربستہ ہے جو وقتاً فوقتاً پھوٹ پڑتا ہے۔ بنیاد یہی ہے کہ اولیاء اللہ کی قبروں سے سب کچھ ملتا ہے۔ اس بحث کو ہم نے فیضان قبور کے عنوان سے تفصیلاً لکھا ہے اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

توحیدِ خالص؟

انگریزی دور کی بات ہے ضلع امرتسر (انڈیا) میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری بہت بڑے عالم اور مناظر گذرے ہیں گزشتہ اوراق میں موصوف کا تذکرہ آچکا ہے مسلکاً اہل حدیث تھے یہود و نصاریٰ اور آریہ سماج فرقوں سے کامیاب مناظرے کئے ہیں دہلی کا مشہور زمانہ آریہ سماج رہنما پنڈت رام چندر جو بہت بڑا مناظر تھا اور اسلامیات پر اسقدر عبور رکھتا تھا کہ جب وہ اپنے مطلب کے لئے قرآن حکیم کی آیات پڑھتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدھے قرآن کا حافظ ہے تاہم مولانا ثناء اللہ صاحب سے مناظرہ کرنے میں گھبراہٹ محسوس کرتا تھا۔

بہرحال مولانا جہاں غیر اسلامی مذاہب سے برسرپیکار رہتے وہاں مسلمانوں میں شرک و بدعت سے بھی اُنہیں سخت نفرت اور بیزار گی تھی۔

اجمیر شریف میں مولانا کے ایک بے تکلف دوست مولوی معین الدین صاحب اجمیری رہا کرتے تھے۔ مولانا صاحب کو اکثر دعوت دیا کرتے تھے،

کہ کبھی تو اجمیر شریف تشریف لائیں جبکہ میں آپ کے ہاں امرتسر بارہا آچکا ہوں لیکن مولانا ہمیشہ ٹال دیا کرتے تھے۔ ایک دن شدید اصرار پر کہنے لگے مولوی معین الدین صاحب آپ سے ملاقات کے لئے طبیعت تو ضرور چاہتی ہے لیکن اجمیر کا ماحول نہایت بدعت و شرک آلود ہے مسلمانوں کو اس حال میں دیکھکر میرا سینہ تنگ ہوجاتا ہے اور میں یہ ماحول برداشت نہیں کرسکتا اسلئے اجمیر آنے سے احتیاط کرتا ہوں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد مولانا ثناءاللہ صاحب بغیر علم و اطلاع مولوی معین الدین صاحب کے ہاں اچانک اجمیر آگئے، یہ زمانہ اجمیر شریف میں عرس شریف کے شباب کا تھا، اجمیر میں مخلوق خدا ٹوٹ پڑی تھی، مراسم عروج پر تھے ہر طرف یا خواجہ، او خواجہ، دے خواجہ کی صدائیں تھیں۔ مولانا کی تشریف آوری پر جہاں مولوی معین الدین صاحب کو بے حد مسرت تھی حیرت و تعجب بھی شدید تھا کہ عام دنوں میں اجمیر آنا پسند نہیں کرتے تھے، تشریف بھی لائے ہیں تو عرس شریف کے ایام میں، عجیب بات ہے۔

بہرحال کھانے پینے سے فراغت کے بعد مولوی معین الدین صاحب نے مزاحًا پوچھا، مولانا کیا شرک و بدعت کے بارے میں آپ کا سابقہ نظریہ تبدیل ہوچکا ہے اور کیا آپ نے توبہ کرلی ہے؟ مولانا ثناءاللہ صاحب نے کہا ایسی کوئی بات نہیں، بتایئے آپ کو ایسا شبہ کیوں ہوا؟

مولانا معین الدین صاحب نے کہا پہلے تو آپ شرک و بدعت کی آلودگی کی وجہ سے اجمیر آنا پسند نہیں کرتے تھے اور جب تشریف لائے ہیں تو عین عرس شریف کے زمانہ میں، کیا آپ کو ان دنوں عرس شریف کا علم نہ تھا؟

مولانا ثناء اللہ صاحب نے کہا مولوی صاحب عرس شریف کا علم تو تھا میں نے عمداً انہی ایام میں سفر کا ارادہ کیا اور آگیا، مجھے معلوم تھا کہ اجمیر میں شرک و بدعت تو عام ہے ہی لیکن اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ عرس شریف کے زمانے میں صرف اور صرف شرک و بدعت ہی رہ جاتی ہے توحید کا نام و نشان بھی نہیں ملتا، میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے آیا ہوں کہ کیا مسلمان اس حد تک بھی جا سکتے ہیں؟

مولوی معین الدین صاحب ہنس پڑے اور فرمایا مولانا آپ کو یہ غلط اطلاع دی گئی ہے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں، لوگ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں عام دنوں میں تو آپ کی معلومات صحیح ہیں کہ یہاں توحید الٰہی کے ساتھ شرک و بدعت بھی جاری و ساری رہا کرتے ہیں لیکن عرس شریف کے دنوں میں یہاں صرف توحید ہی توحید باقی رہ جاتی ہے، شرک کا نام بھی نہیں ملتا صرف ایک ہی نام باقی رہ جاتا ہے، مولانا ثناء اللہ صاحب حیران ہوگئے کہ یہ کیا بات ہے؟

مولوی معین الدین صاحب نے کہا چلئے میں آپ کو یہ منظر دکھا دوں۔ دونوں حضرات باہر نکلے جیسا کہ لکھا گیا، درگاہ شریف کے اطراف و اکناف مخلوقِ خدا ٹوٹ پڑی ہے، جدھر دیکھو ہجوم ہی ہجوم ہے، مرد اور عورتوں کا بلا حجاب خلا ملا ہے، ہجوم میں عورتیں اور بچے پسے جا رہے ہیں، درگاہ شریف کے اندر تو تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر ایک کی زبان پر یا خواجہ یا خواجہ غریب نواز، بندہ نواز، دستگیر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں، قبر شریف کے اطراف طواف ہو رہا ہے، کوئی سجدہ ریز ہے تو کوئی ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے، کوئی دست بستہ سر جھکائے کھڑا ہے، فقیروں کی صدائیں ہر طرف سے آ رہی ہیں، یا خواجہ، دے خواجہ، بھر دے جھولی، لیکر رہوں گا

دینا پڑے گا وغیرہ وغیرہ۔

آدھا پون گھنٹہ یہ رنگ برنگ مناظر دکھلا کر مولوی معین الدین صاحب اپنے گھر لے آئے، پھر مولانا ثناء اللہ صاحب سے پوچھا اس پورے عرصے میں آپ نے کہیں سنا کہ کوئی یا اللہ، اللہ اکبر، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا کلمہ اپنی زبان سے نکال رہا ہے؟ سوائے یا خواجہ، او خواجہ، دے خواجہ، لے خواجہ یہ توحید نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ نے صحیح سنا کہ ہے کہ یہاں عرس شریف کے دنوں میں سوائے خواجہ کے اور کوئی نہیں ہوتا۔ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ)

اس پر مولانا ثناء اللہ صاحب مسلمانوں کی اس گئی گذری حالت پر رو پڑے۔

خَیْرُ الرَّازِقِیْن

گذشتہ صفحات میں اُس مولوی صاحب کا قصہ آپ نے پڑھا ہے جنہوں نے دربارِ خواجہ سے مدرسہ نظامیہ کا سالانہ بجٹ منظور کروا لیا تھا اور پھر بعد میں حضرت خواجہ کی عطا و بخشش کو قرآن کی آیت وَاللّٰہُ خَیْرُ الرَّازِقِیْنَ سے ثابت کر رہے تھے کہ آیت شریفہ میں رازقین جمع کا لفظ آیا ہے یعنی رزق دینے والے۔ معلوم ہوا کہ رزق دینے والے اللہ کے سوا اور بھی ہیں اگر ان میں حضرت خواجۂ خواجگان بھی شامل ہوں تو کیا تعجب ہے؟

ہم اس جاہلانہ و طفلانہ استدلال کو خاطر میں نہ لاتے، اگر کوئی مریضِ عشق کی طرح مریضِ عقل اپنی زبان سے نکالتا لیکن معاملہ یہاں مختلف ہے مدرسہ نظامیہ کا فاضل، استاذ مدرسہ، اور علماء و مشائخ کا اجمیری نمائندہ مدرسہ ہی کی حدود میں غیر سے نہیں اپنے ہی ہم پیشہ استاذ و رفیق (راقم الحروف) سے کہہ رہا ہے بلکہ اقرار کروانا چاہتا ہے۔ اس لئے ہم اس مکروہ فکر و نظر پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

براہ کرم پہلے سورۃ یوسف کی آیت ۱۰۶ کا ترجمہ و مطلب مطالعہ فرمایئے۔
وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ۔(الآیہ)
ترجمہ:۔ اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔

یعنی زبان سے تو سب کہتے ہیں کہ اللہ خالق ہے مالک ہے، رازق ہے اسکا کوئی شریک نہیں وہی دیتا ہے وہی لیتا ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی میں حصہ دار بنا رہا ہے کوئی اس کے لئے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتا ہے، کوئی اللہ کے عاجز بندوں کو اختیارات دے رہا ہے۔ کوئی قبر پرستی، پیر پرستی میں ڈوبا جا رہا ہے، کوئی اہل قبور سے مدد مانگ رہا ہے حتیٰ کہ آپ نے مدرسہ کا سالانہ بجٹ بھی حاصل کر رہا ہے۔ دعویٰ تو ایمان باللہ کا ہے لیکن عمل کے معاملے میں خالص شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں جس سے ان کا دعوی ایمان ہی باطل ہو رہا ہے۔

ہمارا یہ تبصرہ عام مسلمانوں کی تشفی کے لئے اُس فریب دہی کی وضاحت کرتا ہے جو خیر الرازقین کے لفظ سے رزق دینے والوں کی طویل فہرست معلوم کر لیا گیا ہے پھر دربار خواجہ سے مدرسہ کا سالانہ بجٹ منظور کروا لیا ہے الزامی جواب تو اُنہیں اسی وقت دے دیا گیا تھا کہ اگر رازق چند ایک ہیں تو خالق بھی چند ایک ماننا پڑے گا کیونکہ اللہ نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْن (پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر) کہا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جا بجا اپنی صفات کو جمع کے لفظ ہی سے ادا کیا ہے یہ قرآن حکیم کا خصوصی عنوان ہے جس کی نقل دنیا کے بڑے لوگوں نے بھی کی ہے۔ چند ایک صفات ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) خَیْرُ الرّٰازِقِیْنَ (۲) اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔
(۳) خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ (۴) خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ
(۵) اَرْحَمُ الرّٰاحِمِیْنَ (۶) خَیْرُ النّٰاصِرِیْنَ۔
(۷) خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ وغیرہ

رزق دینے والوں، پیدا کرنے والوں، معاف کرنے والوں، رحم کرنے والوں، مدد کرنے والوں میں اللہ سب سے بہتر اور اعلیٰ ہے کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ اپنی صفات میں دوسروں کی شرکت کا اقرار کر رہا ہے (نعوذ باللہ) حالانکہ قرآن حکیم میں سینکڑوں جگہ اس کی نفی آئی ہے کہ اللہ کی ذات تو اعلیٰ و برتر ہے ہی اسکی صفات میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ کا یہی مطلب ہے جس کا کلمہ طیبہ میں ہم اقرار کرتے ہیں یہ فریب دراصل ان لوگوں نے دیا ہے جو عربی کلام کو عجمی کلام و زبان کے لب و لہجہ میں سمجھتے ہیں ان نادانوں نے اللہ کے کلام کی قدر نہ جانی۔

عربی فصاحت و بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کسی بڑے کے کلام و پیام کو جمع کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے جیسے بادشاہ وقت کا یہ کہنا کہ ما یدولت حکم دیتے ہیں ہم معاف کرنے والے ہیں، ہم مدد کرنے والے ہیں۔ وغیرہ۔

یہاں "ہم حکم دیتے ہیں" "ہم معاف کرنے والے ہیں" جمع کے الفاظ ہیں لیکن کہنے والا واحد ہے اسکو اس طرح کہنا چاہیئے کہ میں حکم دیتا ہوں "میں معاف کرنے والا ہوں" وغیرہ لیکن کلام عرب میں جمع کی اضافت واحد کی جانب اضافتِ تشریفی و تعظیمی کہلاتی ہے۔ چونکہ متکلم بڑا اور اونچے درجے والا ہے اس لئے ہم دینے والے ہیں، ہم معاف کرنے والے ہیں کہا جاتا ہے۔ کلام کی ادئیگی کا یہ اعلیٰ ترین عنوان سمجھا جاتا ہے جو رب العالمین کے کلام کے لئے سو فیصد سزاوار ہے۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے سلطنتِ آصف جاہی کا آخری دور تھا شہر کے ایک معروف بازار (لاڈ بازار) میں شاہی خاندان کی ایک خاتون اپنی ضروریات خریدنے آئی (یہ بازار نسوانی زیبائش وآرائش کا مرکز سمجھا جاتا ہے) خریداری کے بعد اُس خاتون نے دُکاندار سے اسطرح خطاب کیا:۔

ہم نے آپ کو آرڈر دیا تھا پھر تاخیر کیوں ہوئی؟

ہم مزید تاخیر برداشت کرنے والے نہیں ہیں۔

ہمارے محل پر آئیے بادولت خود فیصلہ کرنے والے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

تفصیل تو یاد نہیں البتہ کلام کے یہ چند جملے خوب یاد ہیں جب کبھی کلام کی عظمت و بڑائی کا عنوان پڑھنے یا سننے میں آتا ہے، یہ شاہی کلام تازہ ہوجاتا ہے آرڈر دینے والی، تاخیر برداشت کرنے والی، فیصلہ کرنے والی خود ایک خاتون ہے لیکن ہم ہم جمع کے الفاظ استعمال کر رہی ہے۔ یہ دراصل بڑوں کے کلام کا عنوان ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو رب العالمین ہے اگر وہ اپنے کلام میں ایسا عنوان اختیار کرے تو اس عنوان سے شرکت کثرت کا مفہوم پیدا کرنا عقل کا اندھا پن نہیں تو اور کیا ہوگا؟

سورۂ واقعہ پارہ ۲۷، میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بار بار یہی عنوان دہرایا ہے

(۱) أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ

اس قطرۂ آب سے کیا تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟

(۲) أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ

ان دانوں سے کیا تم کھیتیاں اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں؟

(۳) أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ۔

یہ پانی کیا تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں؟

(۴) ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ۔
یہ آگ کے درخت کو کیا تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟
(واقعہ آیات ۵۹ تا ۷۲)

(۵) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔
ہم ہی نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

(۶) وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ۔ (المؤمنون آیت ۱۸)
اور ہم اس پانی کو (جو زمین میں ٹھیرا ہوا ہے) گم کر دینے پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

(۷) يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ۔
جس دن ہم سخت پکڑ کریں گے اُس روز ہم پورا بدلہ لینے والے ہیں۔

(۸) وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ۔ (ذاریات آیت ۴۷)
اور ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا ہے اور ہم وسیع قدرت والے ہیں۔

(۹) وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ۔ (ذاریات آیت ۴۸)
اور ہم نے زمین کو فرش بنایا سو کیسے اچھے بنانے والے ہیں۔

(۱۰) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا
اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ۔
اُس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں پھر وہ ان سے منہ موڑ لے۔ بے شک ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لینے والے ہیں۔

آیات مذکورہ میں رازقون کی طرح خالقون، زارعون، منزلون، منشئون

حافظون، قادِرُوْنَ، مُنْتَقِمُوْنَ، مُوْسِعُوْنَ ——— تعظیم و تکریم کا یہ عنوان قرآن حکیم میں اتنی کثرت سے ملتا ہے جس کا احاطہ اس مختصر رسالہ میں ممکن نہیں تاہم دس آیات نقل کر دی گئی ہیں۔ یہ وہی عظمت والا عنوان ہے جو رب العالمین نے اپنے لئے اختیار کیا ہے۔ اب کتاب کے پڑھنے والوں سے گذارش ہے کہ اس وضاحت کے بعد وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ کا ترجمہ اور مطلب کا خود فیصلہ کریں۔

اگر ان علماء و مشائخ میں حق طلبی و حق پسندی ہوتی تو ہم خود آپ کو مشورہ دیتے کہ اپنے مشائخ سے ان آیات کا مطلب دریافت کریں لیکن دین حق میں خیانت کے مرتکبین سے کیونکر توقع کی جائے کہ وہ بزرگوں کی بوسیدہ ہڈیوں کا رزق جو انہیں نذر و نیاز، عرس و فاتحہ کی شکل میں وراثۃً مل رہا ہے حق بات کا اظہار کر کے ضائع کر دیں گے۔

وَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

ایک مکروہ تحریک

مدرسہ نظامیہ میں اپنی تدریسی خدمات کے بارہ سال بعد مدرسہ کے بعض نادان خیرخواہوں نے "تطہیرِ نظامیہ" کی تحریک کا آغاز کیا (یہ حضرات قدیم شہر میں پرانے موٹر پارٹس کے تاجر تھے) بظاہر تو کہا گیا کہ:

(۱) مدرسہ کا مالیہ مستحکم کیا جائے گا۔

(۲) نصاب تعلیم میں ترمیم کی جائے گی۔

(۳) مدرسہ نظامیہ اہل نظامیہ (نظامیین) کے حوالہ کیا جائے گا وغیرہ

لیکن واقعہ یہ تھا کہ اُن کھوٹے تاجروں کے پس پردہ علماء و مشائخ بھی کام کر رہے تھے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مدرسہ کا انتظامیہ بہت جلد نظامیین کے تحت آگیا۔ بعض روایتی مشائخ کو بھی مدرسہ کا رکن و ذمہ دار نامزد کیا گیا جو حقیقۃً نظامی نہ تھے۔ اسطرح مجلس انتظامی کی سابقہ ہیئت تبدیل کر دی گئی۔ نصاب مدرسہ تو جوں کا توں رہا البتہ مالیہ کی فراہمی کے لئے جدوجہد شروع کر دی گئی۔

تطہیر نظامیہ کی اس مکروہ تحریک نے اپنے اغراض و مقاصد کو چھپائے رکھا تھا، اصل منشأ تو یہ تھا کہ مدرسہ نظامیہ سے غیر نظامی افراد کو نکالا جائے۔ اُن دنوں مجلس انتظامی کی اکثریت ہمیشہ کی طرح غیر نظامی ارکان پر مشتمل تھی جیسا کہ دور نظام شاہی میں معمول رہا ہے۔ وہ تو بہرحال خارج ہو گئی البتہ تدریسی سلسلے میں صرف دو مدرس غیر نظامی تھے۔ ایک مدرسہ کا مفتی جو فاضل دیوبند تھا دوسرا آپ کا یہ خادم۔

تطہیر نظامیہ کا پہلا نشانہ حضرت مفتی فضل الرحمن صاحب تھے، موصوف کو ہٹانا آسان کام نہ تھا، عرصۂ پندرہ سال سے افتاد کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اونچی جماعتوں کو حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔

کسی بھی جگہ علماء دیوبند کو نااہلیت کا الزام لگا کر دیانت و خیانت کا مرتکب قرار دے کر علیحدہ کرنا ممکن نہ تھا، البتہ دیدہ و دانستہ رسمی اور رواجی بدعتی مسائل مرتب کر کے مفتی صاحب سے فتویٰ طلب کیا جانے لگا۔ تاہم مفتی صاحب نہایت محتاط انداز میں جواب دینے لگے لیکن دباؤ بڑھتا گیا، مفسدین کے بعض سوالات راقم الحروف نے بھی دیکھے ہیں۔

مفتی صاحب کا علم و فہم ایسا کچا نہ تھا کہ جاہلوں کی یہ جماعت گرفت کر سکے تاہم مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ ماحول تبدیل ہو رہا ہے نقل مکانی کی فکر میں ہوں آپ بھی خبردار ہو جائیں۔

چنانچہ مفتی صاحب نے بہت جلد اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور دہلی منتقل ہو گئے البتہ راقم الحروف سخت جان ثابت ہوا اور اس مکروہ تحریک کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

اخراجی کاروائی

شہر میں حقانی تحریک نے جب بام عروج کو چھو لیا تو مشائخ کے حلقوں میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ اس تحریک کے اصل محرک کا پتہ لگایا جائے کیونکہ جتنے چہرے بھی سامنے تھے وہ اس انتہائی مزاج کے حامل نہ تھے، بعض نوجوانوں کو اس کام کے لئے لگا دیا گیا جوئندہ یابندہ ان جاسوسوں نے بہر حال پتہ لگا ہی لیا موقع بموقع مخفی طور پر معلومات حاصل کرتے رہے جہاں حقانی صاحب کے ساتھ میرا قیام و طعام ہوا کرتا تھا اور پروگرام طے پاتے تھے وہاں کسی طرح پہنچ گئے۔ ہماری یہ کاروائیاں بند کمرے میں نہیں ہوتی تھیں راز و نیاز تو ہمارا مسلک ہی نہ تھا۔

اس کے بعد مدرسہ کی جانب سے وہی حربہ استعمال کیا جانے لگا جو مفتی صاحب کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بھانت بھانت کے سوالات تحریرًا دیئے جاتے اور مطالبہ کیا جاتا تھا کہ تحریری طور پر جواب دیا جائے، خاص طور پر بدعتی عقائد و اعمال کے بارے میں میرا عندیہ دریافت کیا جاتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے انکے ہر سوال کا تحریری جواب دیا ہے جس کا ریکارڈ آج بھی مدرسہ کے آفس میں ہوگا۔ جب اس طرح میں ان کی گرفت میں نہ آیا تو مسئلہ عوام الناس کے حوالہ کر دیا گیا، مدرسہ کے وہی نادان خیر خواہ آگے بڑھے اور اس کو عوامی تحریک کی شکل دے دی اور عنوان یہ بنایا گیا کہ مدرسہ میں ایک وہابی دیوبندی عرصہ پندرہ سال سے ہمارے بچوں کے عقائد خراب کر رہا ہے اسکو فوری طور پر الگ کر دیا جائے اسکے ایسے اور ایسے عقائد ہیں، یہ شورش عام ہو گئی تو مجلس انتظامی کو بہانہ مل گیا اس نے

تا تحقیقات مجھ کو مدرسہ کی خدمات سے معطل کر دیا۔ یہ تعطل کم و بیش دو سال کا وقفہ تھا۔

اس عرصے میں میرے عقائد کی تحقیقات کے لئے تین کمیشن قائم کئے گئے اور ہر کمیشن میں مخالفین کی جانب سے میرے خلاف بیانات قلمبند کروائے گئے اور پھر مجھ سے ان کی جواب دہی لی جاتی رہی۔ یہاں اُن الزامات و اتہامات کی نقل کا موقع نہیں بہرحال وہ الزام لگایا گیا جو اہلِ بدعت نے ہر دور میں اہلِ سنت کو دیا ہے۔

تینوں کمیشنوں کی آخری رپورٹ یہی تھی کہ الزامات ثابت نہ ہو سکے لہٰذا کیس خارج کیا جاتا ہے۔

عبرت ہی عبرت

آخری کمیشن کا واقعہ بطور عبرت نقل کیا جاتا ہے۔

اس تیسرے کمیشن میں میرے خلاف اپنا بیان قلمبند کروانے، تطہیرِ نظامیہ کے روحِ رواں . . . . میدان میں آگئے یہ ایسا اقدام تھا کہ عام طور پر کہا جانے لگا کہ اب اس تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جارہی ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔

اس سہ رکنی کمیشن میں اس مدعی کے بیان کو قلمبند کرنے والے مفتی عظیم الدین صاحب تھے پہلے تو مفتی صاحب نے مدعی کا حلفیہ بیان اسطرح قلمبند کیا (جو اپنے نئے کپڑوں میں عطر لگائے آنکھوں میں سرمہ لگائے تشریف فرما تھا)

"میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مدعیٰ علیہ (محمد عبد الرحمن) کے بارے میں جو بھی کہوں گا وہ بالکل سچی بات ہوگی۔"

اس کے بعد مفتی صاحب نے اُن سے تین سوالات کئے۔

سوال ۱: مدعیٰ علیہ کا کیا نام ہے ؟
جواب: محمد عبد الرحمٰن ۔
سوال ۲: کیا آپ مدعیٰ علیہ کو جانتے ہیں ؟
جواب: ہاں خوب جانتا ہوں یہ وہابی دیو بندی ہے جو مدرسہ نظامیہ میں حدیث پڑھاتا ہے ۔
سوال ۳: موصوف کے بارے میں آپ کو کیا اعتراض ہے ؟
جواب: عبد الرحمٰن بد عقیدہ وہابی ہے، دیو بندی ہے، معراج شریف کا انکار کرتا ہے، درود و سلام کا مخالف ہے، بزرگوں کی توہین کرتا ہے، کشف و کرامات کا منکر ہے۔ اولیاء اللہ کو تسلیم نہیں کرتا، نذر و نیاز اور فاتحہ کا قائل نہیں، امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا انکار کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد شریف کو بدعت کہتا ہے، معراج شریف منانے سے منع کرتا ہے زیارت، دسواں، چہلم کو بدعت کہتا ہے، عرس شریف کا مخالف ہے، دیوبندی تبلیغی جماعت کا آدمی ہے، شہر میں وہابی مولویوں کے وعظ کرواتا ہے مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرتا ہے۔ سنی مسلمانوں کے عقیدے خراب کر رہا ہے، فرض نمازوں کے بعد فاتحہ پڑھنے کو بدعت کہتا ہے، مساجد میں سلام بحضور خیر الانام پڑھنے کو بدعت کہتا ہے اس کے عقیدے نہایت خراب ہیں وغیرہ وغیرہ۔
ایک طویل فہرست تھی بعض الزامات کو دوبارہ سہ بارہ لکھوایا۔ مفتی صاحب نے کہا یہ الزام تو آپ نے لکھوا دیا ہے کوئی اور ہو تو کہو؛ اس پر سختی سے کہا کرتا پھر لکھو، ایک ایسے ہی موقع پر مفتی صاحب اور اس مدعی میں تلخ کلامی ہو گئی صدر کمیشن نے مداخلت کی اور مفتی صاحب سے گزارش کی کہ لکھ لیا جائے ۔
مجھے خوب یاد ہے رجسٹر سائز کے دو صفحات پُر ہو گئے تھے پھر بھی ختم کرنے کا

نام نہیں لیتا تھا۔ آخر صدر کمیشن صاحب نے اس بیان کو ختم کروایا اور آخر میں مدعی سے دستخط کروا لیے۔

اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا کیا آپ مدعی کے اس بیان پر جرح کریں گے؟

میں نے کہا ضرور کروں گا۔

پھر مدعی سے فرمایا، مولوی عبد الرحمٰن صاحب آپ کے الزامات پر چند سوال کرنا چاہتے ہیں۔

کہنے لگا ایک بدعقیدہ وہابی سے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔

صدر کمیشن نے کہا تو پھر آپ کا مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔ صرف الزامات پر فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

مدعی کے ساتھیوں نے اشاروں سے ہدایت کی کہ راضی ہو جائیے ورنہ معاملہ نازک موڑ اختیار کرلے گا۔ چنانچہ اُس نے ہاں کر لی، پھر تو غریب اپنے گڑھے میں خود گر پڑا۔ پہلے تو میں نے مدعی کا نام اور پیشہ دریافت کیا پھر نہایت متانت سے پوچھا۔

سوال ۱: برادرم مجھ سے آپ کی پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟

جواب:۔ میں تم سے کیوں ملاقات کروں، میں تو تم کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

سوال ۲:۔ ٹھیک ہے پھر آپ مجھ کو کس طرح جانتے ہیں؟

جواب: یہیں مدرسہ نظامیہ میں آتے جاتے دیکھا ہے۔

سوال ۳:۔ ایک اور سوال ہے شہر کی مساجد میں میرے وعظ اور درس کے حلقے ہوا کرتے ہیں کیا آپ نے میرے کسی وعظ یا درس میں شرکت کی ہے؟

جواب:۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔ میں وہابیوں کا وعظ سنا نہیں کرتا۔

سوال ۱۷: محترم آخری سوال ہے۔ جب آپ نے مجھ سے کہیں ملاقات ہی نہیں کی اور نہ بات چیت کی ہے اور نہ وعظ و درس سنا ہے اور نہ مدرسہ نظامیہ کے علاوہ کسی اور جگہ دیکھا ہے تو بتائیے کہ میرے یہ اعتقادات جو آپ نے قلمبند کروائے ہیں آپ کو کیسے معلوم ہوئے؟

میرے اس آخری سوال پر وہ دم بخود ہوگیا، غالباً آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور سینہ تنگ ہوگیا میں نے اپنا سوال پھر دہرایا، سنبھل کر کہنے لگا اس سے کیا مطلب کہ مجھ کو یہ کیسے معلوم ہوا، تمہارے تو یہی عقیدے ہیں۔

میں نے کہا مجھکو یہی تو دریافت کرنا ہے کہ تم کو میرے عقیدوں کی یہ تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟

جھنجھلا کر بڑبڑاتے ہوئے مجھ سے ہی سوال کرنے لگا کہ کیا تیرا یہ عقیدہ نہیں ہے؟ یہ عقیدہ نہیں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس موقع پر صدر کمیشن نے مداخلت کی اور مدعی سے کہا تہذیب و شرافت سے بات کرو، مولوی عبدالرحمٰن صاحب آپ سے یہ دریافت کررہے ہیں کہ جب آپ نے اُن سے کبھی ملاقات نہیں کی اور نہ وعظ سنا ہے اور نہ ان کے حلقۂ درس میں شرکت کی ہے تو پھر آپ کو مولوی صاحب کے یہ تفصیلی عقیدے کیونکر معلوم ہوئے؟

مثل مشہور ہے جھوٹے کو عقل نہیں ہوتی، صدر کمیشن سے الجھ پڑا ایک مرتبہ اپنی کرسی اٹھالی، معلوم نہیں کیا ارادہ تھا؟ قریب کے لوگوں نے مداخلت کی اور سمجھا منا کر ٹھنڈا کیا پھر مفتی صاحب نے جو تفصیلی بیان قلمبند کررہے تھے، نرمی سے سمجھایا کہ اگر آپ اپنے الزامات ثابت کرنا چاہتے ہوں تو مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے سوال کا جواب دو ہم آج ہی فیصلہ کردیں گے مفتی صاحب

سُنے اس ترغیب نے اُس کے خون میں حرارت کا کام کیا۔ کہنے لگا عبدالرحمٰن کے بدعقیدوں کی گواہی سارا شہر دے گا اگر آپ کہیں تو کل ہی سینکڑوں گواہوں کو پیش کردوں گا۔

مفتی صاحب نے فرمایا یہاں آپ کی گواہی لی جارہی ہے، آپ کی صداقت کے لئے ہم کسی کی گواہی نہیں چاہتے، آپ نے گواہی دی وہ لکھ لی گئی ہے اب اس کا ثبوت پیش کرو۔

مفتی صاحب کے اصل کلمات یہ تھے: "ہم آپ سے شہادت طلب کررہے ہیں شہادۃ علی الشہادۃ نہیں"

اب مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے سوال کا جواب دو وہ کہتے ہیں کہ آپ کا بیان جھوٹا ہے کیونکہ جب آپ نے اُن سے کبھی ملاقات نہیں کی اور نہ ان کا وعظ سنا ہے اور نہ ان کے درس میں شرکت کی ہے تو پھر آپ کو اُن کے عقیدے کس طرح معلوم ہوئے ہیں؟

غریب مجبور و بے بس ہوگیا، کچھ جواب بھی بن نہ پڑا، سکتہ طاری ہوگیا، اِدھر اُدھر دیکھا پھر بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

ثُمَّ نَظَرَ۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔

(المدثر۔)

تیسرے کمیشن کی کہانی ختم ہوگئی، یہی فیصلہ دیا گیا کہ الزامات بے ثبوت ہیں لہٰذا کیس خارج کیا جاتا ہے۔

ایک خفیہ چال

جب یہ عوامی تحریک دم توڑنے لگی اور اسکے تانے بانے بکھر گئے، ردِّ عمل کے طور پر مشائخ کے حلقوں میں اضطراب پیدا ہوا، بعض انتہا پسندوں نے مشورہ دیا کہ یہ طفلانہ کھیل کب تک؟

صدر انتظامی کمیٹی کو اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرنے چاہئیں اور اس طویل نزاع کا خاتمہ صدر کی تمیز اختیاری پر منحصر ہے۔ بعض دوسروں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اسطرح کے اقدام سے عدالتی کاروائی کا آغاز ہوسکتا ہے اور مسئلہ مزید طوالت اختیار کرے گا،

یہ افواہیں جاری و ساری تھیں کہ شہر کے ایک نامی منامی نور المشائخ نے شہر کے مشائخ کو جمع کیا اور صورت حال پر بحث کی، پھر اس دو سالہ کاروائی کے انہدام کا اختیار اپنے ذمہ لے لیا۔ اس پردہ اور اُن کے ساتھی مطمئن تھے کہ چشم زدن میں عمارت ڈھیر ہو جائے گی۔

وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔

(انفال آیت ۳۰)

"اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔"

پھر انہی نور المشائخ نے اپنے لخت جگر جانشین اور نیک نہاد داماد دسلمہٗ کو ضروری ہدایات دے کر مدرسہ نظامیہ روانہ کیا، دونوں لائقوں نے انجمن طلبہ کے ذمہ داروں سے کھل کر بات کی اور یہ مطالبہ کیا کہ مولوی عبد الرحمٰن کو مدرسہ سے علیحدہ کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ مدرسہ کے طلبہ کو آمادہ کیا جائے کہ موصوف کے درس و تدریس پر عدم اعتماد کا اظہار کردیں اور کلاسوں کا بائیکاٹ شروع کردیں۔ ان بزرگوں کے اپنے زعم میں یہ ایک ایسی شاطرانہ چال تھی جو ایسے واقعات میں سو فیصد کامیاب ہوتی ہے۔

جب طلبہ اپنے استاد پر اعتماد نہ کریں اور اس سے مطمئن نہ ہوں تو دنیا کی کوئی بھی عدالت اپیل سننے پر تیار نہ ہوگی۔ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔

گویا یہ ایک بے آواز ضرب تھی۔ دیہاتی مثل کے مطابق "سانپ مرے لاٹھی نہ ٹوٹے" گناہ کرنے والے کو یقین نہیں ہوتا کہ اس کو کوئی غیبی آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور اس کی تدبیر کی تدبیر بھی ہو رہی ہے ایسے ہی کچھ مدرسہ نظامیہ میں ہو رہا تھا انجمن طلبہ کے ذمہ داروں کو دو دن تک اکسایا گیا آخر جو انجام ظاہر ہوا وہ یہ تھا انجمن طلبہ کے ذمہ داروں نے مدرسہ میں اعلان کر دیا کہ:

"مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہمارے استاذِ حدیث ہیں ہم کو علم حدیث جتنا بھی ملا ہے یہ انہی کا فیض ہے۔ لہٰذا جو طالب علم بھی مولانا کے خلاف اس تحریک میں حصہ لے گا مدرسہ ہی کے احاطہ میں اُس کا سر کچل دیا جائے گا"

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔

اللہ ان طلبہ کو علم و عمل سے نوازے اور دنیا و آخرت کی عزتیں اور سرفرازی نصیب کرے، کیا ہی اچھا فیصلہ تھا اور کیا ہی اچھا جذبہ؟

آخر کار نور المشائخ کی تدبیر خود انہی کے اپنے گلے کا پھندا ثابت ہوئی مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا۔ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ، فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ الخ

(النمل آیت ۵۰، ۵۱)

"اور انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی اور اس تدبیر کی اُن کو خبر نہ ہوئی۔ سو دیکھئے اُن کی شرارت کا کیا انجام ہوا" الخ

تنگ آمد بجنگ آمد

مدرسہ نظامیہ سے راقم الحروف کے اخراج کی کاروائی قانونی اور عوامی سطح پر ناکام ہو چکی تھی مجلس انتظامی (انتظامیہ) کو ایک بہانہ چاہیئے تھا، ویسے اندرونی طور پر اخراج کا فیصلہ کر لیا گیا تھا

لیکن وہ عام بدنامی سے بچنا چاہتے تھے۔ ایک خدا کے پوجنے والے کسی بھی ملامت کی پروا نہیں کرتے لیکن جو سینکڑوں خداؤں کو پوجتے ہوں اُن کو ہر خدا کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے وہ کسی کو ناراض کر کے اپنی بدنامی اور بربادی کا اندیشہ نہیں لیتے۔ بہرحال جب الزامات واتہامات کے سارے حربے ناکام ہوگئے تو مشہور کہاوت ہے:

"بلی جب بے بس ہوتی ہے تو حملہ کرتی ہے"

چند غنڈوں کو میرے پیچھے لگا دیا گیا وہ وقتاً فوقتاً آوازیں کسا کرتے تھے تاکہ میں اُلجھ پڑوں تو پھر میری خبر لی جائے لیکن اللہ کی توفیق سے میں بچا رہا۔ اُس کے بعد اُن ظالموں نے میرے ضرب وقتل کا آخری فیصلہ کرلیا یہ ایک انتہائی مایوسانہ وبزدلانہ کارروائی تھی جو کمزور جانور کرتے اور بلی کی کارروائی سمجھی جاتی ہے، ایک نحیف وضعیف انسان جس کا نہ اپنا کوئی جتھہ تھا کیونکر مدافعت کرسکتا تھا، اللہ ہی کی تائید وتوفیق سے چلتا پھرتا رہا، ان ہی ایام میں بار بار مدرسہ نظامیہ آنا جانا ہوا کرتا تھا، مدرسہ کا راستہ پُرپیچ قسم کا تھا۔ ایک دن عین دوپہر کے وقت جبکہ گلی سنسان تھی ایک غنڈہ ہاتھ میں چاقو لئے تیزی سے میرے پیچھے آگیا اب تو یاد نہیں کہ میں نے کیا تدبیر اختیار کی آناً فاناً اپنے آپ کو شارع عام پر پایا، اس عام راستے پر غنڈے کو ہمت نہ ہوسکی وہ فرار ہوگیا۔

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تراست

ہمارے اساتذہ نے ہمیں اچھی طرح تفہیم کی تھی کہ اللہ کی راہ میں ہلاکتوں سے دوچار ہونا انبیاء کرام کی سنت قدیمہ رہی ہے اس لئے ایسے ہنگامے ہمارے لئے باعث فکر نہ تھے، البتہ ایسے ہنگامے نہ ہوتے تو باعث فکر تھا کیونکہ یہ چین وسکون انبیاء کرام کی عام زندگی سے مختلف رہا ہے۔

دورِ تدریسی کا اختتام

سنہ ۱۹۶۱ء تا سنہ ۱۹۷۰ء مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں

راقم الحروف کا تدریسی دور رہا ہے۔ جامعہ مظاہر علوم (سہارنپور) سے ۱۹۵۶ء میں فراغتِ علمی کے بعد جب اپنے وطن حیدرآباد آیا تو قلب میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ جو کتابیں پڑھی ہیں انہیں دوسروں کو پڑھا دوں۔ لیکن شہر میں دور دور تک ایسا امکان نظر نہ آتا تھا کہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ دے سکوں، ان دنوں شہر میں صرف ایک مدرسہ تھا جہاں اپنی اس خواہش کی تکمیل کرا سکتا تھا لیکن اسباب بالکل معدوم تھے۔ کم و بیش دو سال اس غیر یقینی حالات میں گزر گئے۔ دورِ طالب علمی میں دعا کی تاثیر کا بارہا تجربہ پایا تھا، اسباب کے طور پر دعا کرنے لگا، الٰہی کم از کم پندرہ سال درس و تدریس کا موقع عنایت فرما۔

پندرہ سال کی محدود مدت معلوم نہیں کیوں طلب کی آج تک سمجھ میں نہ آئی سوائے اس کے کہ اللہ کی یہی مرضی تھی، بہر حال دعا قبول ہوگئی اور مدرسہ نظامیہ میں تقرر بھی ہوگیا جس کا تفصیلی تذکرہ گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ دُعائی قبولیت کا یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ پندرہ سال بعد مدرسہ سے جبراً قہراً علیحدگی عمل میں آئی۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ

صدر انتظامی کمیٹی نے جو خاندانی خاموش لقب تھے اپنی نسبت سے خاموشی کو بالائے طاق رکھکر ہماری معطلی کو برطرفی میں تبدیل کر دیا جس مقصد کے لئے انہوں نے کرسئ صدارت سنبھالی تھی وہ پورا کر دکھایا۔ تاریخ ۱۴ مئی ۱۹۷۳ء تھی اس طرح سولہ سالہ تدریسی خدمات کا اختتام عمل میں آیا۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ

اختتام کے بعد

مدرسہ نظامیہ سے علیحدگی کے بعد ہمارے دوستوں نے صدر انتظامی کمیٹی کے خلاف عدالتی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لئے شہر کے ایک نامی گرامی وکیل (سپریم کورٹ) کی خدمات

حاصل کی گئیں۔ اس عدالتی کارروائی کے محرک ہمارے مخلص دوست جناب ابراہیم بن عبداللہ مسقطی (موجودہ ایم اے ایل) تھے۔ راقم الحروف تو دو تین سالہ ذہنی و جسمانی تعب و تھکن سے متاثر تھا مزید کسی جدید کارروائی کا متحمل نہ تھا لیکن دوستوں نے یہ بارا پنے دوش پر لے لیا ابتدائی مراحل کے طور پر دونوں جانب سے جواب و جواب الجواب کا سلسلہ چل پڑا۔

دوسری جانب عوامی سطح پر اخبارات میں بیانات، حکایات و شکایات کا سلسلہ تھا۔ اس جدید قبضے سے مدرسہ نظامیہ کے بعض اندرونی خلفشار، مالیہ کا غبن، رقومات کا ناجائز استعمال، اقرباء پروری وغیرہ پہلی بار عامۃ الناس کے سامنے آئے، یہ اندرونی خیانت مقامی اخبارات میں قسط وار شائع ہوتی رہی (ماہ اگست و ستمبر ۱۹۷۷ء کے اخبارات ملاحظہ کیجئے)

جیسا کہ لکھا گیا راقم الحروف کے خلاف مفسدوں کی یہ کارروائی صرف مدرسہ نظامیہ سے علیحدگی کی حد تک نہ تھی بلکہ ان کے ناپاک عزائم اور بھی تھے جن میں ایک مقامی وعظ و درس کے سلسلوں کو بھی بند کرنا تھا جو شہر کی اہم مساجد میں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ عین درس و وعظ کے وقت اختلاف و انتشار مچانے کے لئے بعض جاہل نوجوانوں کو روانہ کیا جانے لگا، یہ وقتاً فوقتاً اثنائے وعظ نعرے بازی اور ہلڑ بازی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے جس پر سامعین کرام قابو پا لیا کرتے تھے۔

مرے کو مارے شاہ مدار

اس سلسلے میں ایک افسوسناک حادثہ یہ بھی پیش آیا کہ شہر میں مرکز تبلیغ کے ذمہ داروں کو ان مفسدوں نے دھمکی دی کہ مرکز تبلیغ کی مسجد (جامع مسجد ملّے پلی) میں محمد عبدالرحمٰن (راقم الحروف) کا درس حدیث و تفسیر بند کر دیا جائے ورنہ

ہم بھی شہر کی مساجد میں تبلیغی جماعت کا داخلہ بند کر دیں گے [۱]

چنانچہ اس شرارت کے دو چار واقعات بھی پیش آئے جس کا شہرہ مرکز دہلی تک پہنچا۔ راقم الحروف نے ان دنوں تھک ہار کر شہر کی ایک مسجد میں امامت کی خدمت اختیار کر لی تھی۔ اس مسجد کے ذمہ دار کرم فرما تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن تھے۔ ان نادان خیر خواہ نے ہمیں نوٹس دیا کہ اکابر تبلیغ کے مشوروں کے بعد یہ طے پایا ہے کہ آپ مرکز تبلیغ کی مسجد میں اپنے وعظ و درس کا سلسلہ بند کر دیں یا پھر موجودہ امامت سے سبکدوشی اختیار کر لیں؟

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

یہ وہ وقت تھا کہ راقم الحروف مالی اعتبار سے نقطۂ انجماد تک پہنچ چکا تھا۔[۲] میں نے افہام و تفہیم کی ممکنہ کوشش کی لیکن میری یہ کوشش ان کے

---

[۱] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ راقم الحروف کے درس حدیث و تفسیر کا تعلق مروجہ تبلیغی جماعت سے وابستہ نہ تھا اور نہ اس کا انتظام۔ یہ ایک مستقل دعوت و تبلیغ تھی جو عہد صحابہ سے آج تک اہل علم حضرات میں جاری و ساری رہی ہے۔

[۲] یہاں یہ بھی حقیقت تھی کہ اس وقت شہر حیدر آباد و سکندر آباد کی تاجر برادری کا ایک اونچا طبقہ راقم الحروف کے شانہ بشانہ تھا جس کو میرے ایک دوست بے تکلفی میں کہا کرتے تھے کہ دونوں شہروں کی کریم آپ کے دونوں ہاتھوں میں ہے۔) ان میں ملک التجار قسم کے حضرات بھی تھے اور اثر و رسوخ والے رئیس و نواب بھی۔ لیکن قارئین میرے اس انکشاف پر چونک پڑیں گے کہ اس پورے عرصے میں کسی نے کبھی میرے گھر کی خبر لی اور نہ میں نے کسی بھی عنوان سے ان حضرات سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔

اُن کے آجانے سے آجاتی ہے منہ پر رونق ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بس ان حضرات سے دعوت تبلیغ کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔ بحمد اللہ میں نے اسکا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

شر میں کچھ اور اضافہ کا باعث بنی اور انہوں نے قطعی اور آخری فیصلہ کیلئے تین یوم کی مہلت عنایت فرمادی۔ وعظ و درس کے یہ سلسلے شہر کی مساجد میں دس بارہ سال سے جاری تھے اور یہ میری دعوت و تبلیغ کے اہم مراکز تھے جہاں سے نوجوان نسل کو دین و ایمان کی روشنی مل رہی تھی۔ موصوف کے اس نوٹس پر میں نے تو یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ امامت چھوڑ کر بے گھر ہو جانا ہزار درجہ بہتر ہے لیکن یہ خیال شدت سے آتا رہا کہ بیمار کو خود اپنا علاج نہیں کرنا چاہیئے میں نے یہ معاملہ اپنے مخلص دوست جناب نعمت اللہ صاحب (آپٹیکل پیلس) کے حوالے کر دیا، موصوف کہنہ مشق تجربہ کار، صاحب الرائے شخصیت ہیں۔ موصوف نے معاملہ کی نزاکت پر مشورہ نہیں فیصلہ دیا کہ فی الحال عارضی طور پر ہی سہی مرکز تبلیغ کی مسجد سے اپنا درس اٹھا لیا جائے چونکہ میں نے اپنا فیصلہ حوالے کر دیا تھا جبراً و قہراً یہ تلخ گھونٹ بھی پی لیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔

یہ حادثہ بھی مدرسہ نظامیہ کی علیحدگی سے کم نہ تھا، رہی سہی قوت ضبط و تحمل بھی معطل ہو گئی اور میں بیمار پڑ گیا۔

شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر
یہ کس کشتۂ بے گناہ کا لہو ہے

اللہ عظیم کا نظام جاہل انسانوں کے طور و طریق سے کس قدر مختلف ہے انسان اپنی کامیابی پر ناز کرتا ہے لیکن تقدیر الٰہی اس پر ردتی ہے، یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ وہ صرف اپنے دست و بازو پر اعتماد کرلیتا ہے اسکو یقین نہیں کہ اللہ علیم و خبیر کی بیدار آنکھیں اسکو دیکھ رہی ہیں۔ مظلوم کا حق ضائع نہیں ہوا کرتا ظلم جسقدر بھی زیادہ ہوتا ہے تائیدالٰہی مظلوم سے قریب تر ہونے لگتی ہے ظالم کا

ظلم تو خود اس کو اپنے انجام تک پہنچا دیتا ہے لیکن اس مرحلہ پر مظلوم کی نئی اور کامیاب زندگی کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ ایسا ہی کچھ راقم الحروف کے ساتھ ہوا ایک بہت بڑا درِ خیر کھلنے والا تھا جس کے لئے راہ کے خس و خاشاک دور ہونے ضروری تھے۔

میزبانِ حرم

انہی ایام میں حجاز مقدس سے ایک مخلص دوست کے سلام و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اظہار محبت و عقیدت کے عنوان میں ہر مکتوب چار چار صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا میں ان مکتوبات کو پڑھ لیتا اور پھر ویسے ہی رکھدیا کرتا۔ جواب دہی کا خیال بھی نہ آتا تھا۔

ماہ شعبان کے آخری دن تھے تراویح میں قرآن سنانے کیلئے بیرون شہر سفر کی فکر میں تھا کہ پھر ایک تفصیلی خط آیا جس میں موصوف کے ایک سوال نے مجھکو جواب دینے کیلئے آمادہ کرلیا۔

سوال یہ تھا:۔ کیا جناب کو بیت اللہ شریف کی زیارت کا اشتیاق نہیں ہے؟

لکھنے والے شہر حیدرآباد محلہ ملک پیٹ کے ایک مخلص عقیدت مند جناب رفعت اللہ عظیم تھے جو چند سالوں سے جدّہ (سعودی عرب) میں مقیم تھے، اس سے قبل موصوف سے کچھ زیادہ راہ و رسم بھی نہ تھی، بہرحال موصوف کا سوال کچھ ایسا چبھتا سا تھا کہ سفر تراویح سے پہلے پہلے مختصر طور پر جواب پوسٹ کردیا۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

عزیزم وعلیکم السلام!

آپ کے سوال نے میرے اشتیاق زیارت میں تلاطم پیدا کردیا وہ کون مسلمان ہے جس کے قلب میں بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی شریف کی زیارت کی تمنا نہ ہو۔ لیکن ہماری مالی حیثیت اسکی

کہاں اجازت دیتی ہے۔ والسّلام

بہرحال خط پوسٹ کرکے تراویح کے لئے بیرونِ شہر چلا گیا۔ ختم رمضان پر جب گھر واپسی ہوئی تو اُنہی کرم فرما کا ایک رجسٹرڈ خط موجود پایا تاریخ ۷ستمبر ۱۹۷۷ء مکتوب تھی۔ اور عبارت کچھ اس قسم کی۔

مجھے بڑی ندامت ہے کہ میں نے آپ سے ایسا بچکانی سوال کردیا اس گستاخی پر خلوص دل سے معافی چاہتا ہوں جبکہ مجھ کو آپ کی مالی حالت کا علم بھی نہ تھا۔ حج ڈرافٹ اور اہل خانہ کے مصارف مرسل ہیں براہ کرم اولین فرصت میں کسی ٹریول ایجنسی سے ربط پیدا فرمائیں۔

اللہ اللہ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔ فجزاھم اللہ خیرًا فی الدنیا والآخرۃ۔

ایام حج شروع ہوچکے تھے سفر حرمین شریفین کے انتظامات مکمل ہوگئے، یکم ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ حیدرآباد سے بمبئی روانہ ہوا پھر وہاں سے ۳ ذوالحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۷۷ء احرام حج کے ساتھ حرم بیت اللہ روانگی عمل میں آئی۔ فَلَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّي حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ۔

حیدرآباد سے چلتے وقت مخلص احباب نے تاثرات حج ارسال کرنے کی خواہش کی تھی۔ فراغت حج کے بعد مولانا رضوان القاسمی صاحب خطیب مسجد عامرہ عابد روڈ کے نام نامی یہ مختصر مکتوب ارسال کیا تھا۔

کرم بالائے کرم حج کی سعادت سے سرفرازی کے بعد مخلص میزبان نے اپنا ایک چونکا دینے والا ارادہ ظاہر کیا کہنے لگے اب ان شاء اللہ آپ کا یہاں مستقل قیام رہے گا واپسی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا، آپ کی جملہ کفالت

میرے ذمے ہو چکی ہے۔

کسی بھی جگہ قیام وطعام کا مسئلہ زندگی کے لوازمات میں شامل ہے میزبان حرم نے طعام کا مسئلہ تو حل کر دیا، قیام کا مسئلہ سعودی عرب میں دنیا کے دیگر ممالک سے بالکل مختلف ہی نہیں پیچیدہ تر بھی ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ ضرور ہوگا لیکن واقعہ یہی ہے کہ راقم الحروف کے لیے حرمین شریفین کے کل دروازے کھل گئے تھے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ

حج کے دو ماہ بعد ۱۹۷۰ء میں حکومت سعودی عرب نے ملک میں اعلانِ عام کر دیا کہ جو لوگ غیر قانونی طور پر مملکت میں مقیم ہیں یا وہ لوگ جو حج یا عمرہ ویزا پر یہاں قیام کر چکے ہیں انہیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ اندرون تین ماہ کسی بھی سعودی کی کفالت پر قیام کی قانونی اجازت (اقامہ) حاصل کر لیں۔ تین ماہ بعد یہ سہولت ختم کر دی جائے گی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔

بحمد اللہ مسئلہ حل ہو گیا، کفیل طعام وکفیل قیام دونوں میسر آگئے، ہمارا قیام قانونی بھی ہو گیا۔ میزبان نے اپنے گھر پر حدیث، تفسیر وفقہ کے دروس کا انتظام کر دیا۔ رات دیر گئے نوجوانوں کی بکثرت آمد ورفت رہا کرتی تھی، گھر کیا تھا ہمہ وقتی مدرسہ بن گیا۔ قیام کے چھ آٹھ ماہ بعد مقامی مسجد کی امامت مل گئی نمازیں تو اسی مسجد میں ادا کی جاتی تھیں لیکن اس مسجد میں کوئی مستقل امام نہ تھا، دو چار مرتبہ ہمیں بھی جہری نمازیں پڑھانے کا موقع ملا، اہل مسجد نے پسند کر لیا اور امامت حوالہ کر دی۔

اس تقرر کے مزید چھ آٹھ ماہ بعد سعودی ایرلائن کے ایک بڑے آفیسر نے جو ہماری اس مسجد میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ بغیر کسی سفارش وگزارش ایئر لائنز کے مرکزی آفس میں لے گئے اور اپنے خصوصی اختیارات کے تحت

تقرر کر لیا۔ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ۔ پھر میں نے اندرون چھ ماہ عربی ٹائپ رائٹنگ کی مشق کر کے سند بھی داخل کر دی۔ حرمین تو کشادہ ہو گئے تھے تیرا عالم بھی کشادہ ہو گیا فَلَکَ الْحَمْدُ یَا رَبَّنَا۔

اس موقع پر یہاں ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے انشاء اللہ اہل ذوق حضرات اس سے اپنی روح میں بالیدگی محسوس کریں گے۔

حرم کشادہ دیدم

راقم الحروف کے ایک مخلص دوست مولانا ارشاد احمد صاحب رئیس المبلغین دار العلوم دیوبند نے اپنے ایک مکتوب میں حرمین شریفین کی اس غیر متوقع روانگی پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور دریافت فرمایا کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے آپ کی اس مقدس منزل کو قریب کر دیا۔

مولانا موصوف کو میری مالی و معاشی حالت کا پورا پورا علم تھا، موصوف کا یہ استعجاب فطری تھا۔ میں نے پہلے تو مولانا کی یاد فرمائی کا شکریہ ادا کیا پھر معذرت کی کہ تفصیل تو انشاء اللہ ملاقات پر ہی ممکن ہے البتہ جناب کے استفسار پر مجھکو حافظ عراقیؒ کا قصہ یاد آیا۔

کہتے ہیں کہ حافظ عراقی زیارت حرمین شریفین کے لئے ہمیشہ بے قرار رہا کرتے تھے لیکن اسباب میلوں دور تھے، پھر اللہ نے فضل فرمادیا تو ذوق و شوق، عشق و محبت میں دیوانہ وار نکل پڑے۔ جب حدودِ حرم کے قریب پہنچے تو کہتے ہیں کہ حرم کا دروازہ بند پایا۔ اس ناگہانی صورت کا تذکرہ وہ اپنی رباعی میں اسطرح کرتے ہیں ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہے ندادند — کہ بیرون چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی
بزمین چون سجدہ کردم ززمین ندا برآمد — کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

(قارئین حضرات کی تفہیم کے لئے ترجمہ پیش کیا جاتا ہے)
(حافظ عراقی کہتے ہیں کہ جب میں بیت اللہ کی زیارت کے لئے پہنچا تو حرم پاک کے دروازے پر روک دیا گیا۔ میں اس ناگہانی صورت پر حیران تھا کہ اندر سے آواز آئی۔ آپ نے بیرونِ حرم اب تک کیا کیا ہے جو اندرونِ حرم آ کر کریں گے؟ واپس جائیے۔ اس عتاب و عقاب پر میں رو پڑا اور زمینِ حرم پر سجدہ ریز ہوگیا، اس پر زمین حرم نے بھی آواز دی او کم بخت تو ناپاک تھا ہی اپنے ریائی سجدہ سے مجھ کو بھی ناپاک کردیا)
مولانا محترم حافظ عراقی کی یہ حکایت اُن کا اپنا وجدان ہے یا اصل واقعہ؟ بہرحال انہیں حرم پاک میں داخل ہونے کی اجازت نہ ملی اور وہ واپس چلے گئے۔ لیکن میرا قصہ کچھ اس سے مختلف ہے میں اپنے قصہ کو انہی کی رباعی کے چار لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کے استفسار کا جواب ہو جائے گا۔

بطواف کعبہ رفتم بحرم کشادہ دیدم — کہ برونِ در تو کردی کہ درونِ خانہ آئی
بزمین چون سجدہ کردم ز زمین ندا برآمد — کہ مرا تو شاد کردی تو بسجدۂ خدائی

(بیت اللہ کی زیارت کے لئے جب میں حرم پاک پہنچا تو حرم کے چاروں دروازے کھلے پائے پھر اندر سے آواز آئی تشریف لائیے، تشریف لائیے۔ آپ نے بیرونِ حرم بہت کچھ کام کئے ہیں اب اندر آجائیے۔ میں اس عظیم استقبال و پذیرائی پر بطور شکرانہ زمین حرم پر سجدہ ریز ہوگیا۔
زمین حرم نے مجھے آواز دی شاد باش تم نے اپنے خدائی سجدہ سے مجھ کو بھی شاد کردیا۔ مولانا بس یہ تھا میرا قصہ۔ فی الحال جناب کے استفسار کا یہی مختصر جواب پیش خدمت ہے۔ باقی تفصیلات عند الملاقات۔ والسلام علیکم

مولانا ارشاد احمد صاحب نے اپنی ایک ملاقات میں مذکورہ رباعی کا تذکرہ کیا اور فرمایا مولوی صاحب اسبابِ سفر کچھ بھی ہوں لیکن آپ کی رباعی نے مجھ کو اپنی گرفت میں لے لیا، اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے کیف وسرور کی ایک حالت تھی جو تین یوم تک چھائی رہی۔

اللہ مرحوم کے درجات بلند کرے صاحب ذوق عالم تھے۔

دمشق (شام) گزشتہ اوراق میں آپ نے "حرم کشادہ دیدم" کے عنوان کے تحت یہ پڑھ لیا تھا کہ قیام حرمین شریفین کے بعد تیسرا عالم بھی کشادہ ہوگیا۔ میری اپنی اصطلاح کے تحت موجودہ زمین کے دو مستقل مقدس عالم ہیں۔ عالم مکہ مکرمہ، عالم مدینہ منورہ ان ہر دو ارض مقدس کے ماسوا زمین کا بقیہ حصہ تیسرا عالم سمجھا جائے گا۔

یہ تیسرا عالم سعودی ائیر لائینز کی ملازمت کے بعد مفتوح ہوا، چنانچہ ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء مطابق ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ دمشق روانگی ہوئی دو یوم کا قیام تھا اس ذہبی فرصت سے فائدہ اٹھا کر راقم الحروف نے "ارض انبیاء" (نبیوں کا وطن) جس کو بعض روایات میں "ارض محشر" (حشر کی زمین) بھی کہا گیا خوب خوب سیاحت کی۔

ملکِ شام انبیاء سابقین کا وطن ہے جہاں ہزاروں انبیاء کرام آرام فرماہیں صحابہ وصحابیات کی خاصی تعداد بھی یہاں کی زمین میں آسودۂ خواب ہے۔ زمانہ طالب علمی میں انبیاء سابقین کی مناحی زیارات بکثرت ہوا کرتی تھیں جس کا تذکرہ ابتدائی صفحات میں آچکا ہے لیکن کبھی یہ وسوسہ بھی تو نہ آیا کہ ایک وقت بیداری میں بھی ان کے مزارات مقدسہ مطہرہ کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی دل ودماغ معطر اور روح کو بالیدگی نصیب ہوگی ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

الجامع الاموی دمشق میں پہلی زیارت جامع اموی کی تھی (دور خلفاء بنو امیہ کی مسجد جو خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ۸۶ھ مطابق ۷۰۵ء میں تعمیر کی، مسجد کی چھت اور ستون لکڑی کے ہیں، تیرہ سو سال گزر چکے ہیں عقل کو تھکا دینے والی بات ہے لکڑی روزِ اوّل کی طرح مضبوط اور صاف ستھری ہے) دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی اور دعا مانگی۔

مزار مبارک سیدنا یحییٰ علیہ السلام جامع اموی کے وسط میں سیدنا حضرت یحییٰ علیہ السلام کی قبر شریف ایک مختصر چوکھنڈے میں موجود ہے کم دراز میں لیکن قدرے اونچی، اُن سب لوازمات کے ساتھ جو ہند و پاکستان کے مزارات کے ساتھ ہوا کرتے ہیں۔

مواجہہ شریف میں کھڑا ہو گیا لیکن سلام کا طریقہ یاد نہ آیا۔ معاملہ عام مومنین کی قبروں کا نہ تھا۔ وہ تو معلوم ہی تھا، سامنے نبی و رسول کا مرقد شریف ہے کن کلمات سے سلام عرض کیا جائے۔ چند لمحات سکوت طاری رہا پھر بے ساختہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ تین بار دُہرایا، دل عظمت و ہیبت الٰہی سے دہل رہا تھا، آنکھوں میں سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا قرآنی تذکرہ ایک ایک ورق کے ساتھ گزرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا رہا کہ سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے دربارِ عالی میں کھڑا ہوں۔ سیدنا یحییٰ علیہ السلام، سیدنا ذکریا علیہ السلام کے صاحبزادے، انکی مضطربانہ دعاؤں کا ثمرہ بطور معجزہ و نشانی پیدا ہوئے ہیں نام بھی آسمان سے نازل ہوا اور یہ نام ایسا نادر و نایاب تھا کہ ان سے پہلے دنیا میں کسی کا بھی نہ تھا۔ طبقۂ انبیاء کرام میں خصوصیت سے "حصور" ایسی شخصیت ہے جو لذات و شہوات دنیا سے

انتہائی دور، نہایت درجہ محتاط و متقی ہو اور جس کو زندگی بھر برا خیال تک نہ آیا ہو مزید خصوصی صفات کے بھی حامل ہیں آپ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی اور عمر شریف میں چھ ماہ بڑے تھے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھا لئے جانے سے ایک سال پہلے ۳۰ء میں یہودی بادشاہ ہیرودیس نے اپنی فاحشہ محبوبہ کی خوشنودی کے لئے شہید کر دیا۔ مشہور یہی ہے کہ آپ کی قبر شریف جامع اموی دمشق ہی میں ہے۔ واللہ اعلم

مقبرہ سلطان صلاح الدین ایوبی

جامع اموی سے متصل عالم اسلام کے فرزند جلیل، مجاہد کبیر، آیۃ من آیات اللہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا مزار شریف ایک خوبصورت عالیشان گنبد میں موجود ہے۔ گنبد کی پیشانی پر تاریخ ولادت ۵۳۲ھ اور تاریخ وفات ۵۸۹ھ مکتوب ہے سلطان مرحوم کے بیٹے عزیز عثمان نے اپنے باپ کا یہ مقبرہ ۵۹۲ھ مطابق ۱۱۹۵ء میں تعمیر کیا ہے۔ مقبرہ اونچی دہلیز پر بنایا گیا ہے سلام اور فاتحہ پڑھ کر کچھ دیر قیام کیا۔ صلاح الدین ایوبی کے زرین و عظیم کارناموں کی یاد نے قلب و جگر میں حرارت اور ایمان و عمل میں نئی روح بھر دی، فضائی خاموشی نے اپنی زندگی کے لئے بہت کچھ غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کیا۔

حضرت حسینؓ کی آدھی قبر

مقبرہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے محاذات میں جامع اموی کی داہنی جانب حضرت حسینؓ کے سر مبارک کی قبر بتائی گئی جہاں شیعہ برادری کے چند افراد یا ویلا وا ویلا کر رہے تھے، ایک شامی بزرگ سے اس قبر کی حقیقت دریافت کی۔ انہوں نے نہایت سادگی سے کہا کہ یہاں یہ بات عوام میں مشہور ہے کہ حضرت حسین بن علیؓ کا سر مبارک اس جگہ مدفون ہے اور جسم کا بقیہ حصہ عراق میں مدفون ہے۔ واللہ اعلم۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اہل مصر کا دعویٰ ہے کہ حضرت حسینؓ کا سر مبارک ہمارے ہاں قاہرہ میں مدفون ہے۔ چنانچہ شہر قاہرہ میں مسجد حسین نامی ایک مشہور مسجد ہے جس کے احاطے میں حضرت حسینؓ کا سر مبارک مدفون ہے جس کی لوگ کثرت سے زیارت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

دمشق کا قدیم قبرستان

قبرستان کیا ہے؟ گلستان یا جواہرستان کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، اس قبرستان میں کیسے کیسے آفتاب و مہتاب مدفون ہیں۔ ان کا علم اللہ علیم و خبیر ہی کے ہاں ہے۔

ع زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

قدیم تاریخ ہی اس کا واحد ماخذ ہے ایسے امور میں اسی کا سہارا لیا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس میں سینکڑوں انبیاء کرام اور صلحائے عظام آسودۂ خواب ہیں نشانات تو بس خال خال ہی ملتے ہیں لیکن قبرستان کی قدامت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقابر کی کئی کئی منزلہ عمارتیں زیر زمین مدفون ہیں

اَللّٰھُمَّ بَرِّدْ مَضْجَعَھُمْ وَنَوِّرْ قُبُوْرَھُمْ

قبرستان کے طول و عرض میں خاموشی اور نہایت پرسکونی کی فضا چھائی رہتی ہے۔ شہر کی وسعت نے قبرستان کو اپنے دامن میں لے لیا ہے قبرستان کی اس زیارت نے شہر دہلی کے قدیم قبرستان شاہ ولی اللہی کی یاد تازہ کردی۔ اس قبرستان نے بھی وسط شہر میں آجانے کے باوجود اپنے پرسکون ماحول و فضا کو ایسا ہی باقی رکھا ہے، گویا وہ شہر سے دور دراز علاقہ میں واقع ہے، دراصل یہ ان مقدس و مبارک نفوس قدسیہ کی آرامگاہ ہے جن پر دن رات انوارات و برکات کا نزول ہوا کرتا ہے۔ دمشق کے اس قدیم قبرستان میں یہ کیفیت دوچند محسوس ہوئی

اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ دَرَجَتَھُمْ۔

مقبرہ سیدنا بلال حبشی رض

سیدنا بلال رض، غلام مسلمانوں میں پہلے مسلمان، مسجدِ نبوی کے پہلے مؤذن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خادم، حجراتِ نبویہ کے پہلے محافظ، راہ خدا میں سب سے پہلے مصائب و آلام کے برداشت کرنے والے، جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق و ساتھی حبشی غلام جن کو سیدنا عمر فاروق رض سیدنا و مولانا کے عظیم القاب سے یاد کیا کرتے تھے وفاتِ رسول کے بعد بے قراری و اضطرار کی حالت میں خاکِ طیبہ سے ہجرت کرکے دمشق چلے گئے تھے اور ۲۰ھ میں اسی انبیاء و صلحا کے جوار میں اپنا ابدی ٹھکانہ بنا لیا۔ میں نے دعا و فاتحہ پڑھی۔ پھر بہت دیر تک مزارِ اقدس پر معلوم نہیں کیوں کھڑا رہا۔ اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ دَرَجَتَہٗ وَبَرِّدْ مَضْجَعَہٗ۔

سیّدنا جعفر طیّار رض

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی، اسلام کے پہلے سفیر، نجاشی بادشاہ کے دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شخصی تعارف بیان کرنے والے، بادشاہ اور اس کے ارکانِ دولت کو اسلام کی پہلی دعوت دینے والے، صاحب الہجرتین (اسلام کی دو عظیم حبشہ اور مدینہ منورہ کی ہجرتوں میں شریک ہونے والے) صحابیٔ رسول خستہ بستہ قبر شریف میں آرام فرما ہیں۔ پہلو میں زوجہ محترمہ سیدہ اسماء رض کی قبر شریف ہے۔

مقابر صحابیات رض

سیدنا علی رض کی صاحبزادی سیدہ زینب الصغریٰ، ام کلثوم رض سیدنا حسن رض کی صاحبزادی سیدہ میمونہ رض سیدنا حسین رض کی تین صاحبزادیاں سیدہ رقیہ رض، سیدہ سکینہ رض، سیدہ فاطمۃ الصغریٰ رض، سیدنا مسلم بن عقیل رض کی صاحبزادی سیدہ حمیدہ رض کی قبریں ایک مختصر احاطے میں موجود ہیں ان سب پر دعا و سلام پڑھ کر انبیاء سابقین علیہم السلام کی گم شدہ قبروں پہ جو

قبرستان کے طول وعرض میں پوشیدہ ہیں بہ ادب واحترام سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ، سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ، سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ کہکر رخصت ہوا۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

قاہرہ (مصر) ۱۹۸۱ء کو اسلامی ممالک کی سیروسیاحت میں قاہرہ بھی شامل تھا، قاہرہ کی تاریخ بھی ماقبل اسلام کی تاریخوں میں شمار ہوتی ہے، ہزاروں سالہ یہ پرانا شہر اپنے عجائبات ونوادرات میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں فراعنہ[1] مصر کے ہزاروں سال پرانے مُردے آج بھی صیحح وسالم حالت میں تماشہ گاہِ عالم بنے ہوئے ہیں۔

اہرام مصر کی سات ہزار سالہ قدیم عمارتیں سیاحوں اور اُوباشوں کی تفریح گاہ بنی ہوئی ہیں۔

جامعہ ازہر اسلامی دنیا کی شہرہ آفاق دینی درس گاہ (جسے اب یونیورسٹی کہنا چاہیئے) موجودہ دنیا کے اسلام کی قدیم ترین درس گاہ ہے۔ اس کا آغاز اور شباب علوم اسلامیہ کا ارتقائی دور سمجھا جاتا ہے یہاں سے بھی رازی وغزالی جیسے علم وفضل کے آفتاب ومہتاب طلوع ہوئے ہیں جن کی شعاعیں اقصائے عالم تک جا پہنچی ہیں۔ اس درس گاہ کا پہلا درس "درس فقہ" تھا۔ ۳۵۹ھ میں اس کی بنیاد رکھی گئی اس کا مؤسس دور فاطمین میں فاطمی سپہ سالار جوہر الصقلی تھا لیکن آج اس درس گاہ کا بنیادی کردار روزِ اوّل کی طرح نہیں بلکہ مختلف ہو چکا ہے اور مستقبل قریب میں ...... ؟

زیرِ مطالعہ کتاب کے ابتدائی حصّے میں آپ نے مبعوث الازہر شیخ عبدالمنعم النمر

---

[1] مصر کے بادشاہوں کا لقب "فرعون" ہوا کرتا تھا، انہی کو فراعنہ کہا جاتا ہے۔

اور شیخ عبدالعال العقبادی کا تذکرہ پڑھا ہے۔ موصوف نے میری اس خواہش پر کہ میں جامعہ ازہر میں اپنے علم کی تکمیل کروں یہ مشورہ دیا تھا کہ تفسیر و حدیث و فقہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور سے بہتر درس گاہ دنیائے اسلام میں اور کوئی نہیں ہے البتہ دیگر علوم اسلامیہ (تاریخ، ادب، فلسفہ، کلام وغیرہ) کے لئے جامعہ ازہر بہترین درس گاہ ہے۔ موصوف کے اس ارشاد کے بعد میں نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا تھا۔

ممالک اسلامی کی سیر و سیاحت کے دوران جامعہ ازہر کی زیارت سے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" مبعوث الازہر کی رائے سے سو فیصد اتفاق ہوا۔ بعض حلقہ ہائے درس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا، دو تین اساتذہ کرام سے بھی استفادہ کرنے کا موقع ملا جامعہ ازہر اپنے دامن میں جہاں بعض قدامت کے آثار رکھتا ہے وہاں جدید عالی شان عمارتیں، بڑے بڑے ہال، کشادہ راستے، باغ و بہار کے مناظر بھی رکھتا ہے لیکن راقم الحروف نے پہلے قدیم درس گاہ کی زیارت کی جو اپنی قدامت و سادگی میں اپنے ابتدائی آثار کی کچھ نشاندہی کر رہی تھی۔ درسگاہ کی زیارت سے قلب و جگر میں علمی تلاطم پیدا ہوا۔ ایک استاذ نے قدیم درسگاہوں کا جغرافیہ بتایا۔

اس کے بعد مفتی ازہر ———— سے ملاقات رہی۔ ذہن میں چند سوالات تھے جو برائے استفادہ جمع کر لئے گئے تھے لیکن مفتی صاحب کی ہیئت کذائیہ نے ذہن کو دوسری جانب موڑ دیا۔ موصوف عمر کے آخری دور میں پہنچے ہوئے تھے، بڑھاپا سارے اعضاء پر چھایا ہوا تھا ۸۰ ـ ۹۰ سال کی عمر ہو گی، بڑی محبت و شفقت سے اپنے قریب بٹھالیا، چہرے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی ڈاڑھی کی شیونگ سے فارغ ہو کر بیٹھے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی
روئے سخن مفروضہ سوالات کے بجائے ابتداءً اسی مسئلہ پر چل پڑا بہت دیر تک افادہ فرماتے رہے۔ موصوف کے افادات میں یہ نایاب تحقیق بھی سننے میں آئی: "ڈاڑھی عہد اسلام سے پہلے ایک قومی تہذیب تھی، جسکو اسلام نے بھی برقرار رکھا ہے۔" اللہ اُن کی، ہماری اور سب کی مغفرت فرمائے۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔

سیدہ زینبؓ بنت علیؓ سیدہ زینبؓ کی قبر شریف وسط شہر کی ایک مسجد کے گوشے میں ہے۔ نماز جمعہ اسی مسجد میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ خطیب کچھ بدعتی سا معلوم ہوتا تھا۔ نماز کے بعد پورا مجمع قبر کے احاطے میں گھس پڑا، قبر کا طواف بھی ہونے لگا، اور مجاوروں کے وارے نیارے بھی چل پڑے، کچھ دیر تک کھڑے کھڑے یہ تماشا دیکھتا رہا پھر دعا و فاتحہ پڑھ کر باہر آ گیا۔

سیدنا عمرو بن العاصؓ شہر قاہرہ سے باہر ایک قدیم مسجد کے گوشے میں فاتح مصر و شام صحابی رسول ﷺ سیدنا عمرو بن العاصؓ کی قبر شریف نہایت سادہ حالت میں موجود ہے، زیارت سے دل کو سکون اور روح کو حرارت محسوس ہوئی ـــــ مسلمانوں نے قبر شریف کا وہ حشر نہیں کیا جو عام طور پر اولیاء اللہ کے مزارات کا کیا کرتے ہیں جسکی بکثرت مثالیں خود قاہرہ میں موجود ہیں، بہت دیر تک قبر شریف کے قریب بیٹھا تاریخ اسلام کے اوراق الٹتا رہا۔ اَللّٰھُمَّ انْشُرْ عَلَیْہِ الْبَرَکَۃَ۔

مقبرہ امام شافعیؒ قدیم شہر قاہرہ کے آخری حصے میں آبادی کے درمیان دنیائے اسلام کے تیسرے امام، مجتہد، فقیہ و محدث

حضرت شافعیؒ نہایت پختہ خوبصورت گنبد میں آسودۂ خواب ہیں عمارت کے اندر فن تعمیر کی گل کاری کا کمال نظر آتا ہے۔ سنگ مرمر کی نہایت نفیس ونازک جالیاں دگل بوٹے شاہی محلّات کو شرمندہ کر رہے ہیں۔ اللہ اُن سلاطین کو معاف کرے انہوں نے اولیاء اللہ کو بخشا نہ تھا ائمہ ہُدیٰ کو بھی نہ چھوڑا جن کی تعلیمات ان آثار ونقش ونگار کے بالکل خلاف ہیں۔ فنا ہونے والے انسانوں کی بقا د تحفظ کے لئے انتظام کر جانا ایک بڑا حادثہ نہیں تو اور کیا ہے؟ امام شافعیؒ اسلام کے اُن ائمہ کرام میں شمار کئے جاتے ہیں جنکی فقہ اسلامی کی اسوقت دنیائے اسلام کی ۱/۴ آبادی تقلید کرتی ہے۔ گنبد کے ایک گوشے پر امام موصوف کے اپنے دو شعر مکتوب ہیں ؎

شَكَوْتُ إِلَى وَكِيعٍ سُوءَ حِفْظِي ۔۔۔ فَأَوْصَانِي إِلَى تَرْكِ الْمَعَاصِي
فَإِنَّ الْعِلْمَ نُورٌ مِّنْ إِلٰهٍ ۔۔۔ وَنُورُ اللهِ لَا يُعْطٰى لِعَاصِي

"میں نے (اپنے استاذ) امام وکیع سے اپنے کمزور حافظہ کی شکایت کی، استاذ نے مجھکو گناہوں سے پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی پھر فرمایا کہ علم دین اللہ کا نور ہے اور اللہ کا نور گناہگاروں کو نہیں دیا جاتا۔"

اللہ اپنے اس خاص بندے پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ سن پیدائش ۱۹۴ھ اور سن وفات ۲۵۶ھ ہے۔

مقبرہ سیّد احمد رفاعیؒ زمانہ طالب علمی میں اپنے اساتذہ سے خاندان سادات کے دُرِ یتیم، نجیب الطرفین، سید الطائفہ شیخ احمد رفاعیؒ کا تذکرہ سنا کرتا تھا خاص طور پر اُن کا وہ مشہور زمانہ واقعہ کہ انہوں نے حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ اپنے نانا جان و سید المرسلین

صلی اللہ علیہ وسلم) کے روضۂ اقدس پر سلام عرض کرکے بے اختیاری میں اسطرح خطاب کیا تھا:

فِی حَالَۃِ الْبُعْدِ رُوْحِیْ کُنْتُ اُرْسِلُھَا
تُقَبِّلُ الْاَرْضَ عَنِّیْ وَھِیَ نَائِبَتِیْ
فَھٰذِہٖ دَوْلَۃُ الْاَشْبَاحِ قَدْ حَضَرَتْ
فَامْدُدْ یَمِیْنَکَ کَیْ تَحْظٰی بِھَا شَفَتِیْ

نانا جان مسافت کی دوری کی وجہ سے خدمتِ اقدس میں حاضر نہ ہوسکا البتہ ہر روز اپنی روح کو آپ کے چوکھٹ کی قدم بوسی کے لئے روانہ کرتا رہا۔ لیکن آج آپ کا غلام خدمتِ اقدس میں حاضر ہوگیا ہے۔ لہٰذا اپنا دستِ مبارک دراز کیجئے تاکہ اس کو بوسہ دوں۔

خدا جانے کس کیفیتِ ناز میں معروضہ پیش کیا، روضۂ اقدس سے اچانک نورانی ہاتھ ظاہر ہوا جس سے سارا حرم چمک اٹھا۔ سید احمد رفاعیؒ نے بڑھکر بوسہ دیا اور چوکھٹ پر گر پڑے۔

اس وقت حرم نبوی میں ستر ہزار سے زائد زائرین موجود تھے ان میں بغداد کے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی شامل ہیں۔ موصوف نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے سید احمد رفاعیؒ کا مقبرہ ایک وسیع وعریض مسجد کے باب داخلہ پر واقع ہے، قبر شریف نہایت اونچی ہے۔ اطراف لوہے کی جالی سے راستہ بند کر دیا گیا ہے عام لوگوں کو یہاں بھی وہی خرافات کرتے دیکھا ہے جو ہند و پاک کے مزارات میں کیا جاتا ہے۔ سید احمد رفاعیؒ پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں خاندان نبوت کے چشم و چراغ تھے۔

شہر قاہرہ مساجد و مقابر کا شہر معلوم ہوتا ہے مساجد کی اتنی کثیر تعداد کسی

اور شہر میں نہیں دیکھی گئی البتہ پورا شہر اسلامی تہذیب وتمدن سے عاری ہوچکا ہے فرنگیت جہاں مردوں میں عام ہے عورتوں نے اس حد کو بھی پار کرلیا ہے یہاں کی خاتون یورپ کی کسی بھی عورت سے پیچھے نہیں ہے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تکملہ مصر کے غیر اسلامی آثار و نوادرات اور یورپی ممالک کی سیر وسیاحت کا تذکرہ یہاں عمداً ترک کردیا گیا ہے۔ کیونکہ زیرِ نظر کتاب کا یہ موضوع نہیں ہے۔ البتہ ضمناً ایک بات قابل ذکر ہے کہ جب ہم نے اہرامِ مصر دیکھنے کا ارادہ کیا تو ایک مصری نوجوان نے یہ لقمہ دیا تھا کہ آثارِ کفر وشرک کی زیارت سے نورِ ایمان بجھ جاتا ہے۔ میرے رفیقِ سفر صدیقی صاحب نے مزاحاً برجستہ جواب دیا تھا

"ہم مکۃ المکرمہ کے باشندے ہیں واپسی کے فوری بعد خانہ کعبہ سے ایمانی حرارت حاصل کرلیں گے"

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

متفرّقات

تقرر مسجد الہدیٰ (جدہ) گزشتہ اوراق میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ سعودی ائرلائینز کی ملازمت سے پہلے مقامی مسجد میں امامت پر تقرر ہوچکا تھا، اس تقرر کی سرکاری حیثیت اُس وقت ہوئی جب محکمہ اوقاف (جدہ) سے سرکاری مہم کے تحت ائمہ مساجد اور مؤذنین کا باضابطہ انتخاب عمل میں آیا۔

راقم الحروف کو بھی نوٹس ملا کر لَجْنَۃُ الْاِخْتِبَار (تحقیقی کمیٹی) کے

روبرو فلاں تاریخ کو پیش ہو   چنانچہ مقررہ وقت پر محکمہ اوقاف پہنچا
انٹرویو لینے والے عمر رسیدہ بزرگ تھے لیکن لب ولہجہ میں نوجوانوں سے
کہیں آگے، سلفی نظر و فکر کے حامل تھے، طہارت و نماز کے متعلق چند
سوالات کئے، پھر عقیدے کے بارے میں سوال کیا :

مَا مَعْنٰی اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى

"اللہ اپنے تخت پر بیٹھ گیا کا کیا مطلب ہے ؟

یہ سوال اُن قدیم سوالات میں شامل ہے جو دورِ تابعین میں نزاعی و مختلف فیہا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ان جیسے مسائل میں علماء کا ایک طبقہ اہل سنت والجماعت کے نظریات سے جدا ہوگیا۔ بات سیدھی سادھی تھی لیکن اسکو عقل و منطق کی موشگافیوں نے پیچیدہ کر دیا۔ عہد تابعین کے بعد اس پر بحث و مناظرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ان حضرات کا یہ کہنا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ عرش پر تشریف فرما ہو گیا تو زمین و آسمان سے خالی ہو گیا۔ حالانکہ اللہ ہر جگہ ہر وقت موجود ہے۔ اسی طرح جب وہ بیٹھ گیا تو ایک جگہ محدود ہو گیا لیکن اللہ تعالیٰ حد اور حدود سے پاک ہے اسیطرح جب وہ عرش پر بیٹھ گیا تو عرش اللہ تعالیٰ سے بڑا ہوا حالانکہ اللہ سے کوئی چیز بڑی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا الرحمٰن علی العرش استویٰ کا کیا مطلب ہوگا ؟

ایسا ہی سوال امام مالک کی مجلس میں امام سے پوچھا گیا تھا امام صاحب نے اس کا سیدھا سادھا جواب یہ دیا تھا۔

اَلْاِسْتِوَآءُ مَعْلُوْمٌ وَحَقِيْقَتُهٗ ثَابِتَةٌ وَكَيْفِيَّتُهٗ مَجْهُوْلَةٌ وَ
اَلْبَحْثُ عَنْهَا بِدْعَةٌ اَخْرِجُوْا هٰذَا الْمُبْتَدِعَ مِنَ الْمَجْلِسِ۔

"استواء (بیٹھنا) تو ہم جانتے ہیں اور اُسکی حقیقت بھی ثابت ہے البتہ

بیٹھنے کی شکل وصورت سے ہم ناواقف ہیں اور ایسے غیبی امور میں غور وفکر کرنا بدعت ہے (کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اسکو پسند نہیں کیا ہے) (اس کے بعد امام مالکؒ نے فرمایا) لہٰذا اس شریر بدعتی کو ہماری مجلس سے باہر کردو۔ چنانچہ اس شخص کو بیک بینی دوگوش مجلس سے اٹھا دیا گیا بہر حال میں یہ عرض کررہا تھا کہ محکمہ اوقاف کے اس بوڑھے سلفی نے میرا عقیدہ جاننے کے لئے استواء علی العرش کا مطلب دریافت کیا۔

میں نے برجستہ امام مالکؒ کا مذکورہ فتویٰ نقل کردیا جب "أَخْرِجُوا هٰذَا" کے کلمات میری زبان سے نکلنے ہی والے تھے کہ بوڑھے نے میرے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور بس بس کہدیا۔ انٹرویو ختم ہوا اور ہم کامیاب قرار پائے بڑے میاں کے اس عمل پر میں نے تو ہنسی ضبط کرلی: البتہ سامعین حضرات ہنس پڑے۔

بے نصیبی یا بانصیبی

حج کے زمانے میں یہاں عجیب وغریب واقعات پیش آتے ہیں یہ اسلئے کہ زمین کے مختلف حصوں سے مختلف المزاج مسلمانوں کا ایک مقام پر اجتماع ہوتا ہے، عادات واطوار بسا اوقات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

ضلع مرادآباد (شمالی ہند) کے مسلمانوں کی ایک جماعت سے حج کے بعد ملاقات ہوئی، انہیں چند مسائل دریافت کرنے تھے ان میں ایک صاحب جو سنجیدہ قسم کے معلوم ہورہے تھے اچانک برس پڑے۔

کہنے لگے مولانا صاحب یہ کیا بدنصیبی ہے کہ یہاں (حرمین شریفین) کی تمام مساجد میں فرض نمازوں کے بعد امام دعا نہیں کرتا، سلام پھیرتے ہی لوگ اُٹھ کھڑے ہوجاتے ہیں اور امام بھی خاموش بیٹھا رہتا ہے؟

میں نے کہا جناب حنفی مسلک میں بھی امام کو اختیار دیا گیا ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد چاہے تو دعا کرے، چاہے بیٹھے بیٹھے ذکر اللہ کرے، چاہے اُٹھ جائے البتہ دُعا کرنا افضل ہے (کبیری شرح منیۃ المصلی)

لہٰذا یہاں کے امام حضرات اگر دعا نہ کریں تو آپ کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ بھی ایک سنت ہے۔

میرے اس جواب پر بگڑ گئے، کہنے لگے جب دعا کرنا افضل ہے تو کیا یہ بدنصیبی نہیں کہ کبھی بھی دُعا نہ کی جائے؟ ہم تقریباً تین ماہ سے یہاں مقیم ہیں کسی دن بھی کسی ایک نماز کے بعد ہی سہی امام نے دعا نہیں کی، یہ محرومی اور بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے؟

میں نے بطور حکایت کہا ایک عربی شخص ہندوستان گیا تھا، سال بھر قیام کیا اس کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی ہر مسجد میں فرض نماز کے بعد دُعا ضرور کی جاتی ہے کسی دن بھی کسی ایک نماز میں سہی امام نے دُعا ترک نہیں کی، آخر یہ کیا بات ہے کہ فرض نماز کے بعد اُٹھ کھڑے ہوجانے کی ایک سنت پر ایک بار ہی سہی عمل نہیں کیا گیا۔ یہ محرومی اور بے نصیبی نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کو زندگی میں صرف ایک بار بھی ادا نہ کیا جائے؟ بات سمجھ میں آگئی خاموش ہوگئے۔

نکاح وطلاق

ایک ایسے ہی صاحب جو مستشرقین (دانشوروں) سے متاثر تھے اپنے خانگی نزاع میں بیوی کو طلاق دیدی بیوی نے علیحدگی اختیار کرلی لیکن موصوف کو اصرار تھا کہ بیوی کے ساتھ حسب سابق رفاقت برقرار رکھیں گے، جوش وغضب میں زبان کی معمولی سی حرکت پر چالیس سالہ قدیم رشتہ کیسے ختم ہوسکتا ہے؟ راقم الحروف نے پہلے تو ان کی دانشوری کے تانے بانے بکھیر دیئے، پھر یہ سوال کیا:۔

جناب آپ کو زبان کی معمولی سی حرکت پر ۴۰ سالہ قدیم رشتے کا ٹوٹ جانا بہت ہی عجیب وغریب نظر آتا ہے اور آپ کی عقل اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے لیکن آپ کو ۴۰ سال پہلے جبکہ آپ کی ہونے والی بیوی اجنبی، بے تعلق اور غیر خاندان کی تھی آپ کا اس کے قریب جانا تو درکنار اس کو ہاتھ لگانا حتیٰ کہ صرف نظر بھر دیکھنا جرم و بداخلاقی سمجھا جاتا تھا صرف زبان کی معمولی سی حرکت "میں نے قبول کیا" سے یہ سب چیزیں صرف جائز ہی نہیں آپ کا قانونی اور اخلاقی حق بن گئیں آپ کو یہ بات عجیب وغریب نظر نہ آئی؟ اس وقت آپ نے اعتراض نہیں کیا؟ آخر اِسمیں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ اس جواب پر وہ کچھ سوچ میں پڑگئے میں نے پھر کہنا شروع کیا محترم اس کا جواب دینا آپ کے بس کی بات نہیں ہے سنیئے ہم اس کا جواب دیتے ہیں

جناب عالی! جو چیز جس راستے سے آئی اُسی راستے سے چلی گئی، زبان کی حرکت سے حلال ہوگئی تھی تو زبان کی دوسری حرکت سے حرام ہوگئی، آپ تو دانشور ہیں اتنی موٹی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی؟ اس پر وہ کچھ متفکر سے ہوگئے میں نے اُن کی مزید طمانیت کے لئے یہ نکتہ بھی عرض کردیا۔

جناب! بیوی کو طلاق دینے پر آپ کا چالیس سالہ تعلق ختم ہوجانا عجیب وغریب بات نہیں ہے کیونکہ بیوی (عورت) اپنی اصلی حالت (اجنبیت) پر آگئی جو ایک معقول بات ہے البتہ عجیب وغریب بات تو یہ ہے کہ آپ کے دو بول "میں نے قبول کیا" پر اجنبی اور حرام و بداخلاقی کا تعلق جائز و حلال ہوگیا اور معاشرہ میں آپ کے اس عمل کو شریفانہ اور قانونی و اخلاقی عمل تسلیم کیا گیا، لہٰذا اگر تعجب کی کوئی بات ہوتی تو آپ کے نکاح کا معاملہ تھا نہ کہ طلاق کا معاملہ، بہرحال طلاق تو تلوار کا ایک وار ہے جس سے گردن جدا ہوجاتی ہے یہ اور بات ہے کہ مقتول حق پر تھا، یا نہ تھا، یہ تفصیل سنکر موصوف کی ساری

دانشوری بہہ گئی۔ حقیقت تو یہی ہے کہ ان مفلسوں کے ہاں فکر ونظر کی وہ پرواز کہاں کہ آسمانی قانون کی نزاکت و لطافت کو سمجھ سکیں۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

مملکت میں درآمدی ذبیحہ

۱۹۷۷ء میں جب ہم سعودی عرب آئے تھے مملکت میں عام طور پر مغربی ممالک کا درآمد کردہ گوشت ملا کرتا تھا اور یہ صورت آج تک ویسے ہی باقی ہے اگرچہ اس وقت اور آج بھی مقامی ذبح کردہ گوشت وافر مقدار میں دستیاب ہے لیکن عوام کی اکثریت بیرونی گوشت اور ذبح شدہ مرغیوں ہی کو پسند کرتی ہے کیونکہ نسبتاً یہ گوشت سستا ہوا کرتا ہے اور حج کے زمانے میں تو لاکھوں حاجیوں کی یہی غذا ہوا کرتی ہے۔

ایک خالی الذہن آدمی پہلی بار جب مملکت میں آتا ہے تو اسکو یہ صورتحال پریشان کر دیتی ہے اور وہ حلال و حرام کی کشمکش سے دوچار ہو جاتا ہے خاص طور پر اس کے مقامی دوست احباب جو زیادہ محتاط اور صاحب تقویٰ سمجھے جاتے ہیں سختی سے منع کر دیتے ہیں تو ایسے درآمد شدہ گوشت کی حیثیت قابل احتیاط ہی نہیں حرام و ممنوع کی سی ہو جاتی ہے۔

راقم الحروف جس محلہ میں قیام پذیر تھا اس میں ہندوستانیوں خاص طور پر حیدرآبادی نوجوانوں کی کثرت تھی باہمی بول چال میں اسکو حیدرآبادی محلہ کہا جاتا تھا۔ حج کے بعد سب سے پہلے اس مسئلہ سے سابقہ پڑا، بیرونی گوشت کے بارے میں بھانت بھانت کی تحقیقات سننے میں آئیں کہ یورپی ممالک کے گوشت کا کیا اعتبار ہے؟ جبکہ اُن کے ہاں نہ حلال کی تمیز ہے نہ حرام کی، ذبح کرنے والے بے دین ہوا کرتے ہیں۔ اوّل تو وہ لوگ اہل کتاب (جن کا ذبح کردہ

جانور حلال ہے) نہیں ہیں اگر ہوں بھی تو اُن کا ایمان اپنے مذہب پر نہیں ہے، دین بیزار لوگ ہیں۔

وَلو بالفرض ذبح کرنیوالے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بھی ہوں تو اسکی کیا ضمانت ہے کہ وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیتے ہوں؟ اکثر ذبیحہ تو مشین پر ہوا کرتا ہے اسلامی طریقہ سے ذبح نہیں کرتے، جانور کی گردن جدا کردی جاتی ہے۔ بعض حضرات تو یہاں تک کہدیتے تھے کہ یہ یہودی سازش ہے جو مسلمانوں کو حرام غذا فراہم کرتی ہے تاکہ ان کے ایمان خراب ہو جائیں اور وہ اسلام سے پھر جائیں وغیرہ وغیرہ۔

عرصہ دراز تک ایسی ہی باتیں سننے میں آیا کرتی تھیں لیکن دل مطمئن نہیں ہوا کرتا تھا کیونکہ سعودی حکومت اسلامی حکومت ہے اس کا حکمران مسلمان ہے یہاں قرآن وحدیث کی بیشتر عملداری بھی ہے۔ آبادی سو فیصد مسلمانوں کی ہے (سعودی مملکت میں غیر مسلم کو شہریت نہیں دی جاتی) پھر آبادی کا بڑا طبقہ صرف دین پسند ہی نہیں عمل پسندی پر بھی یقین رکھتا ہے۔ یہاں کے علماء میں اسلامی ذبیحہ کے بارے میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔ یہاں کے مقامی علماء اپنی اسلامی نظر و فکر میں بیرون ملک شدت پسندی سے متہم بھی ہیں اس کے باوجود یہاں بیرونی ذبیحہ کا عام رواج ہے۔

راقم الحروف نے اس مسئلہ پر جہاں ہند و پاک کے علماء سے مراجعت کی ہے مقامی علماء سے بھی گفتگو کی ہے ان سب کی معلومات کا قدر مشترک یہی تھا کہ مملکت میں باہر سے درآمد کردہ گوشت حلال اور اسلامی ذبیحہ ہے۔

ان ساری تحقیقات کی روشنی میں راقم الحروف نے مندرجہ ذیل دلائل اخذ کیے ہیں:-

(۱) یہاں کا بادشاہ مسلمان ہے۔
(۲) وہ بیرونی ذبح شدہ جانور کے گوشت کو اپنی مملکت میں درآمد کرتا ہے
(۳) اپنی مسلمان رعایا کو اس کے حلال اور جائز ہونے کی تحریری ضمانت دیتا ہے۔ "مَذْبُوْحٌ بِالطَّرِیْقَۃِ الْاِسْلَامِیَّۃ" ذَبِیْحٌ حَلَالٌ وغیرہ کے الفاظ سے۔
(۴) بیرونِ ملک بادشاہ کا خود اپنا سفارت خانہ اس کا نمائندہ ہے۔
(۵) سفارت خانہ صرف انہی کمپنیوں کو گوشت برآمد کرنے کی اجازت دیتا ہے جو اسلامی ذبح کے پابند ہیں اور ایسی ہی کمپنیوں سے وہ معاملہ کرتا ہے۔
(۶) سفارت خانے کی ایسی کمپنیوں پر نگرانی رہتی ہے جو اسلامی ذبیحہ مملکت کو روانہ کرتی ہیں۔
(۷) اگر کوئی کمپنی اسلامی ذبیحہ کے خلاف عمل کرتی ہے اسکو ہمیشہ کے لئے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ (چنانچہ ایک واقعہ مشہور ہے کہ کسی کمپنی کے خلافِ معاہدہ عمل کرنے پر ہزاروں ٹن گوشت سمندر میں پھینک دیا گیا)
راقم الحروف کا احساس ہے کہ ان دلائل وشواہد کی روشنی میں مملکت کا درآمد کردہ گوشت نہ صرف جائز ہے بلکہ حلال بھی ہے ـــــــ محض شک وشبہ یا عدم معلومات کی بنا پر کوئی چیز حرام نہیں ہوتی، اگر کوئی استعمال نہ کرے یہ اس کا شخصی معاملہ ہے، قانونِ شریعت نہیں ہے۔ مملکت میں درآمد کردہ گوشت کے حرام یا ناجائز ہونے کے لئے کم از کم ایسے حوالے ضروری ہیں جو ہم نے حلال اور جائز کے لئے نقل کئے ہیں۔ حلال چیزوں میں حرام ہونے کا احتمال پیدا کیا جا سکتا ہے تاہم حلال حلال ہی رہے گا، جب تک حرام ہونے کی دلیل

قائم نہ ہو جائے۔

عام طور پر لوگ درآمدی ذبیحہ کو انہی احتمالات و شکوک کی بنا پر استعمال نہیں کرتے ہیں۔ ان کا یہ ذاتی عمل ہے۔ ہم کو قانون شریعت کی پیروی کرنی چاہیئے اور اس کی تبلیغ بھی۔ واللہ اعلم۔

تالیف و تصنیف

جن اسباب کے تحت راقم الحروف نے اپنا وطن چھوڑا ہے اسکی تفصیلات آپ گذشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں سعودی عرب ہو یا متحدہ عرب امارات یا اور کوئی ملک، نقل مکانی کے بنیادی اسباب میں حصولِ معاش کا مقصد نہایت اہم شمار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں ان ممالک کو امن و استقرار کی نعمتوں سے نوازا ہے وہاں فراوانی رزق و دولت سے بھی سرفراز کیا ہے۔

یہاں اُن تمام مسلمانوں کا ذکر کرنا مقصود نہیں جو اِن ممالک میں تلاش معاش کے لئے آتے ہیں البتہ علماء دین اور حفاظ کرام کا تذکرہ مقصود ہے۔ یہ طبقہ بھی یہاں خاصی تعداد میں آگیا ہے اور سلسلہ جاری ہے۔ زیر نظر کتاب کے ابتدائی اوراق میں اہل علم و طلبہ علوم دین کی معاشرہ میں نا قدری اور بے حسی کا ذکر آچکا ہے۔ اس مظلوم طبقے کو علمی فراغت کے بعد حصولِ معاش کا مسئلہ ہر دور میں پریشان کرتا رہا ہے اور مسلمانوں نے ان کی وہ قدر نہ کی جس کے وہ مستحق تھے۔ ایسے نامساعد حالات میں ترک وطن کا فیصلہ جہاں ان کی آسودگی و کشادہ دستی کا سبب بنا وہاں ایک خسارے سے بھی دوچار ہوگئے اِلَّا مَا شَاءَ اللہ۔

دعوت و تبلیغ، درس و تدریس، تصنیف و تالیف کا کام جو اُن کا اپنا حقیقی منصب تھا پیچھے ہو گیا۔ ان کی نقل مکانی کا یہ افسوسناک پہلو بھی ہے۔

اللہ نیک عمل کی توفیق دے۔ آمین
آپ پڑھ چکے ہیں کہ راقم الحروف کی نقل مکانی مذکورہ اسباب کے تحت نہ تھی، اس کے باوجود بعض دوستوں کا احساس کچھ مختلف نہ تھا، إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ۔ میں اسکو اپنے رب کریم کا فضل وکرم سمجھتا ہوں کہ اس نے راقم الحروف کو ایسی صورت سے بچالیا۔ فَلَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّ
بنیادی طور پر جو کام اپنے وطن میں کیا کرتا تھا اس کا سلسلہ یہاں (سعودی عرب میں) بھی جاری رہا، اگرچہ نوعیت کچھ مختلف ہوگئی، درس حدیث، تفسیر، فقہ کے حلقے تو بعینہ باقی رہے البتہ تدریسی سلسلہ یہاں ممکن نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد اس کا نعم البدل تصنیف و تالیف کی شکل میں مہیا کردیا جو اپنے وطن میں ممکن نہ تھا۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي

ہدایت کے چراغ (مصابیح الہدیٰ)

پہلی کتاب جس کی تالیف میں پانچ سال کا وقت صرف ہوا یہ کتاب دو جلدوں میں چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے کتاب کا موضوع قرآنی انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ اور ان کی حیات طیبہ کی تفصیلات پر مشتمل ہے جو قرآن حکیم کے تیس پاروں میں متفرق اور کہیں یکجا طور پر ملتی ہیں۔ نبیوں کی صبر آزما جد وجہد، دعوت و تبلیغ کا عنوان، مصائب و آلام کا ذکر، اقوام کا عمل ورد عمل، آسمانی فیصلے، عذاب و گرفت کی تفصیلات اور وہ نتائج و عبر جو ان واقعات سے متعلق ہیں ہر رسول و نبی کے تذکرے کے بعد یکجا جمع کر دیئے گئے ہیں۔
قرآن حکیم میں اٹھائیس انبیاء کرام کا تذکرہ ملتا ہے ان میں پچیس انبیاء کرام کے نام کی صراحت موجود ہے البتہ تین نبیوں کے نام بیان نہیں کئے گئے صرف ان کا تذکرہ اور واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس لحاظ سے "ہدایت کے چراغ" انبیاء کرام کی قرآنی سیرت کا دوسرا نام قرار پاتی ہے[۱]

انبیاء کرام کے علاوہ بارہ دیگر واقعات کی تفصیل بھی مذکور ہے جو قرآن حکیم نے نصیحت وعبرت کے لئے بیان کئے ہیں۔ اسطرح "ہدایت کے چراغ" میں سیدنا آدم علیہ السلام سے سیدنا خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک چالیس عنوانات میں قرآنی واقعات کا مستند ترین ذخیرہ جمع ہوگیا۔

۲۔ یومٌ عظیمٌ اس کتاب میں قیامت کا قرآنی تعارف نقل کیا گیا ہے، قیامت موجودہ نظام کائناتی کا سب سے بڑا حادثہ ہے اس حادثے کے بعد عالم آخرت کے ابدی نظام کا آغاز ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے توحید اللہ کے مرکزی عقیدے کے بعد جس عقیدے کو بار بار تفصیل سے بیان کیا ہے وہ یہی عقیدۂ آخرت ہے ـــــ آخرت کی پہلی منزل "قیامت" ہے۔

قرآن حکیم میں قیامت کا تذکرہ مختلف ناموں سے بکثرت آیا ہے ان ناموں میں اسماء مفردہ، اسماء مرکبہ اور اسماء جمل پائے جاتے ہیں۔ ناموں کی یہ کثرت دراصل اُس دن کے احوال وحوادث کی نشاندہی کرتی ہے جو

---

[۱] ادارۂ اسلامیات لاہور (پاکستان) نے دو ایڈیشن یکے بعد دیگرے شائع کئے ہیں اور اس کا نام "ھدایت کے چراغ" کے ساتھ جلی عنوان میں "سیرت انبیائے کرامؑ" رکھا ہے۔

اس وقت پیش آنے والے ہیں، گویا ہر نام ایک مستقل قیامت ہے اس طرح قیامت کے نشتر نام قرآن حکیم سے اخذ کئے گئے ہیں اور اُن کی تشریح بھی قرآنی آیات سے کی گئی ہے گویا کتاب "یومٌ عظیم" قیامت کا خالص قرآنی تذکرہ ہے۔ اردو ذخیرہ میں ایسا مواد یکجا نظر نہیں آتا۔ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔
کتاب تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ منتخب دعائیں یہ کتاب قرآن وحدیث کی اُن کامل ومکمل دعاؤں کا مجموعہ ہے جو عالم آخرت کے علاوہ دنیا کی زندگی میں بھی فائدہ دیتی ہیں۔ ایسی جامع اور کامل ترین دعاؤں کو مفید تشریحات کے ساتھ عام فہم زبان میں جمع کردیا گیا ہے، علاوہ ازیں دعاؤں کی قبولیت کے اوقات اور مقامات جن میں دعاؤں کے قبول ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے ۔ وہ پوری تحقیقات کے ساتھ مع حوالہ نقل کردیئے گئے ہیں۔ دعاؤں کی ان مفید تشریحات سے جہاں ان کی اہمیت وضرورت کا علم ہوتا ہے وہاں اُن کی طلب اور درخواست کا بھی شدت سے احساس پیدا ہوتا ہے دنیاوی زندگی کو پرسکون اور بے خطر بنانے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ انشاءاللہ مفید ثابت ہوگا۔ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔

۴۔ قصص الحدیث پانچ سو صفحات پر مشتمل کتاب میں اُن واقعات وحکایات کو جمع کیا گیا ہے جو احادیث کی مستند کتابوں (صحاح ستہ) میں صحابہ کرامؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہیں، احادیث شریفہ کی یہ حکایات وحی الٰہی کی ایک قسم ہیں جو عام تاریخی واقعات وحکایات سے بالکل مختلف ہوا کرتی ہیں۔ تاریخی حکایات تو انسانوں کی مرتب کردہ ہوتی ہیں جن میں جھوٹ

سچ، سیاہ سفید، حذف و اضافہ ہر قسم کی باتیں ممکن ہیں علاوہ ازیں ان واقعات کے نقل کرنے والے نیک و بد، معروف و مجہول، مؤمن، غیر مومن ہر قسم کے ہوسکتے ہیں۔ عام طور پر ان کے ہاں نقل روایات کا کوئی اخلاقی و شرعی ضابطہ نہیں ہوتا بقول شخصے "راوی میگوید" اس کا ماخذ ہوا کرتا ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ واقعہ پیش آنے کے بعد تاریخ مرتب ہوتی ہے لیکن احادیث کے واقعات اور حکایات تاریخ مرتب ہونے سے پہلے آسمان پر محفوظ رہتے ہیں ان کا علم وحی الٰہی کے ذریعہ نبی کو دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے احادیث شریفہ کی حکایات حقیقی اور واقعی حکایات ہوتی ہیں جو سیاہ سفید، جھوٹ موٹ ہر قسم کے عیب سے پاک ہیں۔ کتاب میں ہر واقعہ کے بعد اُس کا ماخذ و صفحہ نمبر لکھدیا گیا ہے، کتاب زیر طبع ہے۔

۵ سکرات سے موت تک یہ ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے جس میں سکرات (علامات موت) سے موت تک پھر موت سے لحد (قبر) تک کے سارے شرعی مسائل سلسلہ وار جمع کر دیئے گئے ہیں۔ فارسی کا مقولہ ہے :۔ "ہرچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" مگر یہ رسالہ اگرچہ قد و قامت میں مختصر ہے لیکن اہمیت و ضرورت میں بہتر، دوسرے معنی میں مسلمان کی زندگی کا رہنما اور اسکا رفیق سفر ہے بیس سال قبل مجلس علمیہ حیدر آباد (انڈیا) کی جانب سے شائع کیا گیا تھا، مزید اضافوں کے ساتھ زیر ترتیب ہے۔

۶ اظہارِ حقیقت یہ کتابچہ راقم الحروف نے تبلیغی خدمات کے عین شباب میں مرتب کیا تھا جبکہ اہل بدعت اور روایتی مشائخ نے مصائب و مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیئے تھے۔ کتابچہ میں بریلوی و بدعتی نظر و فکر اور اُن کے سیاہ کارناموں کی تفصیل خود انہی کی مستند کتابوں سے جمع کر دی گئیں ہیں۔ کتابچہ کے سرورق پر مکتوب یہ شعر اس تعارف کے لئے کافی ہے۔

ـــہ نہ صدمے تم ہمیں دیتے نہ ہم فریاد یوں کرتے
نہ کھلتے رازِ سربستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

اس کتابچہ کی اشاعت پر بریلویت کو جو صدمہ پہنچا وہ اس سلسلے میں تاریخِ دکن کا پہلا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے بریلویت کبھی اتنی برہنہ نہ ہوئی تھی۔ یہ کتابچہ بھی مجلس علمیہ حیدرآباد کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ ؎

۷. کاروانِ حیات ۳۶۰ صفحات پر مشتمل دو حصّوں میں ان مشکلات وحوادث کا تذکرہ ہے جو راقم الحروف کو تحصیل علم میں پیش آئے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصّہ میں تحصیل علم سے فراغت تک کی تفصیلات اور واقعات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے دوسرے حصّے میں تدریسی وتبلیغی جدوجہد، بحث ومناظرہ، توحید وسنت کی اشاعت، شرک وبدعات کی بیخ کنی علمی مذاکرے، دعوت وتبلیغ اور مصائب وآلام کی تفصیلات ملیں گی۔ کتاب کے اصل مخاطب۔ علوم دین کے طلبہ اور اہلِ خدمات شرعیہ ہیں۔ کتاب انہی حضرات کی ہمت افزائی، جرأت وبے خوفی، ایثار وقربانی، دعوت وتبلیغ اور مقصدِ زندگی کی نشاندہی کے لئے مرتب کی گئی ہے، کتاب کے مطالعہ سے جہاں دین کی عظمتیں ورفعتیں ظاہر ہوتی ہیں وہاں عملی زندگی میں انقلاب بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور علمِ دین کا ایک طالب علم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد درس وتدریس، دعوت وتبلیغ ہی اسکی آخری منزل ہے۔

۸. فرامین رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کتاب کی عظمت وشان خود اسکے نام سے واضح ہے۔ اردو ذخیرہ میں اب تک ایسا مجموعہ نظر نہ آیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ـــــ
؎ چند وقتی مصلحتوں کے پیش نظر اسوقت یہ رسالہ ہمارے محترم دوست مولانا شریف حسین صاحب ترمذی کے نام سے شائع کیا گیا تھا

فتاوی پر مشتمل ہو۔ احادیث کی کتابوں میں متفرق طور پر فتاویٰ رسول ملتے ہیں جن میں صحابہؓ کو آپ نے فتویٰ عنایت کیا ہے۔ ایسے تمام فتاویٰ کو مع اصل عبارت (عربی) اردو تشریحات کے ساتھ فرامین رسول ؐ کے نام سے مرتب کیا گیا ہے جو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۹۔ پیامِ قرآنی یہ کتاب راقم الحروف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مقامی اخبار "نوید دکن" میں شائع ہوا کرتے تھے۔ کتاب کے مضامین پانچ عنوانات عقائد، عبادات معاملات، معاشرت، اخلاق پر مرتب کئے گئے ہیں۔ (زیر ترتیب)

اعتذار جیساکہ ابتداءً لکھا گیا یہ کتاب راقم الحروف کی نہ سوانح حیات ہے اور نہ اس نہج پر ترتیب دی گئی ہے۔ سوانح حیات تو بزرگوں کی ہوا کرتی ہے۔ راقم الحروف تو ایک طالب علم ہے علم دوست، علم پسند اور علم پرور، اسی حیثیت سے آپ مذکورہ کتاب کو مرتب پائیں گے۔ کتاب کے اصل مخاطب بھی یہی طالب علم ہیں جنہوں نے تحصیل علم کو اپنا مقصد بنایا ہے۔ مقصد اور مقصد کا حصول اس کے مشکلات و موانعات، عزم و ارادہ، جدوجہد، ایثار و قربانی، ہمت و استقلال، صبر و تحمل، فقر و فاقہ، سب کچھ اختیار کرنے کے بعد بھی علم کا کچھ حصہ مل جاتا ہو تو یہ اللہ کا فضل و کرم ہی شمار ہوگا۔

ناظرین کرام! آپ نے تحصیل علم کی داستان پھر اس کے استعمال کی روئیداد بھی پڑھ لی، کتاب میں یقیناً بعض جماعتوں اور بعض افراد پر نکتہ چینی، زجر و تنبیہ غیظ و غضب کے عنوانات ملیں گے لیکن اس بارے میں یہ حقیقت بھی پیش نظر ہے کہ راقم الحروف نے حتی الامکان شخصیات و ذاتیات سے تعرض نہیں کیا ہے کتاب میں جس پر بھی نقد و تبصرہ ملیگا وہ کسی معین و خاص ذات و شخصیت پر نہیں ہوگا بلکہ فکر و نظر سے تعلق رکھتا ہوگا۔ کفر و شرک کی تو یقیناً مذمت ہوگی، مشرک و کافر انسان کی نہیں، فسق و بدعت

کی توہین تو ہوگی، بدعتی اور فاسق کی نہیں، بے عملی و جہل کی تحقیر تو ہوگی،
جاہل و نادان کی نہیں، جرم و خطا کی گرفت ہوگی، مجرم و خطاکار کی ذات کی نہیں،
ذوات و شخصیات تو اللہ نے ــــ فطرت پر پیدا کی ہیں جسمیں عیب و نقص نہیں،

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (الآیۃ)
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (الآیۃ)

کتاب اسی نظریہ پر مرتب کی گئی ہے جہاں جو کبھی تیر و تبر کے وار چلے ہیں وہ ذوات و شخصیات پر نہیں، افعال و کردار پر کیئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود خطا و نسیان سے کون محفوظ رہا ہے کہ آپ کا یہ خادم رہے گا، لہٰذا نقل روایات، یادداشت انتسابات، حوالہ جات وغیرہ میں بھول چوک، کمی زیادتی، حذف و اضافہ محسوس فرمائیں تو اسکو بشری کمزوری اور یادداشت کی کمی پر محمول فرمائیں براہ کرم اطلاع دینے میں بُخل نہ کیجئے گا۔ انشاء اللہ راقم الحروف کو آپ حق طالب، حق پرست اور حق شناس پائیں گے۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا۔

شکرِ نعمت

کتاب کے خاتمہ پر منعم حقیقی اور مُلہم واقعی کا کس زبان اور کس کلام سے حمد و شکر ادا کیا جائے؟ ادائے شکر کے بعد توفیق شکر کا شکر بھی تو واجب ہوا کرتا ہے۔ شکر کا شکر کر کے کہاں تک کوئی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ شیخ سعدیؒ اسی بے بسی و بے کسی کی فریاد کرتے ہیں۔

ہر نفسے کہ فرو می رود بر دو دو شکر واجب است الخ

جو سانس بھی انسان لیتا ہے اُس پر دو شکر واجب ہو جاتے ہیں ایک سانس لینے کا دوسرا اُسی سانس کے اخراج کا (اگر یہ سانس سینے سے خارج نہ ہو تو دم گھٹ جائے گا) ابھی یہ سابقہ دو شکر ادا نہ ہوئے تھے کہ دوسرا سانس لے لیا گیا جس پر مزید دو شکر واجب ہو گئے، پھر تیسرا چوتھا رات دن مہینے سال گذرتے گئے۔

ایسے نازک وبے بسی کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ورہنمائی ہی کام آتی ہے۔ آپ نے حضورِ رب میں اسطرح اپنی بے بسی کا اظہار کیا وہی بے بسی یہ غلام پیش کرتا ہے :- اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ "اے اللہ میں آپ کی حمد وثناء کرنیسے عاجز ہوں، آپ کی حمد وثناء کے شایانِ شان تو بس وہی الفاظ ہوسکتے ہیں جو خود آپ نے اپنے لئے استعمال کئے ہیں"

اے برون از وہم وقال وقیل من
خاک بر فرقِ من وتمثیلِ من

تصنیف وتالیف کا یہ اہم کام جو ان کمزور ہاتھوں سے پورا ہوا یہ اسی عالم الغیب والشہادۃ کا فضل وکرم ہے۔ اُسی نے اپنے کرم سے چند کتابیں مرتب کرنے کا سلیقہ دیا اور پھران کتابوں کو قبولیت وشہرت دی جو کرم بالائے کرم ہے۔

چھ سال کے مختصر عرصے میں ہندو پاک سے اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں اور سلسلہ جاری ہے۔ ہندو پاک کے شہروں کے علاوہ متحدہ امارات، سعودی عرب، یورپ وامریکہ کے شہروں میں بھی کتابیں پہنچ چکی ہیں اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے

آخر میں اللہ رب العالمین سے دُعا ہے کہ اس حقیر وناچیز اور اس کے اہل وعیال ماں باپ، بھائی بہنوں اور عامۃ المسلمین کو تصنیف وتالیف کے اس "صدقہ جاریہ" میں شامل فرمائے اور حیات دنیا میں صلاح اور حیاتِ آخرت میں فلاح کی نعمتوں سے سرفراز کرے۔ آمین۔ وصلی اللہ وسلم علی سید المرسلین وآلہ وصحبہ اجمعین، وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین۔

خادم الکتاب والسنۃ
محمد عبدالرحمٰن غفرلہ
مسجد الہدیٰ کیلو ۳ طریق مکہ جدہ (سعودی عرب) فون ۶۸۹۶۷۵۹

(ضمیمہ کاروانِ حیات)

آریہ سماج

جن دنوں مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں ہمارا درس و تدریس کا سلسلہ تھا (یہ سلسلہ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۷ء کا رہا ہے) اس خدمت کی انجام دہی کے لئے اپنے مکان محلہ عنبر پیٹ سے محلہ حسینی عَلَم ہر روز تقریبًا بارہ پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ ذریعہ سائیکل طے کیا جاتا تھا، اثنائے راہ شہر کا قدیم کالج (سٹی کالج) بھی ملتا تھا اس کے عقبی حصّے میں کھیل کود کا بڑا میدان تھا (جو اب اسٹیڈیم کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے) اس میدان پر ہندو مذہب کا متعصب فرقہ "آریہ سماج" نے اپنے پچیس ۲۵ سالہ مذہبی جلسہ کے چالیس ۴۰ یومی کیمپ ڈال رکھے تھے۔ اس چالیس ۴۰ یومی جلسہ میں وہ اپنے مذہب کی پوجا پاٹ کے علاوہ آریہ سماجی مذہب کا پرچار بھی کیا کرتے تھے اور ہر روز نئے نئے پروگرام ہوا کرتے، اور بھانت بھانت کے آریہ سماجی سادھو و پنڈت جو شہر بنارس، پٹنہ، ہردوار سے درآمد کئے جاتے نہایت فصیح و بلیغ اُردو میں آریہ سماجی مذہب کی صداقت و حقّانیّت کے لئے بھاشن دیا کرتے۔

یہ میدان اس لئے بھی منتخب کیا گیا تھا کہ پڑوس میں شہر کا قدیم مسلم کالج بھی تھا جس میں مسلم طلبار کی اکثریت زیرِ تعلیم رہی ہے۔

ہندو طلبار کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اپنے مسلم دوستوں کو مختلف

ترغیبات دیگر جلسہ گاہ میں لے آئیں، یہ واقعہ سلطنت آصفجاہی کے زوال (۱۹۴۸ء) کے دس پندرہ سال بعد کا ہے۔

بہرحال آریہ سماج کا یہ پچیس ۲۵ سالہ کیمپ زور وشور سے جاری تھا جیسا کہ میں نے لکھا ہے میرا گزر اسی راہ سے ہوا کرتا تھا ہر روز مختلف عنوانات پر اسلام اور قرآن پر اعتراضات و شکوک وشبہات کی تقریریں کان میں پڑتی تھیں، کبھی کبھی پانچ دس منٹ کے لئے کھڑا ہوجاتا اور پنڈت صاحبان کی دَجَل وفریبی باتوں کو سُن لیتا، تقریر اتنی صاف وشُستہ ہوا کرتی تھی کہ مادرزاد اُردو ادیبوں سے بھی سُنی نہ گئی ہو اور اس پر یہ غضب بھی کہ اُردو، فارسی اشعار کے علاوہ قرآن حکیم کی بیشمار آیات اپنے مذہب کی تائید کے لئے پڑھی جاتی تھیں۔

یہ ایک ایسا پُرفریب عنوان تھا کہ کالج کے کمسن ونوخیز مسلم طلبہ کو بے تکلّف متاثر کردیا کرتا، خدا جانے کتنے مسلم نوجوان متاثر ہوگئے ہوں اس کا علم تو اللہ ہی کے یہاں ہے۔

بہرحال سلطنتِ آصفجاہی تو ختم ہوچکی اور یہ اسلامی ریاست ہندوستان (بھارت) میں ضم ہوچکی تھی اب اِن دَریدہ دَہن پنڈتوں کے مُنھ میں لگام لگانے کا کوئی امکان نہ تھا، جو منھ میں آیا بک دیا۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

زمانہ قدیم سے دکن کے مشائخ کا موروثی نظام تو اپنی گدّی نشینی، پیری مُریدی، نذر ونیاز کے مراسم کا تحفظ رہا ہے، اسلام اور قرآن کی حفاظت اور اسکی سربلندی کا ایسا کوئی تصوّر نہ ان کے ذہنوں میں تھا اور نہ ان کے بڑوں نے اِنھیں ایسا کوئی سبق پڑھایا تھا مقابلہ کرے تو کون ؟

یہی وجہ ہے کہ دکن کی تاریخ میں قبر پرستی کی ترویج تو خوب ہوئی لیکن قرآن واسلام کا بول بالا برائے نام ہی رہا۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعُون۔

ہندو دھرم کی ترویج کے انہی دنوں میں حسب معمول مدرسہ نظامیہ میں طلبہ کو درس دے رہا تھا چند نوجوان مسلم لڑکے درسگاہ میں آگئے. درس کی فراغت کے بعد انھوں نے نہایت ادب ومتانت سے کہا، مولانا اجازت ہو تو کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں؟

میں نے انھیں خوش آمدید کہا، ایک لڑکے نے کہا، مولانا سٹی کالج کے عقبی میدان میں آجکل جو آریہ سماجی کیمپ پڑا ہوا ہے اس میں ہمارے بعض ہندو طلبہ ہمکو بھی شرکت کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں، چارو ناچار کبھی ہمکو بھی شرکت کرنی پڑتی ہے ایسا ہی موقع گزشتہ کل پیش آیا ہم شریک جلسہ ہوئے ایک بنارسی پنڈت "اسلام اور آریہ سماج" کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا دورانِ تقریر اس نے بڑے زور وشور سے دعویٰ کیا کہ اسلام فطری مذہب نہیں ہے جیسا کہ مسلمانوں کا عام خیال ہے بلکہ فطری مذہب تو صرف "آریہ سماج" ہے اور اس کی یہ دلیل ہے کہ جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو بے ختنہ پیدا ہوتا ہے ساتویں روز اس کے ماں باپ اس کا ختنہ کرواکر بچہ کا اسلامی نام رکھدیتے ہیں اور برہما جی (ہندوؤں کا بڑا خدا) کی ناراضی سے بچنے کے لئے جانور ذبح کرکے بھینٹ کردیتے ہیں. (مکّار نے عقیقہ کی توجیہ اس طرح کردی).

پھر اپنی تقریر کے اختتام پر اس پنڈت نے علماء اسلام کو جواب دہی کا چیلنج بھی کردیا. راقم الحروف نے پہلی مرتبہ یہ فریبی عنوان سُنا. اچانک میرے ذہن وفکر کے زاویئے متحرک ہوگئے.

اعتراض گرچہ پُرانا ہے لیکن اس کا عنوان بڑا پُرفریب جدید نوعیت کا تھا، اس سے پہلے نہ کبھی اس طرف ذہن گیا اور نہ غور کرنے کی ضرورت پیش آئی، نوجوان طلبہ تو بہرحال نوخیز خالی الذہن ہیں، چند لمحات کے لئے سکوت طاری رہا طلبہ نے یہ بھی

کہا کہ ہم نے شیخ الجامعہ اور شیخ الادب سے بھی یہ شبہ بیان کیا دونوں حضرات نے جواب تو دیا لیکن ہمارے قلوب کو اطمینان نہیں ہو رہا ہے، پھر طلبہ نے اُن حضرات کا جواب بھی سُنایا۔

بہرحال اس مختصر وقفہ میں جیسا کہ گذشتہ اوراق میں میں نے بارہا لکھا ہے مجھکو ایسے نازک و مشکل وقت میں اللہ عظیم کی دستگیری، بروقت ملتی رہی ہے یہاں بھی یہی صورت پیش آئی۔

مختلف جوابات سے قطع نظر ہو گیا، طلبہ سے کہنے لگا عزیز بچو! تم ہمت کر ڈالو اللہ کا نام لو اور یکبار جلسہ گاہ کے صدر پنڈت سے اجازت لے کر اُس اعتراض کا جواب جلسہ گاہ ہی میں دو اور اپنے خطاب کا اس طرح آغاز کرو۔

"پنڈت صاحبان و حضرات! ہم پورے اعتماد و دلیل سے یہ اعلان کرنے آئے ہیں کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو فطرت پر قائم ہے باقی سارے مذاہب غیر فطری ہیں، خاص طور پر "آریہ سماج" مذہب تو سراسر غیر فطری ہے۔ اور اس کی قوی دلیل یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کے سر پر جٹو نہیں ہوتی بے جٹو پیدا ہوتا ہے پیدا ہونے کے بعد ماں باپ سر مُنڈا کر جُٹو رکھدیتے ہیں اور پھر اُس کا ہندو نام تجویز کر دیتے ہیں، رہا مسلمان بچے کا ختنہ کروانا وہ تو صرف صفائی اور پاکی کے لئے کیا جاتا ہے۔ اسلام و ایمان کے لئے نہیں، چنانچہ آج بھی بہت سے مسلمان بے ختنہ ہیں اور وہ پکے مسلمان ہیں"۔

اُن نووارد طلبہ کے سامنے میرا جواب ختم ہوا طلبہ کے چہروں پر برق جیسی روشنی پیدا ہوئی، کہنے لگے مولانا آج ہی یہ کام انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ طلبہ اپنے ہندو ساتھیوں کے تعاون سے جلسہ گاہ پہنچے اور پنڈت جی سے اجازت لے کر اسٹیج پر اسلام کے

فطری مذہب ہونیکا دعویٰ کر دیا، اور چند منٹ میں فارغ ہو گئے، موجودہ پنڈتوں پر ایسا سکتہ طاری ہوا وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ایک نے کہا یہ اس نوجوان کا جواب نہیں ہے کسی پکّے مولوی نے اسے سبق پڑھایا ہے، لہٰذا اُسی مولوی کو جلسہ گاہ میں بُلایا جائے ہم اُسی سے بات کریں گے، بس قصّہ تمام ہوا۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

ولاحول ولاقوّۃ الّا باللہ۔

بگڑے مذہب کے یہی طور طریقے ہوا کرتے ہیں ان میں حقّانیت کہاں جو جرأت و بیباکی پیدا کرے ؟

ہندو دھرم کے ان پنڈت صاحبان کے لئے ہمارا یہ مذکورہ جواب ہماری نظروفکر میں کوئی زیادہ وزن نہیں رکھتا لیکن ان کے مذہبی تانے بانے بکھیر دینے کے لئے کافی ہے۔

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم

ملحوظہ:۔ ہندو مذہب میں بچّے کے سر کے آخری حصّہ پر بالوں کا ایک مٹّھا چھوڑ دینا ہندو دھرم کی علامت اور اُن کے دین و مذہب کا خصوصی نشان سمجھا جاتا ہے۔ دکنی زبان میں اس علامت کو جُٹّو کہا جاتا ہے۔ اس مذہب کے بڑے بڑے پنڈتوں کے سروں پر آج بھی یہ علامت دیکھی جاسکتی ہے۔

بُوڑھا طالب علم

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب راقم الحروف نے شہر حیدرآباد کی مرکزی مساجد میں حدیث و تفسیر و فقہ کے عوامی دروس کا آغاز کیا ہے یہ سلسلہ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۷ء کا رہا ہے۔ نوجوانوں میں اسکولس و کالجس کے طلبہ کے علاوہ شہر کے

معمر حضرات بھی ان دروس میں پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے ان مختلف مجالس کے شرکاء میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ محلہ بازار گیاٹ کے حاجی محمد ابراہیم صاحب تھے اور سب سے کم عمر طالب علم میاں اصغر سلّمہٗ تھے جو اس وقت سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

مجلس کے بزرگ طالبعلم حاجی محمد ابراہیم صاحب شہر کے ذی اثر و مرفّع الحال شخصیت کے حامل تھے۔ موصوف نے درس کی مجلس میں اپنے آپ کو اس حد تک مٹا دیا تھا کہ اپنا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا، موسم گرمی سردی کا ہو یا باد و باراں ہو، حتّٰی کہ اپنی صحت کا اُتار چڑھاؤ کیوں نہ ہو ہر حال میں شریکِ درس ہوا کرتے۔ ایک دن اثنائے درس اپنا ایک کارنامہ سُنا کر حاضرین مجلس کو رشک و حیرت میں ڈال دیا۔ فرمانے لگے، الحمدللہ میرے ہاں حدیث و تفسیر و فقہ کے اِن چودہ سالہ دروس کا ریکارڈ محفوظ ہے جو مولانا نے "خلاصہ کلام" کے طور پر درس کے آخر میں بیان کیا ہے[1]۔

انہی بزرگ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے جو زیرِ مطالعہ کتاب "کاروانِ حیات" کے موضوع سے متعلّق ہے۔ موصوف نے ۱۹۷۶ء میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج کا سفر کیا، سفر سے پہلے وداعی ملاقات کی اور حج کے ضروری مسائل دریافت کئے یہ انکی سلامتی طبیعت کا ثبوت ہے کہ حج کرنے سے پہلے طریقۂ حج سے واقفیت حاصل کی، آج یہ عام شکایت ہے کہ سینکڑوں حاجی صاحبان بس شوقِ حج میں نکل پڑتے ہیں، قبل از وقت حج کے مسائل معلوم نہیں کرتے اور پھر اپنا حج خراب کر کے واپس ہو جاتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْھُمْ لِصَالِحِ الْاَعْمَال۔

بہر حال یہ بوڑھا طالبعلم حج و زیارت مدینہ سے فارغ ہو کر اپنے وطن آیا اور

---

[1] ۔ درس گاہ کے اس بوڑھے طالب علم کا انتقال ۱۹۹۳ء میں ہو چکا۔ اَللّٰھُمَّ ارْفَعْ دَرَجَتَہٗ وَتَقَبَّلْ حَسَنَاتَہٗ۔

دوسرے ہی دن اپنی اہلیہ کے ہمراہ راقم الحروف کے غریب خانے پر تشریف لایا، عقیدت کا یہ حال تھا جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا، مارے تواضع گویا زمین بوس ہو رہے ہیں. تقریباً یہی حال بوڑھی حاجن صاحبہ کا تھا جو اندرون خانہ اہلیہ کے ساتھ جو موصوفہ کی پوتیوں، نواسیوں کی عمروں سے بھی کم عمر تھیں کیا جارہا تھا، عجیب وغریب نقشہ تھا جو پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا۔

بہرحال حاجی صاحب نے مصافحہ و معانقہ کرنے کے بعد کچھ مکّی و مدنی تبرّکات پیش کئے اور اپنی گفتگو کا آغاز محبّت بھرے انداز میں شکایتاً اس طرح کیا کہ میں چونک پڑا۔

فرمانے لگے مولانا آپ نے جب حج کا ارادہ کر ہی لیا تھا توکم ازکم اپنے اس خادم کو بھی اپنے ساتھ کرلیتے؟ میں نے اپنے سفرِ حج سے پہلے آپ کو مطلع بھی کردیا تھا آپ نے مجھ گنہگار کو اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کیا؟ کیا آپ کا سفر غیر متوقع طور پر اچانک ہوا؟

سوال واضح تھا لیکن میں سمجھ نہ سکا حیرانی سے بزرگ کا چہرہ دیکھنے لگا کہ یہ کیا فرمارہے ہیں؟ اور کس سے مخاطب ہیں؟

میرے تغافل کو دیکھکر کہنے لگے میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ نے حج کی تیاری کرہی لی تھی توکم ازکم مجھے کسی ذریعہ اطلاع فرمادیتے یہ میری بڑی سعادت ہوجاتی کہ میں اپنا سفر آپ کے ساتھ بنالیتا۔

اس وضاحت کے بعد بھی میں حاجی صاحب کا مطلب سمجھ نہ سکا، کیسا حج؟ کیسا ارادہ؟ کہاں کا سفر؟ میں تو حج سے پہلے اور حج کے بعد بھی اپنے شہر حیدرآباد ہی میں پڑا ہوا ہوں، سفر کرنا تو درکنار اپنے موجودہ معاشی حالات میں ارادہ کرنا ہی ممکن نہ تھا، آمدنی تو سدِّ رمق کے طور پر تھی اور وہ بھی غیر مستحکم

میں نے سنجیدگی سے کہا حاجی صاحب کیا آپ نے حج کے دوران مجھکو دیکھا ہے؟
حضرت کے آنکھوں میں اچانک آنسو بھر آئے کہنے لگے دیکھنا کیا ہوتا ہے آپ نے تو میری ایسے وقت مدد کی جبکہ میرا دم گھٹا جا رہا تھا، مجھے تو آپ نے بچا لیا ورنہ میں منیٰ کے میدان میں کسی بھی وقت دم توڑ رہا تھا۔
یہ سُنکر میں پوری طرح سنجیدہ ہوگیا اور کہنے لگا حاجی صاحب کیا واقعہ پیش آیا اور میں نے آپ کی کیا مدد کی ہے؟
آنکھوں سے آنسو گرنے لگے فرمایا دوپہر کے وقت منیٰ کے میدان میں میری بوڑھی اہلیہ گم ہوگئی حاجیوں کے ایک ریلے میں اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ آناً فاناً اِدھر اُدھر ہوگئی، بس معلوم نہیں انسانی موجوں نے اُسے کدھر بہادیا میں چیختا چلّاتا ہی رہا کچھ پتہ نہ چلا، دھوپ سخت تھی عصر تک مارا مارا پھرا کہیں پتہ نہ چلا اس بڑھاپے میں چلتا چلتا بے دم ہوگیا تھک کر ایک خیمے کے سایہ میں بیٹھ گیا، بیقراری نے پھر آمادہ کیا کہ تلاش جاری رکھوں، انسانی سروں کا ایک سمندر تھا جو حدِّ نظر تک بہہ رہا ہے کیا دیکھوں کتنا دیکھوں کہیں نام ونشان نہیں شام ہونے لگی آفتاب غروب ہونے لگا غم وبیقراری دو چند سے سہ چند ہوگئی، ایک اونچے مقام پر کھڑا ہوگیا، بس انسانوں کے سر ہی نظر آرہے ہیں، اس وقت اتنا رونا آیا کہ اپنی پوری زندگی میں اس کا تصوّر نہیں کرسکتا، بار بار خیال آتا کہ بڑھیا کہیں نہ کہیں کچلی گئی ہوگئی، اے اللہ! اے اللہ میری مدد فرما، مجھ پر رحم کر، مجھکو معاف فرما، میں اپنے گناہوں کی معافی کے لئے آپ کے دَر پر حاضر ہوا تھا اے اللہ اپنی ضعیف بندی پر کرم فرما، رات شروع ہوچکی میرا دم گھٹا جا رہا ہے اب میں کسی بھی وقت گر سکتا ہوں، اے اللہ آپ رحم کرنے والے فضل کرنے والے ہیں، اپنے گنہگار بندے پر رحم فرمائیے۔
مولانا! اللہ کے حضور میں میری مناجات ایسے ہی جاری تھی کہ اچانک

آپ میرے پاس آگئے اور کہنے لگے ابراہیم صاحب کیا حال ہے؟ کیوں پریشان ہیں؟ کیا بات پیش آئی؟

یہ سننا ہی تھا کہ میں نے آپ کو بے ساختہ لپیٹ لیا اور کہا مولانا! اہلیہ آج دوپہر سے لاپتہ ہے تلاش کرتے کرتے بے دم ہوگیا ہوں، مولانا اب میں کیا کروں؟ پھر زار وقطار رونے لگا۔

آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا ابراہیم صاحب آپ کی اہلیہ سامنے والے ٹیلے کے پاس بیٹھی آپ کا انتظار کررہی ہیں، جائیے وہ بھی نہایت بے چین ہیں۔ یہ سننا ہی تھا کہ میں آپ کا شکریہ وغیرہ ادا کئے بغیر اس طرف دوڑ پڑا، دیکھا تو واقعی اہلیہ نیم جان بیٹھی ہوئی رہی۔

ملتے ہی دونوں بے تحاشا رو پڑے، میں نے سنبھل کر کہا مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے تمہارا پتہ بتایا ہے چلو مولانا سے ملاقات کریں۔ جب سابقہ جگہ واپس آیا تو آپ موجود نہ تھے۔

یہ قصہ سنا کر ابراہیم صاحب نے فرمایا، مولانا آپ نے میرا انتظار نہ فرمایا میں حج کے سارے ایام میں آپکو دریافت کرتا رہا کسی نے بھی آپ کا پتہ نہ دیا، بس یہی عرض کرنے خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

اس تفصیلی روئیداد پر میرے بھی آنسو گرنے لگے کچھ دیر تک تو اپنے کو سنبھال نہ سکا ضبط کرنا چاہ رہا ہوں لیکن خشیتِ الٰہی اُمنڈ اُمنڈ کر چھارہی تھی معلوم نہیں اتنا رونا کیوں آیا؟

اس وقت حاجی ابراہیم صاحب ستون کی طرح بے حرکت تھے۔

جب کچھ سکون ہوا تو میں نے چاہا کہ واقعہ کی حقیقت بیان کردوں، کشف وکرامات کے عنوان سے ایسے واقعات ملّتِ اسلامی کے ہر دور میں پیش

آئے ہیں، تاریخی کتابوں میں پڑھے لکھے جاتے ہیں۔

بحث ان واقعات سے نہیں ہے اس دنیا میں کیا نہیں ہوا، اور کیا نہیں ہوتا ہے، اور کیا نہیں ہوگا؟ بات اُس وقت نزاکت اختیار کرلیتی ہے جب ان واقعات کو دین وایمان سے وابستہ کرلیا جاتا ہے ایسے وقت نادان انسان اپنے جیسے انسان بلکہ مُردہ انسان تک کو حاضر وناظر، یارو مددگار، نفع وضرر کا مختار اور خُدا جانے کیا کیا سمجھنے لگتا ہے۔ آج جن گمراہ فرقوں میں یا غوث، یا خواجہ، یا داتا، یا دستگیر، یا بندہ نواز، یا علی اَلمدد اَلمدد، اَلاَمان اَلاَمان۔ کے نعرے زبان زد بلکہ ایمان واسلام کا عقیدہ قرار دے لئے گئے ہیں ایسے ہی واقعات اِن کلمات کا سبب بنے ہیں اور توحید پرست مسلمان شرک کی ان عمیق گھاٹیوں میں چکّر لگا رہے ہیں بلکہ لگوائے جارہے ہیں۔

فَسَوْفَ تَرَیٰ إِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ — أَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ أَمْ حِمَارٌ

جب یہ گرد وغبار چھٹ جائے گا تو معلوم ہوگا کہ تم گھوڑا سوار ہو یا گدھا سوار

حاجی محمد ابراہیم صاحب کا مذکورہ واقعہ عام واقعات کی طرح ہوتا تو کوئی بات نہ تھی اس کی حقیقت بیان کرنی ضروری ہے۔ ”کاروانِ حیات“ کے مقصد تالیف کے پیشِ نظر ایسے واقعات کی قرآن وحدیث کی روشنی میں توجیہ کی جانی ضروری ہے اس لئے یہ واقعہ درج کیا جارہا ہے۔ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا۔

الغرض میں نے حاجی صاحب سے کہا جناب! میدانِ منیٰ میں آپ پر اللہ کا فضل ہوا آپ کی دُعا قبول ہوئی، گمشدہ اہلیہ واپس آگئیں آپ پر خیر کے دروازے کھُل گئے، عافیت سے حج کے مراسم پورے ہوئے اور آپ خیریت سے اپنے وطن بھی تشریف لے آئے۔ فلک الحمد یا ربّنا ویا مولینا احمد الشاکرین واللہ اکرین۔

منیٰ کے میدان میں راقم الحروف کی موجودگی اور آپ سے ملاقات جیسے واقعات کو اہلِ علم حضرات نے "لطیفۂ غیبی" قرار دیا ہے جس کا اُردو مفہوم "نصرت الٰہی" سے کیا جا سکتا ہے۔

اہلیہ کی گمشدگی پر آپ نے حضور رب میں جو آہ وزاری، بکاو فریاد کی اور ہر سمت سے نا اُمید ہو کر اللہ واحد و یکتا کا سہارا لیا اور صرف اُسی ایک ذات سے اپنا رشتہ وتعلق وابستہ کر لیا تو اللہ کی رحمت وعنایت شاملِ حال ہو گئی اور اہلیہ کی بازیابی کے لئے وہ صورت پیش آئی جو آپ نے مشاہدہ کیا ہے دنیا میں کسی بھی بندے پر اللہ عظیم کا فضل وکرم دو طریقہ پر ہوا ہے۔

(۱) براہ راست بغیر کسی ظاہر اسباب ووسائل کے۔

(۲) یا اسباب ووسائل کے پردے میں۔

اس طرح جسکو بھی جو کچھ ملا وہ اُنہی دو صورتوں سے ملا ہے قرآنی اصطلاح میں اس کو "سُنّت اللہ" کہا جاتا ہے۔ منیٰ کے میدان میں آپ کو جو نعمت ملی وہ اسباب ووسائل کے پردے میں تھی۔

گمشدگی کی بازیابی کا عام طریقہ تو یہی ہے کہ کسی انسان کی رہبری ورہنمائی سے مقصود حاصل ہو جائے اور چونکہ آپ کو مجھ ناچیز سے مخلصانہ تعلق تھا ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتۂ غیبی کو میری شکل وصورت میں آپ کے پاس روانہ کر دیا تاکہ آپ کو اپنے ایک مخلص سے اُنس کے علاوہ اطمینان بھی ہو جائے اور مقصود بھی حاصل ہو۔

دراصل وہ نُصرت الٰہی تھی جو اضطرار و بے سہارگی کے وقت بندوں پر متوجہ ہوا کرتی ہے۔ غیبی فرشتہ کی بہر حال کوئی نہ کوئی صورت وشکل ہونی ضروری تھی وہ کسی بھی شکل میں دی جا سکتی ہے۔ بس ایسے واقعات کی عام طور پر یہی

حقیقت ہوا کرتی ہے لیکن ان واقعات سے بے علم و مشرک انسان خدا پرستی کے بجائے مخلوق پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان واقعات سے خواہ مخواہ کے عقیدے گھڑ لینا، انسانوں کو انسانی حدود سے آگے بڑھا دینا، حلول و اتحاد کا نظریہ قائم کرنا، مجبور و بے بس انسانوں کے اختیارات کو اتنا اور اتنا بلند تصوّر کرنا کہ وہ اپنی موت کے بعد غیبی طاقتوں کے حامل ہو جاتے ہیں اور وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو اپنی حیات میں کر نہیں پاتے تھے۔ کیسا احمقانہ مضحکانہ، بچکانہ خیال ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجَاہِلِیْنَ۔

پھر حماقت بالائے حماقت یہ کہ ایسے لوگ اولیاء اللہ کی حیات میں ان کے لئے حاضر و ناظر ہونا، دانا بینا ہونا اور نفع و نقصان کے اختیارات ان میں تسلیم نہیں کرتے لیکن جونہی انھیں موت آجاتی ہے دوسرے لمحہ ان میں سب کچھ اختیارات کے قائل ہو جاتے ہیں ابھی چند لمحہ پہلے وہ بے طاقت و مجبور تھے موت کی آغوش میں آتے ہی آزاد و خود مختار ہو گئے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

بریلی عقائد کی فہرست میں، ہم نے پڑھا ہے کہ اولیاء اللہ اپنی وفات کے بعد لاکھوں نہیں کروڑوں درجہ طاقت و اختیارات کے حامل ہو جاتے ہیں اس لئے انھیں پکارا جاتا ہے۔ ان سے مدد طلب کی جاتی ہے، ان کا سہارا ڈھونڈا جاتا ہے۔ ان کا وسیلہ لیا جاتا ہے، ان سے اُمّیدیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔

تفہیم القرآن کا ایک درس

کراچی (پاکستان) کے ایک نجی سفر میں سرِراہ ایک مخلص عقیدتمند جناب علیم الدین صاحب سے ملاقات ہوگئی یہ صاحب شہر حیدرآباد (انڈیا) میں عطر کا کاروبار کرتے تھے ترک وطن کرکے پاکستان منتقل ہوگئے، حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں ہمارے خصوصی میزبان اور ہمارے عوامی درس حدیث وفقہ کے حاضر باش طلبہ میں شمار کئے جاتے تھے۔

جب تک یہ حیدرآباد میں رہے ہیں ہمارے درس وتدریس کے حلقوں میں شاید ہی کسی دن غیر حاضر رہے ہوں، درس کے ان مخصوص ایّام میں اپنی تجارت ومشغولیت کو عملاً معطل کردیا کرتے تھے، اس اہتمام والتزام کی وجہ سے علم وفہم کا وافر حصہ پایا تھا۔

بہرحال یہ کراچی میں اپنے مکان لے گئے، جن عزیز قریب کے ہاں انکا قیام تھا وہ صاحب مقامی جماعت اسلامی کے ذمّہ داروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ موصوف کے مکان پر ہفتہ واری حلقۂ درس بھی ہوا کرتا تھا، موصوف نے نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا اور مختلف مسائل اور افکار پر تبادلۂ خیال کیا، ان مسائل میں تفہیم القرآن کا بھی تذکرہ آیا۔

اس نجی گفتگو میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ آئندہ ہفتہ واری درس میں شرکت کی دعوت دی جائے چنانچہ انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کردیا، اور یہ بھی کہ آئندہ ہفتہ واری درس آپ ہی دیں گے۔

میں نے درس کی نوعیت دریافت کی تو فرمایا، علاّمہ مودودی صاحبؒ کی تفسیر

"تفہیم القرآن" پڑھی جاتی ہے آخر میں احباب آزادانہ تبصرہ کرتے ہیں۔
(جماعتِ اسلامی میں اس چودھویں صدی ہجری کا یہ عام فیشن تھا کہ کسی بھی کتاب کے پڑھے جانیکے بعد شرکاءِ درس اسپر عمومی تبصرہ کرتے ہیں۔ تبصرہ نگار کا پختہ عالم فاضل ہونا ضروری نہیں، عام علم وفہم والا بلکہ بے تکلف اُردو بولنے والا ہونا کافی ہے۔)

میں نے اس مخصوص عنوان پر تو صاف معذرت کرہی دی البتہ اپنی شرکت کا ارادہ ظاہر کیا، محل وموقع کی ایسی نزاکت تھی کہ موصوف نے مجھکو آزادی دیدی کہ آپ جیسا مناسب خیال فرمائیں اختیار کرسکتے ہیں، بہرحال درس آپ ہی کو دینا ہے۔

میں نے ان کی مخلصانہ پیشکش قبول کرلی، وقت مقررہ پر جب میں اُن کے حلقۂ درس میں آیا، ہال بھرا پایا، غالباً خصوصی اعلان کیا گیا تھا۔

مسند درس پر تفہیم القرآن کی خوبصورت جلد رکھی ہوئی تھی، میں تو کچھ اور کہنا چاہتا تھا ذہن اچانک پلٹ گیا، حمد وثنا پڑھکر تفہیم القرآن کھولدی، سورۃ الفاتحہ کی تفسیر سامنے تھی، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر بیان کردی جائے۔

آغاز سے پہلے حاضرین اور میزبان صاحب سے گزارش کی، میری یہ خصوصی گزارش ہر اجنبی ماحول میں ضرور ہوا کرتی ہے۔ بارہا کے تجربے کے بعد میں نے اسکو ضروری خیال کرلیا ہے جس کی وجہ سے ہر قسم کے شور وپکار، اعتراضات، شکوک وشبہات سے محفوظ رہا ہوں اور اپنی بات نہایت اطمینان سے سامعین کے گوش گزار کردیا کرتا ہوں۔

بہرحال میں نے سامعینِ کرام اور میزبان صاحب سے گزارش کی کہ آج کی

اس خاص مجلس میں صرف میری گزارشات سُنی جائیں گی اثنائے درس یا درس کے اختتام پر کوئی صاحب زحمتِ سوال یا استفسار نہ فرمائیں گے۔

اگر اس ضرورت کے لئے میزبان صاحب مناسب سمجھیں تو آئندہ ہفتہ واری مجلس میں "استفساری عنوان" طے فرما دیں انشاء اللہ جواب وہی کی خدمت انجام دی جائے گی، آج صرف میری بات سُن لی جائے۔ میں اُمّید کرتا ہوں کہ اپنے اس نووارد مہمان کی گزارش کو شرفِ قبولیت عطا کیا جائے گا؟

اس کے بعد میں نے سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کی اور ترجمہ سے پہلے اس کا تعارف بیان کیا۔

قرآن حکیم کی یہ جامع صورت اپنے معنیٰ ومفہوم میں ایک مستقل قرآن کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن حکیم نے خود اس سورت کو مستقل قرآن قرار دیا ہے۔

سورۃ الحجر کی آیت نمبر ۸۷ میں یہ ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ۔ الآیۃ

اور ہم نے آپؐ کو سات آیتیں دی جو (نماز میں) مکرّر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔

روایاتِ حدیث میں ہے کہ یہ سورت دو مرتبہ نازل ہوئی اور یہ بھی ذکر ہے کہ جبرئیل امینؑ کے علاوہ ایک ایسے فرشتے کے ذریعہ نازل کی گئی جو خلق کائنات کے بعد پہلی مرتبہ زمین پر اُتارا گیا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کو سورۃُ الشفاء، سورۃ اُمُّ القرآن، سورۃ الوَافِیَہ بھی کہا جاتا ہے۔

تفسیر قرطبی میں اس کے بارہؔ نام لکھے ہیں جو احادیث سے ثابت بھی ہیں۔

ایک روایت میں یہ بات ملتی ہے کہ شیطان ابلیس چار مرتبہ خاص طور پر رویا چلاّیا، جس کو عربی زبان میں "رَنَّۃُ الشَّیطَان" کہا گیا ہے۔ (ڈھاڑیں

مار مار کر رونا۔)

(۱) اللہ نے جب اس پر لعنت کی جب کہ سیّدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(۲) جس وقت وہ اللہ کے غضب کیساتھ زمین پر پٹک دیا گیا۔

(۳) جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

(۴) جب سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی۔

(تفسیر ماجدی بحوالہ تفسیر بقی بن مخلد)

سُورت کا آغاز اللہ کی حمد و ثنا سے ہوا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ ساری تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے عالموں کا پالنے والا ہے۔

کسی خاص متعین نعمت کے مقابلہ میں تعریف کرنے کو شُکر کہا جاتا ہے۔

اور ثنا کسی کی مطلق تعریف کو کہا جاتا ہے۔

اور مدح ایسی تعریف کو کہا جاتا ہے جو کسی خوبی پر کی جائی، چاہے غیر ارادی وصف ہو۔

اور حمد، ایسی تعریف کو کہا جاتا ہے جو خاص و عام اور ہر چھوٹی بڑی نعمت پر کی جاتی ہو۔

اس طرح حمد کا درجہ شکر و مدح و ثنا سے بلند تر ہوا کرتا ہے، حمد کا سزاوار صرف خالق کائنات ہوگا، مخلوقات میں کوئی بھی اِس کا مستحق نہیں، حاکم اگر عادل و منصف ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ اللہ نے صفتِ عدل اس کے اندر رکھی ہے اس لئے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر اور طبیب اگر ماہر و باکمال ہے تو اس کی حقیقت صرف اسقدر ہے

کہ اللہ نے اسے یہ کمال عطا کیا ہے۔ کسی کی شکل وصورت جمیل ہے یا کسی کی عادت وسیرت پاکیزہ ہے تو یہی مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان خوبیوں کو اس میں رکھدیا ہے، تاہم ہر قسم کی تعریف کا استحقاق صرف اللہ عظیم کی ذات عالی کو حاصل ہے۔ کسی بھی مخلوق میں جو بھی خوبی ہوگی وہ عطائی وسرفرازی ہوگی ذاتی وحقیقی نہیں۔

یہ اسلامی عقیدہ کا بنیادی نظریہ ہے جس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا۔ الغرض سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ اوّل سے آخر تک جو جو ہوئی ہیں اور جو ہوتی ہیں اور جو ہونگی اللہ ہی کو لائق ہیں وہی اُسکا مستحق ہے۔

حمد وثنا کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات عالی کا تعارف کروایا ہے۔

وہ ربُّ العالمین ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، فیصلہ کے دن کا مالک ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا پہلا تعارف حنان ومحبّت رحم وکرم کے عنوان سے آیا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی حاکم ومقتدر ہونے کے باوجود نہایت درجہ رحم وکرم، فضل وعنایت والی ہے، دنیا کے حُکّام واُمراء کی طرح نہیں جو اپنے نظام مملکت کو چلانے اور اُس کو مستحکم کرنے کے لئے قانونِ عدل وانصاف کا سہارا لیا کرتے ہیں، سہولت ونرمی کے ساتھ تنگی وسختی بھی ضروری خیال کرتے ہیں، سہولت ونرمی کا معاملہ تنگی وسختی سے بہت کم ہوا کرتا ہے۔

اللہ، رحمٰن ورحیم ہے، اُردو زبان میں رحمٰن کا ترجمہ دشوار ہے۔ یہ لفظ رَحْمَۃٌ سے ماخوذ ہے۔ عربی گرامر کے تحت جو لفظ فَعْلان کی شکل پر آتا ہے اس کے معنیٰ میں زیادتی اور مبالغہ پایا جاتا ہے یعنی ایسی زیادتی جس کے بعد زیادتی کا کوئی درجہ باقی نہ رہے، عربی لغت کی معروف کتاب "تاج اللسان" میں رحمٰن

کے معنیٰ اس طرح لکھے گئے ہیں۔

مَعْنَاهُ عِنْدَ أَهْلِ اللُّغَةِ ذُوالرَّحْمَةِ الَّتِيْ لَا غَايَةَ بَعْدَهَا فِي الرَّحْمَةِ۔

(تمام اہلِ علم کے ہاں رحمٰن کے معنیٰ ایسی رحمت والا جس کے بعد اور کوئی رحمت نہیں)

یہی وجہ ہے کہ جیسے اللہ کا لفظ کسی اور ذات پر بولا نہیں جاتا اسی طرح رحمٰن کا لفظ بھی اللہ کے سوا کسی کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا یعنی عبداللہ یا عبدالرحمٰن کسی کو کہا جائے گا اللہ یا رحمٰن کسی کو نہیں کیا جائے گا (بعض لوگ ناواقفی کی وجہ سے عبدالرحمٰن کو رحمٰن صاحب پکارتے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے عبداللہ کو اللہ صاحب کہا جائے۔)

لفظ رحمٰن قرآن حکیم میں (۵۲) مرتبہ آیا ہے اہلِ علم لکھتے ہیں کہ اللہ اور رحمٰن اسم ذات ہیں باقی تمام صفات ہیں۔

رحیم بھی اسم صفت ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے، عربی میں فَعِیْلٌ کی شکل پر جو بھی اسم آتا ہے اس کے معنیٰ میں خصوصیت کے ساتھ تکرار کی صفت پائی جاتی ہے لہٰذا رحیمٌ کے یہ معنیٰ ہوئے، ایسی ذات جو بار بار رحم کرنے والی ہو، اس لفظی نزاکت کی بناء پر رحمٰن کے معنیٰ نہایت حد درجہ رحم کرنے والا اور رحیم کے معنیٰ بار بار رحم کرنے والا ہوں گے۔

رحمٰن میں شان کرم کی عمومیت ہے کہ وہ مومن و کافر سب کے لئے رحمت والا ہے۔ ہوا، پانی آگ، شجر حجر زمین و آسمان چاند سورج سب انسانوں کے لئے ہیں کیونکہ اللہ کی ذات رحمٰن ہے۔

اور رحیم کے معنیٰ میں خصوصیت و تکرار کے معنیٰ ہیں کہ وہ بار بار رحم کرتا ہے۔

حدیث شریف میں رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَرَحِیْمُھَا مذکور ہے یعنی اللہ کی رحمت دنیا و آخرت دونوں جہاں میں سب کیلئے عام ہے اور رحیم کی صفت آخرت میں اہلِ ایمان کے لئے خاص ہوگی وہاں اہلِ جنّت پر اللہ رحیم کی عنایاتِ خاصّہ اور کرم ہائے عامّہ پے در پے ظاہر ہونگی۔

قرآن حکیم کی آیت وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا۔ الآیۃ (بقرہ آیت نمبر ۲۵) اور دیئے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے۔

شاہ عبدالقادر صاحب محدّثؒ لکھتے ہیں کہ جنّت کے میوے باہم ایک شکل وصورت کے ہوں گے اور مزہ جُدا جُدا۔ تو جب کسی میوے کو دیکھیں گے تو کہیں گے یہ وہی تو قسم ہیں جو ابھی کھا چکے ہیں اور جب چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے، اس طرح لُطف و لذّت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔

حدیث قُدسی میں جنّت کے اِن انعامات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَعْدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ۔ (الحدیث الصحیح)

میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنّت میں ایسی ایسی نعمتیں تیّار کر رکھی ہیں جنکو کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہو اور نہ کسی کان نے سُنا ہو اور نہ کسی بشر کے قلب پر اسکا وسوسہ تک آیا ہو۔

یہ تفسیر تو عام مفسرین بیان کرتے ہیں۔ عہدِ قدیم سے عہدِ جدید تک کی جملہ تفاسیر میں ایسا ہی عنوان ملتا ہے۔

اب عہدِ حاضر کے مفسّر علّامہ مودودی صاحب نے اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں رحمٰن اور رحیم کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے اسکو تفہیم القرآن ہی سے سُنئے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام

کائنات کا رب ہے رحمٰن اور رحیم ہے۔ انسان کا خاصّہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مُبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے اور اگر ایک مبالغہ کا لفظ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شئی کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا پھر وہ اسی معنیٰ کا ایک اور لفظ بولتا ہے تاکہ وہ کمی پوری ہوجائے جو اس کے پاس مبالغے میں رہ گئی۔

اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نُکتہ پوشیدہ ہے۔

رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ ہے لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے اسقدر وسیع ہے ایسی بے حد وحساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑا مبالغہ کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا اس لئے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لئے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیّاضی کے بیان میں "سخی" کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر "داتا" کا اضافہ کرتے ہیں۔ (سخی داتا)۔

رنگ کی تعریف میں جب "گورے" کو کافی نہیں پاتے تو اس پر "چٹّے" کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ (گورا چٹّا)

درازیٔ قد کے ذکر میں جب "لمبا" کہنے سے تسلّی نہیں ہوتی تو اس کے بعد "تڑنگا" بھی کہتے ہیں۔ (لمبا تڑنگا)۔ (تفہیم القرآن جلد ۱ سورۃ الفاتحہ ص ۴۴)

(مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور۔ ایڈیشن نومبر ۱۹۸۱ء)

(بس ایسے ہی کچھ مفہوم الرحمٰن الرحیم کا ہے۔ مؤلّف)

درس کے اختتام پر میں نے یہ چونکا دینے والا فقرہ بھی نقل کر دیا۔

علامہ مودودی صاحبؒ نے اپنی تفسیر کی خصوصیت میں خاص طور پر یہ جملہ لکھا ہے۔

"لفظی ترجمہ کے طریقہ میں کسر و خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کے لئے میں نے "ترجمانی" کا ڈھنگ اختیار کیا ہے کہ اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، "عربی مبین" کی ترجمانی "اردوئے مبین" میں ہو۔"

(دیباچہ تفہیم القرآن جلد ۱ صفحہ ۱۰)

عصر کی اذان ہو چکی، درس ختم ہوا، بعضوں نے اپنے گھر کی راہ لی اور دیگر بعض مسجد میں آگئے، ہفتہ بھر کیا تبصرے رہے اَللّٰہُ اَعْلَمُ۔

البتہ عصر کی نماز کے بعد چائے کی مجلس میں خصوصی احباب میں ایک صاحب قریب تشریف لائے ادب و احترام سے فرمایا مولانا! تفہیم القرآن یہاں بیس بائیس سال سے پڑھی جا رہی ہے اور اس کے کئی ایک دور بھی ختم ہو چکے ہیں، لیکن آج آپ نے تفہیم القرآن کی عجیب و غریب تفسیر سے روشناس کروایا، ہم پہلی بار اس پر مطلع ہو رہے ہیں۔

میں نے کہا جناب! ہند و پاک کے علماء اور دینی و علمی مراکز نے تفہیم القرآن پر (بقول بعض احباب) جو شور مچار کھا ہے وہ دراصل ان جیسے عنوانات و تشریحات پر مبنی ہے، تفہیم القرآن کے ہر ہر لفظ ہر ہر نکتے پر نہیں، تفہیم القرآن کے بعض مقامات قابل مطالعہ اور ایمان افروز بھی ہیں۔

چائے نوشی کی مجلس بھی برخاست ہوگئی اور اکرام کے ساتھ ہمیں اپنے گھر پہنچا دیا گیا۔

ملحوظہ:۔ راقم الحروف جب اپنے وطن انڈیا سے سعودی عرب منتقل ہوا ہے، اصلاً یہ سفر حج کا تھا فراغت حج کے بعد ڈیڑھ دو سال اپنے حجازی میزبان

کے ہاں مقیم رہا اس عرصہ میں تفہیم القرآن کے گہرے مطالعہ کا موقع ملا، ابتک تو تفہیم کے بارے میں سُنی سُنائی باتوں کا علم تھا لیکن براہِ راست مطالعہ کرنے کا یہ پہلا موقع تھا، مطالعہ پر جا بجا علمی وفکری اغلاط، نامناسب تشریحات، ذاتی رائے، اپنا اجتہاد وقیاس سب کچھ پایا، اس وقت میں نے تفہیم القرآن کے وہ مقامات بھی ضبطِ تحریر میں لائے تھے جن پر اہلِ علم حضرات کو شدید اختلاف تھا۔

ایسے تقریباً پچاس سے زائد مقامات ہیں جو یادداشت کاپی میں آج بھی محفوظ ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے اُستاذِ تفسیر مولانا انظر شاہ صاحب سے ایک سفر میں ملاقات ہوگئی اثنائے گفتگو میں نے تفہیم القرآن کے قابلِ اعتراض مقامات کی فہرست بتلائی، موصوف نے فرمایا میں نے بھی چند سال پہلے تفہیم القرآن کے بعض حصّوں کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا اسّی سے زائد مقامات قابلِ اعتراض پایا۔

قارئین کرام کی مزید معلومات کے لئے تفہیم القرآن کے چند اقتباسات نقل کئے جارہے ہیں جو تفہیم کی مقصدِ تالیف اور اسکی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

میں ایک مدّت سے محسوس کررہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں روحِ قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدّعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہوگئی ہے وہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ وہ مترجمین ومفسرین کی قابلِ قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ (تفہیم القرآن جلد ۱ دیباچہ ص ۱)

پھر اسی دیباچہ کے ص ۶ پر لکھتے ہیں۔

میں اس کتاب (تفہیم القرآن) میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر

"آزاد ترجمانی" کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

پھر "آزاد ترجمانی" کا مطلب اور مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں۔

لفظی ترجمہ کے طریقے میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کے لئے میں نے "ترجمانی" کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔

میں نے اسمیں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھکر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے قلب پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کیساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں۔

(تفہیم القرآن دیباچہ صنا)

مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور۔ ایڈیشن نومبر ۱۹۸۱ء

تفہیم القرآن کی اسی خصوصیت و انفرادیت کی بنا پر گذشتہ صدی ہجری کے مشہور نقاد و تبصرہ نگار مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کو یہ تبصرہ و نقد کرنے کا موقع مل گیا۔

تفہیم القرآن کو تفسیر قرآن قرار دینے سے کہیں زیادہ مناسب یہ بات ہے کہ اس کو مودودی صاحبؒ کے افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جائے۔ (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہ)

اے اللہ صاحب تفہیم القرآن پر رحم فرما، اس کی اور ہماری خطا و لغزشوں کو معاف کر، جماعت اور اہل جماعت اور سب مسلمانوں کو صراط مستقیم نصیب فرما، زیغ و ضلال سے ہمیں بچا۔

اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعًا ، وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابًا

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

یہ پاکستان ہے؟

سن عیسوی غالباً ۱۹۸۲ کا تھا اپنے ایک نجی سفر میں کراچی جانا ہوا وہاں اپنے ایک بزرگ دوست اور سلسلہ کے شیخ طریقت سے ملاقات رہی، دن جمرات کا تھا، دوران گفتگو محترم دوست نے دریافت فرمایا، کل نماز جمعہ کہاں ادا کریں گے؟ میں نے کہا انشاء اللہ آپ کی یہی خانقاہ والی مسجد میں:

فرمایا کہ اس مسجد میں نماز جمعہ کا انتظام نہیں ہے قریب کی کسی بھی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرلی جاتی ہے۔

بات آئی گئی اور گفتگو کسی اور موضوع پر چل پڑی لیکن میرا ذہن وفکر بے قرار و پریشان سا ہوگیا دل نے باربار تقاضہ کیا ایسا کیوں؟ ایسا کیوں نہیں؟ آخر کیا مجبوری ہے کہ اپنی مسجد میں نماز جمعہ کا انتظام نہیں جبکہ پانچوں نمازیں مسجد میں ادا کی جارہی ہیں؟

پھر میں نے بات چیت میں مداخلت کرتے ہوئے سوال کرہی دیا۔

سوال کرنا ہی تھا کہ موضوع سخن پلٹ گیا، بزرگ دوست نے ماضی کی ایک تلخ کہانی شروع کی کہ جب ہم اپنی مسجد کی بنیاد رکھ رہے تھے پڑوس کی موجودہ مسجد کے متولی صاحب جو ماشاء اللہ عالم فاضل اور پُرجوش واعظ و مقرر بھی ہیں مداخلت کردی اور حجت یہ پیش کی کہ پڑوس ہی میں اتنی بڑی اور کشادہ مسجد موجود ہے پھر ایک اور مسجد کی کیا ضرورت ہے؟

علاوہ ازیں دوسری مسجد کے قیام کے بعد اذان، اقامت، قرأت و وعظ و تقریر کی آواز ایک دوسرے سے ٹکرائے گی جس سے مصلیوں میں انتشار پیدا ہوگا اور

اختلاف رونما ہونے لگے یہ بات آہستہ آہستہ طوالت اختیار کرگئی اور اصرار و انکار بڑھتا ہی گیا اور افہام و تفہیم کے سارے اسباب بے اثر ہونے لگے اور معاملہ اپنے منطقی نتیجہ پر آ گیا، موصوف اپنی ضد و عناد میں حرب و ضرب کی دھمکیاں دینے لگے ایک موقع ایسا بھی آ گیا کہ بندوقیں باہر نکل پڑیں (ہمارے بزرگ دوست کے صبر و تحمل نے یہ بھیانک صورت پیدا نہ ہونے دی)

اہلِ شہر کے سر برآوردہ حضرات کی مداخلت و مفاہمت سے فریق مخالف نے اپنی خود ساختہ تین شرائط پر تعمیر مسجد کی اجازت دیدی۔

(۱) مسجد میں اذان اور نماز لاؤڈ اسپیکر پر نہیں ہو گی۔

(۲) مسجد میں نماز جمعہ کا انتظام نہ ہو گا کسی اور مسجد میں نماز جمعہ ادا کر لیا جائے۔

(۳) مسجد کا چندہ اہلِ محلہ سے وصول نہ کیا جائے۔

اس طرح یہ مکروہ نزاع اختتام کو پہنچی۔ پھر ایک تحریری معاہدے پر فریقین نے دستخط کر دیئے۔

یہ نامرضی کہانی سُنا کر ہمارے بزرگ و محترم دوست نے فرمایا یہ وجوہات تھے جس کے تحت ہم پابند ہیں۔ رہا مسجد کی ضروریات کے لئے عمومی چندہ، ویسے بھی ہم چندہ نہیں کرتے۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال وہ ہمارے مقاصد میں شامل نہیں، نماز جمعہ کا معاملہ ایسا اہم و ضروری نہیں کہ ہر ہر مسجد میں ادا کی جائے۔ قریب میں بڑی بڑی مساجد ہیں، بہتر بھی یہی ہے کہ نماز جمعہ جامع مسجد میں ادا کی جائے۔ ہم نے اسی میں عافیت سمجھی کہ بات مان لی جائے۔ اس نامرضی قضیہ کی تدفین کا اُس وقت یہی واحد حل تھا ہم اپنے اس معاہدے پر آج تک قائم ہیں اور اس خوابیدہ فتنے کو بیدار کرنا نہیں چاہتے۔

میں نے دریافت کیا کہ یہ واقعہ کتنا پُرانا ہے؟ فرمایا کوئی دس بارہ سال

ہو گئے ہوں۔

جب میں یہ کہانی سُن رہا تھا اثنائے سماعت میری رگِ حمیت ویسے بھی پھڑک رہی تھی اس مرحلہ پر تو بھٹ پڑی پھر میں اسطرح بول پڑا۔

حضرت! اللہ کی قسم اگر یہی واقعہ ہمارے وطن حیدرآباد (انڈیا) میں پیش آتا اور ہندو قوم ہمارے مذہبی تشخص میں اس طرح مداخلت کرتی تو مہینوں نہیں ہفتوں بلکہ گھنٹوں میں برسر معاملہ چکا دیا جاتا۔ ہم تو مساجد کے سامنے ہندو قوم کے جلسہ و جلوس کے منہ پھیر دیا کرتے ہیں چنانچہ آج بھی جلسہ و جلوس مساجد کے سامنے خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔

مولانا! کراچی پاکستانی شہر ہے، مسلمانوں کا ملک ہے، اسلام اس کا مذہب ہے (۹۹) فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے، یہاں اسلام اتنا مظلوم اور بے طاقت ہے، جمعہ جو اسلامی شعائر میں امتیازی شان رکھتا ہے اس ملک میں اس قدر سرنگوں؟

مولانا! اگر آپ نے وقتی تقاضوں کے تحت وہ رسوا کن شرائط قبول کر لئے تھے تو اس کا باقی رکھنا اور اس پر پابند رہنا ویسے بھی شرعی طور پر درست نہیں چہ جائیکہ اُس کی ہمّت افزائی کی جائے اور اُس کو مہلت دی جائے؟ ایسے اُمور کی ہمّت شکنی کی جانی چاہیئے؟

بزرگ دوست نے فرمایا حقیقت تو یہی ہے کہ دب کر صلح کر لی گئی اور تلخ گھونٹ حلق میں اُتار لئے گئے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔

میں نے کہا معاملہ کی یہ صفائی نہیں اور نہ اس کا یہ حل ہے۔ منکرات و مکروہات سے بہر حال نکل ہی جانا ضروری ہوا کرتا ہے ایسے معاہدے کو کبھی کا ختم کر دیا جانا چاہیئے تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں مشرکین کے

بعض قبائل سے جو مؤقتی معاہدے کئے تھے فتح مکہؐ کے بعد ان معاہدات سے برأت اور ان کے اختتام کا یکطرفہ اعلان کروادیا تھا۔

بہرحال یہ کیا کم ظلم ہے کہ مساجد اللہ کو آزاد رکھا نہ جائے اور اُن سے اپنے اغراض و مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

محترم دوست کے پاکیزہ قلب پر معلوم نہیں یہ چند کلمات نے کیا اثر پیدا کیا موصوف یکلخت خاموش ہوگئے اور پھر مجلس برخاست بھی ہوگئی۔

میں تو اپنی قیام گاہ آگیا، دوسرے دن علی الصبح حضرت موصوف کا فون آیا اور یہ خوشخبری دی کہ آج ہماری مسجد میں نماز جمعہ ادا کی جائیگی آپ تشریف لائیں اور یہ پہلا خطبہ آپ ہی دیں تفصیلات ملاقات پر عرض کرونگا۔

اطلاع نہایت روح افزا تھی میں نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کرلی اور حاضر ہوگیا، مجمع اگرچہ زائد نہ تھا تاہم مسجد کا احاطہ پُر ہوگیا تھا، مصلّیوں کے چہروں پر چمک دمک کے آثار تھے وہ سب عید جیسی مسرت محسوس کر رہے تھے، خطبہ جمعہ سے کچھ پہلے ایک مقامی مفتی صاحب اچانک تشریف لائے۔ بزرگ دوست نے موصوف سے خطبہ دینے اور نماز پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مفتی صاحب نے ہر دو کام انجام دیئے۔

نماز جمعہ کے بعد حاضرین پر ایک کیف و سُرور طاری تھا وہ ایک دوسرے کو مبارکباد کہہ رہے تھے اور خود بزرگ دوست پر ایسی خوشی محسوس کی جارہی تھی جو اس سے پہلے کم دیکھی گئی ہو، فراغت کے بعد مجلس منعقد ہوئی محترم دوست نے برملا اس بات کا اعتراف کیا یہ ان کی سلامتی طبع کا ثبوت کہ گزشتہ کل والی باہمی گفتگو کے بعد میں نے ایک بیقراری سی محسوس کی اور یہ حالت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی گئی حتّٰی کہ عشاء کے بعد یہ کیفیت دو چند سہ چند ہوگئی طبیعت کچھ فیصلہ کرنا چاہتی تھی لیکن

فیصلہ سمجھ میں نہیں آتا تھا اسی کشمکش میں رات اپنی آخری منزل پر آگئی تہجّد کی چند رکعات ادا کرکے دعا کی، پھر نماز فجر سے پہلے ہی شہر کے مشہور و معروف مفتی صاحب .... سے فون پر ربط پیدا کیا اور اپنی موجودہ بیقراری کی روئیداد سُنائی اور اس معاہدے کے بارے میں دریافت کیا جو اُس شریر ضدی عالم سے کیا گیا تھا، کیا اسکو یکطرفہ ختم کیا جاسکتا ہے؟

مفتی صاحب نے وہی کہا جو آپ نے اپنی کل والی گفتگو میں مشورہ دیا تھا، اسکے بعد دوسرے مفتی .... صاحب سے بھی مشورہ لیا انھوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ایسے فضول و مکروہ معاہدات کو برقرار رکھنا درست نہیں۔ علاوہ ازیں تعمیر مسجد کے وقت اطراف واکناف میں صرف چند مکانات تھے اور اب تو یہ محلّہ شہر کے گنجان علاقوں میں تبدیل ہوچکا ہے، نماز جمعہ کے لئے ویسے بھی موجودہ مساجد ناکافی ہورہی ہیں اگر آپ نے اپنی اس مسجد میں جمعہ کا انتظام کریں تو یہ خیر ہی ہوگا۔

یہ تفصیل سُنا کر محترم دوست[1] نے فرمایا کہ بس میں نے فیصلہ کر ہی لیا اور صبح ہی سے اپنے احباب میں اعلان کروادیا۔ بحمدللہ آج ہماری اس مسجد کا یہ پہلا جمعہ ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ آمین

ملحوظ:۔ اس واقعہ کو آج (۱۴۱۸ھ) تقریباً بارہ پندرہ سال ہورہے ہیں

---

[1] جن بزرگ دوست کا تذکرہ اس حادثہ میں کیا گیا ہے وہ ایک معروف شیخ طریقت بزرگ ہیں اور آج ۱۴۱۸ھ بحمدللہ بقید حیات ہیں۔ اللّٰھم متّعنا بطول بقاءہٖ۔

موصوف کا اسم گرامی عمداً ظاہر نہیں کیا گیا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی گئی زیر مطالعہ کتاب "کاروانِ حیات" کے مقصدِ تالیف کے پیش نظر اہلِ خدمات شرعیہ کو انکی اپنی دعوت و تبلیغ کے میادین سے واقف کروانا تھا مذکورہ واقعہ نقل کردیا گیا۔ وما توفیقی الا باللّٰہ۔

بحمد للہ مسجد نے دعوت و تبلیغ کی مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے جمعہ کے دن مجمع کا یہ حال ہوا کرتا ہے کہ وقت سے بہت پہلے مصلّی اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ مسجد اپنی تینوں منزلوں کے علاوہ اطراف و اکناف کے حصّوں سے پُر ہو جاتی ہے۔

نماز جمعہ کا اجرار خیر کثیر کا سبب بنا۔

اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ فِی الْاُولٰی وَالْاٰخِرَۃِ۔

ایک بے کام تحریک اور اُس کا "خاتمہ"

سن ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء شہر کراچی (پاکستان) میں "دعوت فکر" کے عنوان سے ایک تحریک چلائی گئی جس کا مقصد محرّک کی جانب سے یہ تھا۔

"قرآن کو جاہل مفسّروں کی تحریف سے بچاؤ"

تحریک کے محرّک مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی تھے، موصوف نے اپنی اس فریاد کو بزعم خود دنیا بھر کے علمار کے گوش گزار کی ہے۔

موصوف کی یہ تحریک عام جاہل مفسروں کے بارے میں نہ تھی بلکہ ایک خاص شخص سے متعلق تھی جن کا اسم گرامی محمد احمد ہے، یہ نوّے سالہ بزرگ باضابطہ عالم دین تو نہیں ہیں لیکن انھوں نے اپنی ساری زندگی تفسیر قرآن کی خدمت سے وابستہ رکھی ہے ملک کی مختلف مساجد میں ساٹھ ستّر سال تک قرآن کی تفسیر پڑھکر سُنانے کا معمول رکھا تھا۔ انہی بزرگ نے گزشتہ چند سالوں میں "درس قرآن" کے نام سے گیارہ ضخیم جلدوں میں قرآن حکیم کی مکمّل تفسیر مرتب کی جو مستند اُردو تفاسیر سے ماخوذ ہے جس کے حوالے وہ جا بجا دیتے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں ہند و پاک کے پچاس سے زائد علمار و مشائخ کرام نے کتاب پر تقاریظ بھی لکھی ہیں اور اپنی تائید و اطمینان کا بھی اظہار کیا ہے۔ (کتابچہ تقاریظ

درسِ قرآن از محمد احمد) اشاعت کے چودہ سال بعد ۱۹۹۱ء کے اوائل میں مفتی رشید احمد صاحب اس کتاب پر اچانک برس پڑے اور "دعوتِ فکر" کی مذکورہ تحریک کا اعلان کیا اور یہ فتویٰ جاری کیا۔

کتاب "درسِ قرآن" بہت اکھڑ اور ضدی جاہل نے لکھی ہے جو خیانتوں، جہالتوں اور گمراہیوں کا مجموعہ ہے۔

قرآن کریم کی تحریف، بے بنیاد افسانے، جھوٹے قصے، شریعت کے خلاف جاہل صوفیوں کی خودساختہ کرامات، موضوع و من گھڑت روایات، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، ائمۂ دین اور اکابر امت پر افترا و بہتان ہی اس کی دلچسپی کا سامان ہے، اس کتاب کا چھاپنا، شائع کرنا، پڑھنا، سننا، گھر میں رکھنا اور اس کے مؤلف کو مولانا کہنا جائز نہیں، حرام ہے اور بہت سخت گناہ، "درسِ قرآن" درسِ شیطان ہے۔

دعوتِ فکر ص ۱۸/۱

رشید احمد دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی	تیسری قسط
۲ شوال ۱۴۱۱ھ	از دارالافتاء والارشاد ص ۱ ناظم آباد، کراچی

علاوہ ازیں اُن علماء کرام اور مشائخ عظام جنھوں نے "درسِ قرآن" پر اپنی تقاریظ لکھی ہیں جن میں علماء پاکستان کے علاوہ علماء دیوبند، علماء سہارن پور، علماء ندوہ لکھنؤ، علماء دہلی وغیرہ پر مفتی صاحب قبلہ نے اس طرح زجر و احتساب فرمایا ہے۔

(۱) وہ علماء جنھوں نے "درسِ قرآن" کے شروع میں اپنے نام شائع کرنے کی اجازت دی ہے انھوں نے اوّل سے آخر تک پوری کتاب خوب

غور سے دیکھے بغیر اسکی اجازت کیوں دی؟

(۲) بلا تحقیق شہادتِ زور (جھوٹی گواہی) جیسے اکبر الکبائر کے مرتکب ہوئے ہیں (یعنی بدترین گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔)

(۳) اُن کے اس عمل سے قرآن کریم میں تحریف ہوئی ہے، اُمت میں گمراہی پھیلی، بے حیائی و بدکاری کے دروازے کھلے ہیں۔

(۴) انپر فرض ہے کہ ان بدترین گناہوں سے توبہ کا اعلان کریں۔

(۵) پھر "درسِ قرآن" سے اپنی برأت کا بھی اعلان کریں۔

(۶) اس کتاب (درسِ قرآن) سے جتنے لوگ گمراہ ہوئے ہیں ان میں سے اس طویل عرصے میں جتنے انتقال کر گئے ہیں اُن کے عذاب میں مؤلف کے ساتھ یہ علماء بھی شریک ہوں گے، جنھوں نے بلا تحقیق شہادت زور جیسا عظیم جرم کیا ہے۔

دعوت فکر ۶
از رشید احمد دارالافتاء والارشاد کراچی
۲۴ رمضان ۱۴۱۱ھ

ملحوظہ:۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مفتی صاحب قبلہ کے شوقِ فتویٰ نے جن جن علماء کرام پر مذکورہ بالا زجر و توبیخ اور شانِ احتسابی جاری فرمائی ہے ان میں مدارس دینیہ کے شیخ الحدیث حضرات، مفتی صاحبان اور مستند اساتذۂ کرام کے علاوہ خود مفتی صاحب قبلہ کے چار اکابر و سرپرست استاذ بھی شامل ہیں۔

مفتیِ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ، عارف باللہ حضرت عبدالحیؒ صاحب عارفیؒ۔ حضرتِ اقدس مولانا محمد شریف صاحبؒ، عالمِ ربانی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوریؒ۔

یہ چاروں بزرگ مفتی صاحب قبلہ کے سرپرست و بزرگ ہونے کے علاوہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے خلفاء بھی ہیں۔

ان چاروں حضرات نے بھی "درس قرآن" اور مؤلف درس قرآن کی تائید کی ہے اور دعائیں دی ہیں۔ (کتابچہ تقاریظ درس قرآن)

اس جرأت و بے باکی سے کہیں اور آگے قبلہ نے ان سارے بے گناہ وفات یافتہ مسلمانوں کو بھی جہنم رسید کیا ہے جو اس چودہ سالہ طویل عرصہ میں "درس قرآن" کو پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں اور (اس جرم سے) بغیر توبہ کئے دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ (دعوتِ فکر ص)

قبلہ کا جوشِ غضب اس پر بھی سکون نہ پایا دوسرے ملے ایوانِ حکومت سے بھی فریاد کرنے لگے۔

اس (یعنی مؤلف "درس قرآن") کو ایسی سخت وعبرتناک سزا دی جائے جو آئندہ ہمیشہ کے لئے تمام جاہل مفسروں کی کمر توڑ دے۔

دعوتِ فکر ص

رشید احمد ۲۵/۱۱/۱۴۱۱ھ

یہ تھا خلاصہ دعوتِ فکر کی تحریک کا جسکو ہم نے مفتی رشید احمد صاحب قبلہ کے الفاظ میں کتابچہ "دعوتِ فکر" سے نقل کر دیا ہے۔

قارئین حضرات یقیناً حیرت زدہ ہوں گے کہ ایسی باتیں معمولی علم وعقل رکھنے والا تو کجا کسی نادان مریض عقل سے بھی ممکن نہیں چہ جائیکہ کراچی کے بلند نام مفتی صاحب کا کلام ہو۔

آئندہ صفحات میں آپ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہو جائیں گے۔

انہی ایام ۱۹۹۱ء کے اوائل میں راقم الحروف اپنی چوتھی آخری لڑکی کے نکاح کے سلسلے کراچی پہنچا تھا۔ مفتی صاحب قبلہ اپنی "دعوتِ فکر" میں درس قرآن اور اُسکے

مرتب مولانا محمد احمد صاحب پر جو جو اعتراض کئے تھے جدّہ کراچی کے پانچ چھ گھنٹے ہوائی سفر میں نہایت خالی الذہنی سے مطالعہ کیا اور اعتراضات کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی، مفتی صاحب قبلہ کے ہر اعتراض پر یہی تاثر بڑھتا گیا کہ قبلہ صرف اپنے دل کا بُخار ٹھنڈا کر رہے ہیں وبس۔

اعتراض نہایت سطحی قسم کے، عنوان انتہائی عامیانہ، خطاب، تہذیب واخلاق سے عاری، الفاظ سُوقیانہ، غیظ وغضب، بُغض وعناد، تضحیک وتمسخر ہر جگہ نظر آیا، ایسی کوئی بنیادی بات نہیں جس پر گرفت کی جائے، کوئی مضمون ایسا نہیں جو اہلِ حق کے مسلک سے ٹکرائے، درس قرآن کی کوئی ایسی تشریح نہیں جس کو گمراہی، بے حیائی، بدکاری، حرامکاری، خیانت خباثت، ضلالت قرار دیا جائے جیسا کہ مفتی صاحب قبلہ نے اپنی "دعوتِ فکر" میں جا بجا لکھا ہے، قبلہ کو ذرّہ تنکہ اور تنکے پہاڑ نظر آئے،

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجی

قبلہ نے کتاب "درس قرآن" کا تو پوسٹ مارٹم کر ڈالا، مرتب کتاب مولانا محمد احمد صاحب کو جا بجا الزامات دیتے وقت ان غیر شریفانہ القابات سے نوازتے چلے گئے ہیں قبلہ کی زبان وقلم سے چند ایک کلمات مطالعہ کیجئے۔

(۱) اُلٹی سمجھ جاہل۔ (۲) مادر زاد مفسّر، (۳) مادر زاد محدّث، (۴) مادر زاد جاہل، (۵) نا اہل (۶) نالائق جاہل (۷) جاہل کامل (۸) بہت اکھڑ ضدی جاہل۔ (۹) ناخلف خلیفہ (۱۰) مُرید مَرید (سرکش مُرید)۔ (۱۱) اندھا۔ (۱۲) دائمی نا اہل۔ (۱۳) ناشکرا۔ (۱۴) نافرمان۔ (۱۵) رٹا کرڈ بابُو (۱۶) مولانا کا جھوٹا لیبل وغیرہ۔ "(دعوتِ فکر)"۔

قبلہ مفتی صاحب کی مُنہ بولی سوانح حیات "انوار الرشید" پر ایک مُرید نے مفتی صاحب قبلہ کو "خُلق عظیم" میں ممتاز مقام کا حامل قرار دیا ہے۔ (غالباً ان مُرید کی غرض اس خُلق عظیم سے مذکورہ زبان وقلم ہوگی)۔

قبلہ کی بات نا تمام رہ جائیگی جبکہ موصوف کی شان وعظمت مُریدوں کی زبان سے ظاہر نہ کی جائے۔ مفتی صاحب قبلہ اپنے مُریدوں وعقیدت مندوں کے ہجوم میں درج ذیل خطابوں والقابوں سے پُکارے جاتے ہیں بلکہ خود مفتی صاحب قبلہ نے اپنی منہ بولی سوانح حیات میں اپنے اِن مریدوں کو مندرجہ ذیل خطابات والقابات کو نقل کرنے کی صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ ان کی اس عزّت افزائی کو "اعتدال پسندی" کا نام دیا ہے۔ (انوارالرشید ص۳۷)

لیجئے مُریدوں کے عطا کردہ القابات وخطابات۔

(۱) امیرالمتکلّمین۔ (۲) امام العارفین۔ (۳) سیف اللہ المسلول۔ (۴) حضرتِ اقدس۔ (۵) فقیہ العصر (۶) عارف کامل (۷) مجدّد الملّت۔ (۸) محدّثِ کبیر۔ (۹) شیخ المشائخ (۱۰) قطب الارشاد (۱۱) مفتیٔ اعظم۔ (۱۲) عالی مقام صاحبزادہ۔ (۱۳) رشید ثانی (یعنی محدّث عظیم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ؒ)۔ (۱۴) بڑا قیمتی سرمایہ۔ (۱۵) معدنِ تقویٰ وہدایت۔ (۱۶) رجلٌ رشید۔

(ماخوذ از کتاب انوارالرشید ص۳۷، ص۲۹ وغیرہ)

راقم الحروف کو بھی حضرت مفتی صاحب قبلہ سے گاہے ماہے میل ملاقات رہی ہے اور قبلہ سے میرے بعض مراسم بھی رہے ہیں تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

البتہ مفتی صاحب قبلہ نے جس شخصیت کے خلاف تحریک جاری رکھی تھی یعنی کتاب "درسِ قرآن" کے مرتّب مولانا محمد احمد صاحب سے راقم الحروف بالکل ہی ناآشنا تھا نہ کبھی نام سُنا نہ ان کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ (بعدمیں پوری کتاب کے دیکھنے کا موقعہ ملا)۔

جیساکہ راقم الحروف نے لکھا ہے کراچی کا یہ سفر اپنی لڑکی کے عقدِ نکاح کے سلسلے میں تھا۔ سفر صرف دو ہفتے کا تھا نکاح سے پہلے ایک ہفتہ تو انتظامات کی نذر ہوگیا

نکاح کے بعد دو تین یوم یونہی گزر گئے واپسی جدّہ کے لئے صرف تین یوم باقی تھے اس مختصر وقت کو میں نے غنیمت جانا قبلہ کی تحریک "دعوتِ فکر" تفصیلی جائزہ لیا اور اعتراضات کے جوابات اور مفتی صاحب کے مُغالطات دبے جا الزامات کو چالیس صفحات پر مرتب کرلیا^۱ اور پھر دوسرے ہی دن مفتی صاحب قبلہ سے ذریعۂ ٹیلی فون ملاقات کا وقت لیا اور دست بدست حوالہ کر دیا۔

اس نصف گھنٹہ ملاقات میں شیعہ سُنّی تحریک کے متعلق جو قبلہ نے ان دنوں جاری رکھی تھی آزادانہ گفتگو کی۔ اس خصوصی ملاقات میں راقم الحروف کو جو تأثر ملا، جیسا کہ اہلِ باطل حق واضح ہونے کے بعد بھی حق کو قبول نہیں کرتے، ایسے ہی کچھ تأثر قبلہ کی مجلس میں پایا، تفصیل بڑی طویل و دلخراش ہے۔

بہرحال مفتی صاحب قبلہ کی "دعوتِ فکر" کا جواب حوالہ کر کے واپس ہوا، شام میں ایک کتاب کی تلاش کے لئے مقامی کتب خانہ میں تھا ایک صاحب نے دعا وسلام کے بعد میرا تعارف چاہا اور پھر خود اپنا تعارف بھی کروایا۔

یہ صاحب شہر کی تبلیغی مرکزی مسجد (مکّی مسجد) کے امام تھے انھوں نے اپنے والد صاحب کا بھی نام لیا مولانا محمد احمد صاحب۔ میں اچانک بول پڑا کیا وہی "درسِ قرآن" والے؟ کہا جی ہاں میں ان کا بڑا لڑکا ہوں۔ بس کیا تھا مفتی رشید احمد صاحب کی "دعوتِ فکر" والی بحث چل پڑی اور میں نے غائبانہ طور پر اپنے تینوں مکتوبات لکھنے کا تذکرہ کر دیا اور یہ بھی کہ ایک خصوصی تفصیلی مکتوب حضرت مفتی صاحب قبلہ کو کل ہی دست بدست دے آیا ہوں اور یہ کہ بہت جلد میری واپسی بھی ہے وقت میں گنجائش ہوتی تو آپ کے والد صاحب سے ضرور ملاقات کرتا میرا سلام فرمادیں، لیکن صاحبزادے نے اثنائے گفتگو اپنے والد سے فون پر اس تائیدِ غیبی کا

۱؎ اسکے علاوہ ایک تفصیلی فریاد علماء پاکستان کے نام اور ایک گذارش ائمہ مساجد پاکستان کے نام بھی مرتب کیا۔

تذکرہ کر دیا۔ بڑے میاں عرصہ چھ ماہ سے مفتی رشید احمد صاحب کی زجر و توبیخ، سب و شتم، ذلّت و اہانت اور غیر شریفانہ الزامات سے متاثر ہوکر نیم جان ہو گئے تھے اور چلنے پھرنے کی طاقت بھی کھو چکے تھے، بستر مرگ پر موت کا انتظار کر رہے تھے اچانک اٹھ بیٹھے اور فون پر راقم الحروف سے نہایت لجاجت و انکساری سے گزارش کی کہ چند منٹ کے لئے میں جناب کی خدمت میں ابھی آرہا ہوں انتظار فرمائیں۔ موقعہ کی نزاکت ایسی تھی کہ میں نے خود وعدہ کرلیا کہ آج بعد عشاء خود حاضر ہو جاؤنگا۔

چنانچہ رات کو ملاقات کی، موصوف کا حلقۂ ارادت وسیع پایا، کثرت سے احباب و معتقدین حضرات جمع تھے رات دیر گئے محفل میں یہی گفتگو رہی، دوسرے دن مولانا محمد احمد صاحب نے میرے مکتوباتِ ثلٰثہ سینکڑوں تعداد میں طبع کروا کر کراچی تا اسلام آباد ہر ہر دینی مدرسہ اور بڑی بڑی مساجد کے ائمہ و خطیب صاحبان اور مشاہیر علماء کی خدمت میں پوسٹ کر دیئے، اور یہ تحریک آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔

رات کی اس محفل میں معلوم ہوا کہ بڑے میاں (مولانا محمد احمد صاحب) نے چھ ماہ کے اس طویل عرصہ میں پہلی بار بات چیت کی، چلنا پھرنا تو درکنار از خود بھی اٹھ نہیں سکتے تھے، اور آج ۱۹۹۶ء بحمد للہ صحت جسمانی اور قوتِ روحانی سے معمور ہیں اور کتاب درسِ قرآن کی اشاعت سہ چند ہو چکی ہے۔

راقم الحروف کے "مکتوباتِ ثلٰثہ" کا اندرونِ ملک اتنا چرچہ ہوا کہ ملک کے مشاہیر علماء نے بھی مداخلت کرنی ضروری سمجھا، پاکستان کے دو ممتاز عالم دین حال و مستقبل کے روشن چراغ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب و اُن کے برادر بزرگ مفتی رفیع عثمانی صاحب نے اپنے مکتوب میں مفتی رشید احمد صاحب کو یہ تجویز پیش کی کہ۔

"کوئی محقق عالم پوری کتاب "درسِ قرآن" کو غور سے دیکھکر اس کی اصلاح کردے اس محنت پر جتنے بھی مصارف آئیں گے وہ مولّف برداشت کرنے کو تیار ہیں"۔

(مکتوب بنام مفتی رشید احمد صاحب)

یہی تجویز مشہور و معروف درس گاہ خیر المدارس (ملتان) کے مفتیانِ کرام اور علمار عظام نے بھی پیش کی، کہ

علمار کی ایک مجلس تشکیل دی جائے جو متعلقہ مقامات کو پوری دیانت و بصیرت کے ساتھ دیکھیں پھر مولّف سے رابطہ قائم کریں۔

مکتوب بنام مفتی رشید احمد صاحب

۲۷۔ ذوالقعدہ ۱۴۱۱ھ

جامعہ عربیہ حقانیہ ساہیوال (سرگودھا) کے قابلِ احترام مفتی سیّد عبدالشکور صاحب ترمذی نے بھی یہی تجویز پیش کی۔ (ترمذی صاحب سے یہاں جدّہ میں تفصیلی ملاقات رہی ہے۔)

مکتوب بنام مفتی رشید احمد صاحب

مورخہ ۲۲۔ شوال ۱۴۱۱ھ

اس طرح مقامی علمار کے علاوہ دینی و اسلامی جرائد و رسائل نے بھی مفتی رشید احمد صاحب کی "دعوتِ فکر" کے تانے بانے بکھیر دیئے، لیکن مفتی صاحب قبلہ نے سب کو یہی بالک ہٹ جواب دیا کہ۔

محض ایک جاہل (مولّف کتاب مولانا محمد احمد صاحب) کو خوش کرنے کے لئے بلاضرورت ہزاروں روپئے اور اُن سے کہیں زیادہ قیمتی کسی عالم کے وقت اور محنت کا گرانقدر سرمایہ ضائع کرنے کا کیا جواز ہے۔

(کتاب درس قرآن کے بارے میں علمار کرام کی بعض تحریرات از مفتی رشید احمد صہ ۳)

بہرحال مفتی صاحب قبلہ نے عام علماء کی تجویز کو قبول کرنا تو درکنار اپنے اکابر اور پاکستان کے مشاہیر علماء کی تجویز قبول نہیں کی جبکہ ان سب نے اندرونِ تین ماہ جواب طلبی کا اعلان کر دیا تھا۔

مفتی صاحب قبلہ کی "دعوتِ فکر" کے تانے بانے جاننے کے بعد قارئین حضرات اس تجسس میں پڑ جائیں گے کہ قبلہ کی تحریک پر یقیناً یہ جھوٹے الزامات تو نہیں ؟

جیسا کہ راقم الحروف نے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے کہ مفتی صاحب قبلہ کی تحریک کو حرفاً حرفاً اور بار بار پڑھا ہے اور اعتراضات والزامات کو سمجھنے کی پوری کوشش بھی کی ہے اور یہ سب امور خالی الذہنی میں غور کئے گئے ہیں جبکہ راقم الحروف نہ "درس قرآن" سے واقف تھا نہ اس کے مرتّب ومؤلّف سے واقف ،

یہ غور وخوص اور صفائی صرف اس لئے کی گئی کہ کراچی کا ایک معروف مفتی عالم بلکہ شیخ طریقت ایک بے گناہ وگوشہ نشین بزرگ پر بلاوجہ شرعی تابر توڑ فتوے جاری کر رہا ہے اور اس کے جواز کے لئے بچکانہ اعتراضات کر رہا ہے اور پاکستان کا کوئی عالم بھی اس ظلم کی مدافعت کرنے آگے نہ بڑھا ، بس یہی وجہ تھی کہ راقم الحروف نے غائبانہ ایک مظلوم کی فریاد رسی کی ، مفتی صاحب قبلہ کے اعتراضات کے چند ایک نمونے آخر میں پیش کر رہا ہوں ناظرین حضرات خود اندازہ کر لیں گے کہ حقیقت کیا ہے ؟

راقم الحروف نے مفتی صاحب قبلہ کی اس ذہنی پیچ وتاب کے اسباب اُن کے کتابچہ "دعوتِ فکر" سے حسبِ ذیل اخذ کئے ہیں جن کو علماء پاکستان کی خدمت میں بھی پیش کر دیا گیا ہے ۔

(۱) "درس قرآن" کی اشاعت کے چند سال بعد مولانا محمد احمد صاحب نے مفتی صاحب قبلہ کی سرپرستی سے اپنے آپ کو خارج کر لیا تھا جبکہ زندگی بھر وابستہ

رہے ہیں۔

(۲) مفتی صاحب قبلہ کے الزامات و اتہامات پر مولانا محمد احمد صاحب نے انہیں شرعی مباہلہ کی دعوت دیدی تھی۔

(۳) پھر آخر میں یومِ آخرت کی پیشی میں جواب دہی کے لئے تیار ہوجانے کا نوٹس بھی دیا تھا۔

(۴) "درسِ قرآن" کی مقبولیت اور اس کی اشاعت ملک و بیرونِ ملک میں دو چند ہوگئی۔ ایک عیرِ عالم کی کتاب کا اس طرح شائع ہوجانا باعث رشک و حسد ثابت ہوا۔ اور اس کے لئے قبلہ نے وہ بُودے سہارے ڈھونڈ نکالے اور اس کو "تحریف قرآن" کا نام دیا۔

لیکن وہ اپنی تحریک کو خود سہارا نہ دے سکے اپنی نوٹس تک کے تین ماہ کے اندر اندر خود ہی گر پڑے۔

(۵) اُنہی دنوں قبلہ پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سکوت اختیار کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی پھر طویل سکوت اختیار کرلیا، نوٹس کے تین ماہ نہیں چھ ماہ گزر گئے نہ فتویٰ جاری کیا نہ کسی کو جواب دینا مناسب سمجھا، مظلوم اُٹھ کھڑا ہوا اور ظالم گر پڑا۔

اس طرح ایک مسلک کے طبقے میں اختلاف و انتشار کا انسداد ہوگیا جو تیزی سے طبقہ علماء میں پھیل رہا تھا۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

جیسا کہ راقم الحروف نے لکھا ہے مفتی صاحب قبلہ کے چند اعتراضات کا نمونہ لکھا جائے گا، حقیقت جاننے کے لئے یہ چند نمونے کافی ہیں مطالعہ کیجئے۔

مفتی رشید احمد صاحب کے چند ایک اعتراض

کتاب "درس قرآن" پر

(۱) درس قرآن جلد ۲ ص ۲۲۳ پر غَفُوْرًا الرَّحِیْمَ، میم پر بجائے پیش کے زبر لکھا ہے۔

(۲) درس قرآن جلد ۱۱ ص ۲۷ پر بَعَثْ بَعْدُ الْمَوْت، دال پر بجائے زبر پیش لکھا ہے۔

(۳) درس قرآن جلد ۱ ص ۵۲ پر خطاء یعنی لفظ خطا کو ء کے ساتھ لکھا ہے جبکہ صرف خطا لکھنا چاہیئے تھا۔

(۴) درس قرآن جلد ۹ ص ۳۴۵ پر عُکّاشہ کے بجائے عُکّاثہ ثا سے لکھا ہے۔

اس طرح آٹھ دس اغلاط لفظی لکھکر قبلہ یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

"یہ جہالتیں، خیانتیں، ضلالتیں اور دیگر گمراہیاں وہ ہیں جن میں سے بعض کتاب کھولتے ہی اور بعض جستہ جستہ سرسری طائرانہ نظر ڈالنے سے سامنے چلی آتی ہیں۔" الخ

(تیسری قسط ص ۱

از رشید احمد

دارالافتاء والارشاد، کراچی)

ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں۔

(۵) درس قرآن جلد ۸ ص ۲۴۶ پر لکھا ہے اُمّ مسطح کا قصّہ بوقت واپسی پیش آیا۔ الخ

مفتی صاحب قبلہ اس پر یہ لکھتے ہیں۔

"یہ اُلٹی سمجھ جاہل مولانا واپسی کا واقعہ بتلاتے ہیں حالانکہ یہ واقعہ

روانگی کے وقت کا تھا"۔

(دعوتِ فکر صـ۹
از رشید احمد)

(لیکن معارف القرآن جلد ۹ صـ۲۷۴ پر بحوالہ بخاری شریف واپسی کا ہی واقعہ لکھا ہے۔)

ایک اور اعتراض۔

(۶) درس قرآن جلد ۷ صـ۶۰۲۔ اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ قوم اصحاب الرّس قہر آسمانی سے ہلاک ہوئے۔

مفتی صاحب قبلہ اعتراض کرتے ہیں کہ بیان القرآن اور معارف القرآن میں لکھا ہے کہ ان کے عذاب کی کیفیت منصوص نہیں۔ (یعنی عذاب کی کیفیت معلوم نہیں)۔ یہ محمد احمد کی دوسری خیانت و جہالت ہے۔

(۷) درس قرآن جلد ۱ صـ۵۰۶۔ عبارت ہے خنزیر (سُوّر) انسان کے فُضلہ کو بہت رغبت سے کھاتا ہے اور فضلۂ انسانی خنزیر کی خاص خوراک ہے، اور اس کا گوشت و پوست زیادہ تر فضلۂ انسانی سے پیدا ہوتا ہے، اس طرح خنزیر کا گوشت کھانا گویا اپنی ہی فضلہ کھانا ہے۔ الخ

مفتی صاحب قبلہ اس عبارت پر لکھتے ہیں۔

ماشاء اللہ اسلام کے کتنے بڑے فلاسفر ہیں۔

(۸) درس قرآن جلد ۷ صـ۶۰۱ پر اصحاب الرّس کے بارے میں اکثر مفسرین یہی لکھتے ہیں کہ ان کی ہدایت کے لئے حضرت شُعیب علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔

مفتی صاحب قبلہ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بیان القرآن میں

لکھا گیا ہے کہ یہ لوگ قوم ثمود کے باقی ماندہ افراد تھے۔ (یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نہ تھے۔)

نوٹ :- مفتی صاحب قبلہ کے بقیہ اعتراض اسی قسم کے ہیں۔ رسالہ (دعوتِ فکر) کا مطالعہ کیجئے۔

اور قبلہ کی ہدایت یابی کے لئے دُعا بھی۔

آخر کار مفتی صاحب قبلہ نے اپنے تین ماہ کے الٹی میٹم کو واپس لینے کا از خود فیصلہ کر لیا، اور اسی میں اپنی عافیت سمجھی، پھر یہ تحریک اپنے آپ مدفون ہو گئی۔

لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔

خادم الکتاب والسنّۃ

عبدالرحمٰن غفرلہٗ استاذ حدیث وتفسیر

حال مقیم جدّہ (سعودی عرب)

۱۵؍ ربیع الاوّل ۱۴۱۸ھ

ہندوستانی نصابِ تعلیم

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم اپنے وطن حیدرآباد سے سعودی عرب منتقل ہوئے ہیں. یہ ۱۹۷۷ء کا زمانہ تھا ہمارا یہ سفر دراصل حج بیت اللہ کے سلسلے میں پیش آیا تھا جو فضلِ خداوندی سے مستقل قیام کا ذریعہ ثابت ہوا جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آپ نے پڑھی ہیں.

فراغتِ حج کو دو تین ماہ بھی نہ گذرے تھے حکومت سعودی عرب کی وزارتِ داخلہ کا ایک عام اعلان شائع ہوا کہ جن لوگوں نے حج یا عُمرہ ویزا پر مملکت میں قیام کر لیا ہے وہ اندرونِ تین ماہ کسی بھی سعودی شخص کی کفالت میں اپنا اقامہ حاصل کرلیں تاکہ ان کا قیام مملکت میں قانونی ہوجائے۔

اَندھا دو آنکھیں ہی تو چاہتا ہے، ہم نے شہر کے ایک نامی گرامی تاجر کی کفالت میں اپنا اقامہ حاصل کرلیا۔ فَلَكَ الْحَمْدُ يَا رَبَّنَا لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔

آج ان سطور کے لکھتے وقت حصولِ اقامہ کی مفت سہولت کو "نعمتِ عظیمہ" "عطائے کریمانہ" "کرم بالائے کرم" کہا جائے تو بھی شکرِ الٰہی ادا نہ ہوگا۔

سعودی عرب دنیا کا واحد ملک ہے جہاں شہریت کا حصول تو کجا اِقامہ (مؤقتی قیام) کا حصول بھی پیچیدہ تر بنا ہوا ہے۔ بہرحال ہم نے اس غیبی اقامتی سہولت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اہل وعیال کو بھی ہندوستان سے جدّہ منتقل کرلیا۔

قیام کے بعد پہلا مسئلہ بچّوں کی تعلیم کا پیش آیا سعودی عرب کے سرکاری اسکولوں میں غیر ملکی بچّوں کا داخلہ مقامی زبان عربی کی ناواقفیت کی وجہ سے دشوار تھا۔ ہمارے بچوں کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ ہر ملک میں دوسرے ممالک کے سفارتخانے پائے جاتے ہیں ہندوستان کا سفارت خانہ بھی دیگر سفارت خانوں کی طرح اپنے ہندوستانی بچّوں کی تعلیم وتربیت کے لئے یہاں جدّہ میں اسکول بھی چلاتا ہے۔ آخری صورت یہی تھی کہ اسی اسکول میں اپنے لڑکے کو جو ہندوستان میں زیرِ تعلیم تھا شریک کروادیا جائے، شرکت سے پہلے اسکول کے نظم ونسق وتعلیمی نصاب وغیرہ کو دیکھنا مناسب معلوم ہوا چنانچہ معلومات پر چند ایک منکرات ظاہر ہوئے جو نہایت قابلِ توجہ تھے، ہم تردد میں پڑ گئے۔

ایک تو یہ کہ اس وقت اسکول میں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم جاری تھی، دوسری بات یہ بھی تھی کہ لباس نیم عُریاں خاص طور پر جوان لڑکیاں اسکرٹ پہنا کرتی تھیں اور لڑکے نیکر (چڈّیاں)، پھر اس ستم پر بالائے ستم نصاب (کورس) میں ہندو تہذیب وتمدّن کا جابجا تعارف بھی ملا۔

ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ ہمارا مسلمان لڑکا اس غیر اسلامی بلکہ ہندو تہذیب وتمدّن میں اپنا اسلامی تشخص کیونکر برقرار رکھ سکیگا؟ خیر اسی میں

معلوم ہوا کہ ایسے ماحول سے دُور ہی رکھا جائے، چنانچہ پڑوسی ملک پاکستان کے اپنے سفارتخانے کا مدرسہ مناسب معلوم ہوا جہاں کے نصابِ تعلیم میں اسلامی اقدار کا پاس و لحاظ رکھا گیا ہے اور تہذیب و تمدّن بھی اسلامی مزاج کے قریب معلوم ہوئی۔

دوسرے دن پاکستانی سفارتخانے کے مدرسہ گئے اور پرنسپل صاحب سے گوش گزار ہوئے، اور اپنے لڑکے کی شرکت کیلئے گزارش کی، انھوں نے ہمارے جذبات اور خیالات سے متاثر ہوکر اتفاق کرلیا اور تکمیل ضابطہ کے لئے انڈین ایمبیسی سے (N O C) سرٹیفکٹ طلب کیا، اس پر ہم اپنے ملکی سفارتخانے گئے۔ اُس وقت سفارتخانے کے تعلیمی قونصلیٹ سلطان صاحب تھے۔ ہماری درخواست پر پوچھا کہ آپ اپنے لڑکے کو پاکستان ایمبیسی اسکول میں کیوں شریک کروانا چاہتے ہیں جبکہ خود ہمارا مدرسہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ ہندوستانی لڑکے اسمیں اپنی تعلیم جاری رکھیں؟

چونکہ سوال کچھ اہم اور معقول تھا جس کی جوابدہی کے لئے میں بروقت تیّار نہ تھا، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں آپ نے پڑھا ہے عام طور پر ایسے نازک وقت ہر بار اللہ نے دستگیری فرمائی، زبان اچانک اس طرح گویا ہوئی۔

جناب! جب آپ اس کی وجہ دریافت ہی کرتے ہیں
تو عرض کرتا ہوں چار وجوہات ایسی ہیں جس کی وجہ سے میں
اپنے ہندی لڑکے کو پاکستانی ایمبیسی اسکول میں شریک

کروانا چاہتا ہوں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ جب ہم اپنے ہم وطن انڈیا میں تھے تو وہاں ہم علی الاعلان ہندوستانی نصاب تعلیم کی مخالفت کیا کرتے اور اسکو مسلم کردارکشی قرار دیا کرتے تھے۔ بہرحال جب تک ہم انڈیا میں رہے یہی آواز بلند کرتے رہے کہ ہندوستانی نصاب تعلیم سے مسلمان بچّوں کو دُور رکھا جائے یہ نصاب کسی مسلم لڑکے کو اگر ہندو نہ بنائے تو اس کو مسلمان بھی برقرار نہیں رکھیگا۔

ہندوستانی حکومت اس کو سیکولر (غیر مذہبی) نصاب کہتی ہے لیکن اس نصاب میں رام، سیتا، کرشنا، لکشمی دیوی دیوتاؤں کے قصّے کہانیاں اور ہندو تہذیب و تمدّن کا بکثرت تعارف ملتا ہے، پھر ہم ایسی تعلیمات کو سیکولر کیوں سمجھیں، ایسا شخص جو اسلام پر زندہ اور اسی پر مرنا چاہتا ہو اسکو کیونکر قبول کرے گا؟

(۲) دوسری وجہ یہ کہ آپ کے مدرسہ میں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا رواج ہے یہ غیر اسلامی تہذیب ہمارے ہاں نہایت حیا سُوز اور بے حیائی سمجھی جاتی ہے۔ نوجوان لڑکوں کا نوخیز لڑکیوں سے ہر روز گھلا ملا کیا اچھے اخلاق و پاکیزہ کردار کی ضمانت دے سکتا ہے؟ ہم جانتے بوجھتے اپنے لڑکوں کو اس دلدل میں کیوں ڈالدیں۔

(۳) تیسری وجہ یہ کہ آپ کے مدرسہ کا یونیفارم نیم برہنہ اور انگریز طرز کا ہے ہم خود اپنی خانہ زاد تہذیب و تمدّن کو رکھتے ہوئے غیروں کی تہذیب کیوں اختیار کریں؟

(۴) چوتھی بات یہ کہ ہمکو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے مدرسہ میں بعض اساتذہ صرف ہندو پرست نہیں بلکہ ہندو دھرم کی ترویج و اشاعت کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

جناب عالی! یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہم اپنے مسلمان بچّوں کو خراب کرنا نہیں چاہتے چونکہ آپ نے سادگی سے اسباب دریافت کئے ہیں میں نے اسی توقع پر کہ آپ (N O C) دیدیں گے وضاحت کے ساتھ اسباب بیان کردیئے ہیں۔

اس وقت قونصلیٹ ہال میں سفارت خانے کے دوسرے ملازمین بھی جمع ہوگئے تھے کسی نے بھی مداخلت نہیں کی خود قونصلیٹ صاحب پر بھی کامل سکوت طاری تھا۔ میری درخواست پر اس وقت منظوری لکھدی میں شکریہ ادا کرکے باہر نکل آیا۔ معلوم نہیں میرے جانے کے بعد کیا تاثر رہا ویسے بھی میں نے جاننے کی کوشش بھی نہ کی۔ اللہ کا احسان ہے اس طرح ایک ہندوستانی مسلم لڑکے کو پاکستانی ایمبیسی اسکول میں پڑھنے کی اجازت مل گئی، جہاں کا نصاب اسلامی تصوّرات پر مرتّب کیا گیا تھا۔

دوسرے دن پاکستان ایمبیسی اسکول گیا اور پرنسپل صاحب کی جناب میں (N O C) پیش کردی، وہ حیرانی سے میرا منھ تکنے لگے، اُنسے

رہا نہ گیا پُوچھ ہی لیا آخر آپ نے یہ سرٹیفک کیونکر حاصل کیا؟
میں نے ہندوستانی قونصلیٹ والی کہانی سُنا دی بڑے لُطف سے سُنتے رہے، کہنے لگے آپ نے بڑی جرآت سے کام لیا۔ میں نے کہا جناب یہ تو سعودی عرب ہے جہاں مسلمانوں اور اسلام کی حکمرانی ہے یہاں آکر بھی ہم اپنا اسلامی تشخص برقرار نہ رکھ سکیں تو پھر اسلام کا نام بھی نہ لینا چاہیئے، معلوم نہیں ہمارا اسلام کونسا اسلام متصوّر ہوگا؟

بہر حال، پرنسپل صاحب نے داخلہ سے اتفاق تو کر لیا لیکن دورانِ گفتگو انھوں نے محسوس کر لیا کہ درخواست گزار کو یہاں کی پابندیوں سے بھی آگاہ کر دیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ فرمانے لگے، جناب! طلبہ کے یونیفارم میں یہاں یکسانیت ضروری ہے آپ کا لڑکا بھی پینٹ شرٹ اور ٹائی کا پابند ہوگا یہاں سارے طلبہ یہی لباس استعمال کرتے ہیں۔

کچھ دیر کے لئے میں خاموش رہا جواب دہی سمجھ میں نہ آئی، آسمان سے گرے تو چھپڑ میں پھنسے، یا اللہ بیشک یہ دنیا دارِ ابتلاء ہے۔ میں نے نہایت تحمّل سے عرض کیا جناب! طلبہ کے یونیفارم کی یکسانیت اگر اسلامی طرز پر ہوتی تو کتنا اچھا تھا یہ تو ذہنی و فکری کمتری ہوئی جو غیر اسلامی تہذیب کو اختیار کر لیا گیا۔ بہر حال جب آپ نے ایک بیرونی تہذیب اختیار کر ہی لی ٹھیک ہے لیکن میں اپنے لڑکے کو پاکستان کا قومی لباس استعمال کراؤنگا یہ لباس ایک اسلامی ملک کی تہذیب کے علاوہ اسلامی تہذیب سے بھی قریب ہے (یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اِن دِنوں پاکستان میں جنرل ضیاء الحق مرحوم کی حکومت تھی موصوف نے اپنے دورِ حکومت میں جہاں چند ایک اسلامی

اصطلاحات نافذ کی تھیں اُن میں پاکستانی قومی لباس بھی شامل تھا جنرل صاحب نے ملک کے تمام سرکاری محکمہ جات میں ملازمین کو جن میں افسرانِ بالا بھی شامل ہیں یہ پابند کر دیا تھا کہ وہ اوقاتِ کار میں قومی لباس (شلوار قمیص) پہنا کریں چنانچہ اُن دنوں ملک میں یہ لباس عام ہو چکا تھا اور خود جنرل صاحب اس لباس کے پابند تھے میں نے اس موقع پر اسی قانون کا سہارا لیا اور پرنسپل صاحب سے عرض کر ہی دیا) جناب میرا لڑکا یہی قومی لباس استعمال کریگا، پرنسپل صاحب اُلجھ گئے اور کچھ آگے بھی بڑھ گئے۔

اس وقت کی نزاکت کا یہی تقاضہ تھا کہ میں سکوت کرجاؤں چنانچہ باہر نکل آیا چلتے وقت اُن کے نائب صاحب کے کان میں یہ بات ڈال ہی دی کہ ممکن ہے مجھکو اس سلسلے میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق سے مراجعت کرنی پڑے، لیکن ایسا موقعہ پیش نہ آیا اور ہم نے پینٹ شرٹ کی حد تک پابندی قبول کر لی اور ٹائی کو بہرحال شوٹ کر ہی دیا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ بِمَا ھَدَیْتَنَا۔

ماں کی دُعا

ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی اے اللہ کے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) میری خدمت کا سب سے زیادہ کون مستحق ہے؟

ارشاد فرمایا تمہاری ماں،

میں نے عرض کی اس کے بعد؟ فرمایا تمہاری ماں، پھر میں نے عرض کی اس کے بعد؟ فرمایا تمہاری ماں۔

چوتھی مرتبہ میں نے عرض کی اس کے بعد؟ - فرمایا تمہارا باپ۔
(بخاری ومسلم)

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ (المتوفی ۳۷۳ھ) مذکورہ ارشاد کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کی خدمت کو سب سے بڑا حق قرار دیا، اور سوال کرنے والے کو ہر بار یہی جواب عنایت فرمایا "ماں کی خدمت، ماں کی خدمت، ماں کی خدمت"۔

گویا ماں کی خدمت دیگر اہلِ حقوق سے سہ چند ہے، فقیہ ابواللیث لکھتے ہیں کہ ویسے بھی ماں، خدمت کی زیادہ محتاج ہوتی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا اپنے ارشاد میں تین بار تاکید کرنا ماں کی احتیاج کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ماں کا کچھ ایسا ہی حق ہے کہ اسکو مقدّم کیا جائے اور بھرپور ادا کیا جائے۔ اگرچہ اولاد پر ماں باپ کے یکساں احسانات ہیں لیکن ماں کے تین احسان بچوں پر ایسے بھی ہیں جن میں باپ شریک نہیں، صرف ماں ہی کا احسان ہے۔

پہلا احسان تو یہ کہ وہ بچّے کو اپنے پیٹ میں نَو ماہ لئے پھرتی ہے اور اس کی گرانی و تعب و تھکن کو برداشت کرتی ہے اس میں باپ شریک نہیں۔

دوسرا احسان یہ کہ ولادت کے وقت وہ موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہو جاتی ہے اور پھر اس کو برداشت بھی کر لیتی ہے اس احسان میں بھی باپ شریک نہیں۔

تیسرا احسان یہ کہ ولادت کے بعد دو سال تک اپنا خالص خون دودھ کی شکل میں بچّے کو پلاتی رہی اور رات دن کے اپنے چین و سکون کو بچّے پر قربان کرتے رہی ہے اس احسان میں بھی باپ شریک نہیں۔

لہٰذا عدل و انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہونا چاہیئے کہ ماں کی سہ چند خدمت کی جائے۔

ان مذکورہ تین احسانات کے صلہ میں آپ کا یہ ارشاد ماں کی خدمت، ماں کی خدمت، ماں کی خدمت، حقیقت پر مبنی ہے، پھر اس کے نیچے باپ کی خدمت آتی ہے۔ فصلوات اللہ وسلامہ علیہ۔

ماں باپ کی خدمت چند ہی خوش نصیب انسانوں کے حصّہ میں آئی ہے معلوم نہیں یہ عظیم و مقدّس رشتہ کس دور میں بے وقعت ہو گیا جس کا سلسلہ

آج بھی جاری ہے۔ فَیَا حَسْرَةً عَلَی الْعِبَاد۔

"ماں کی خدمت سے عزّت ملتی ہے، رزق بڑھتا ہے، عمر بڑھتی ہے"۔

مادہ پرست انسانوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، کیونکہ یہ حقیقت انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ خاندان کے بزرگوں سے سُنا ہے کہ میرا بچپن بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ چھ سال کی عمر تک ماں کی گود گھوارہ رہی۔ کھانا بھی گود میں، سونا بھی گود میں، چلتے وقت ہاتھ میں ماں کا دامن۔

اللہ عزیز ماں کے درجات بلند کرے، نَو ماہ تو پیٹ میں رکھا، پیدا ہوا تو چھ سال گود میں رہا جوان ہونے کے بعد غالباً اسی کا یہ اثر تھا کہ ماں کی کسی تکلیف یا پریشانی میں دیگر بھائی تو علاج معالجہ اور راحت رسانی کے لئے دوڑ دھوپ تیز کر دیتے اور میں ماں کے قریب ہی بیٹھ جاتا اُٹھا نہیں جاتا۔ ایک رات عجیب واقعہ پیش آیا آدھی رات گزر چکی تھی سب محو خواب ہیں، والدہ مرحومہ اچانک چیختے چلّاتے بیدار ہوئیں مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ، میرے کان میں کوئی کیڑا داخل ہو گیا ہے دیکھو دماغ تک پہنچ گیا ہے بچاؤ، بچاؤ۔ سکنڈوں میں بے قراری نے اپنی آخری حدود کو چھو لیا، زہے نصیب ہمارا محلہ[1] شہر کے آخری کناروں پر تھا، شہری سہولتوں، لائٹ بجلی پانی، سواری، ہسپتال وغیرہ کی عام ضروریات سے خالی، قندیلوں سے کام لیا جاتا تھا جھٹ پٹ قندیل روشن کرکے دیکھا گیا کوئی ظاہری اثر معلوم نہ ہوا لیکن والدہ مرحومہ تکلیف و بیقراری سے بچّوں کی طرح رو رہی تھیں، اور وہی کلمہ مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ، کیڑا دماغ

---

[1] ان دنوں (غالباً ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے) محلہ کا یہی حال تھا اب شہری سہولیتوں سے آباد ہو چکا ہے۔

تک پہنچ گیا ہے بھیجے کو کاٹ رہا ہے۔

ہم سب کے آنسو گرنے لگے ہائے اب کیا کیا جائے؟ محلہ میں نہ ہسپتال نہ کوئی ماہر ڈاکٹر، نیم حکیم کی طرح ایک نیم ڈاکٹر تھا بھائیوں میں دو بھائی دوڑے دوڑے اس کے گھر پہونچے، تیسرے اپنی سائیکل پر اندرون شہر کے لئے نکلے جو تین چار میل کے فاصلہ پر تھا تاکہ کسی ڈاکٹر کو لے آئیں۔

مقامی ڈاکٹر نے پانچ منٹ کے بعد آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا، کہا کیا بات ہے؟ بھائی نے مریض کی کیفیت بیان کی، کہنے لگا میرے یہاں ایسا کوئی انتظام نہیں شہر کے کسی دواخانے لے جاؤ یہ کہکر دروازہ بند کرلیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ادھر والدہ کا یہ حال کہ ہر چیخ و پکار پہلی چیخ سے تیز تر، زمین پر اپنے ہاتھ پیر پٹک پٹک کر توڑ رہی تھیں، خاندان ہی کیا پڑوسی بھی رونے لگے سواری کا کوئی انتظام نہیں کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ شہر سے ڈاکٹر کب آئے؟ آئے بھی یا نہیں؟ لیکن یہاں سب کی موجودگی میں عزیز ماں دم توڑ رہی ہے، سب بے بس کھڑے رو رہے ہیں، بس مریض کے ساتھ صرف یہی ہمدردی ہورہی تھی۔ راقم الحروف بھی ماں کے قریب بیٹھے رو رہا تھا، اچانک اُٹھ کھڑا ہوا، اب تو یہ یاد نہیں کہ میرا یہ اُٹھ کھڑا ہونا کسی غور وفکر کا نتیجہ تھا یا از خود غیر شعوری طور پر کھڑا ہو گیا؟ گلاس میں پانی لیا اور ایک بڑا کٹورہ والدہ مرحومہ کے کان کے قریب لگایا اور منھ بھر پانی سے پوری شدت کیساتھ کان میں کلّی کی، تیسری کلّی پر والدہ مرحومہ لیٹ گئیں کہنے لگیں بس بس آرام ہوگیا، لاالہ الااللہ۔

قندیل کی روشنی تیز کرکے پانی کو دیکھا گیا تو ایک چھوٹی سی سرخ چیونٹی تیر رہی ہے۔ بس یہ تھا وہ کیڑا جو کان کے پردوں کو کھرچ رہا تھا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔

"ماں کی دعا" تو کتابوں میں پڑھی، وعظوں میں سنا، لیکن ابتک تجربہ نہ پایا تھا، والدہ مرحومہ سراپا دعا ہوگئیں، اتنی دعائیں اتنی دعائیں دیں (اے کاش وہ قلم بند کرلی جاتیں) یہاں سطور ہٰذا کے قارئین رشک کریں گے۔ بہرحال میں نے تو پا ہی لیں، فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَہ۔

واقعہ چھوٹا سا لیکن ماں کی عظیم خدمت نصیب ہوگئی۔ "ماں کی دعا" کے ثمرات کو جن لوگوں نے پایا ہے یقیناً وہ بڑے خوش نصیب ہیں، راقم الحروف بھی کم نصیب نہیں، ان حروف کے لکھتے وقت ۱۹۹۹ء مطابق ۱۴۲۰ھ اگرچہ عزیزاں اس عالم میں نہیں ورنہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی دعاؤں کے ثمرات دیکھکر باغ باغ ہوجاتیں۔

اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ حَسَنَاتِھَا وَارْفَعْ دَرَجَاتِھَا وَاغْسِلْ خَطَایَاھَا بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّھَا مِنَ الذُّنُوْبِ کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَمَا ذٰلِکَ عَلَیْکَ بِعَزِیْزٍ یَاوَھَّابُ یَارَحْمٰن۔

خادم الکتاب والسنۃ
عبد الرحمٰن غفرلہٗ
۲، ربیع الاوّل ۱۴۲۰ھ
۱۶، جون ۱۹۹۹ء
جدّہ (سعودی عرب)